مئی ۱۹۸۶ء سے

اپریل ۱۹۸۹ء تک

اپنی نوعیت کا واحد میگزین

پیشکش

ستارویں (۱۷)

تخلیقی ادب کی دستاویز

دھلی

تخلیقی ادب کی دستاویز

ادب، آرٹ اور کلچر کا باشعور ترجمان
اپنی نوعیت کا واحد میگزین

ایڈیٹر انچیف
بلراج ورما

منیجنگ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر
راج پال سہگل

زیر اہتمام
آر۔ بی پبلیکیشنز، جی۔ ۸۔ ۷، ساکیت
نئی دھلی ۱۱۰۰۱۷

R. NO. 40608/83 | Registered with the Registrar of News papers in India
EST. 1977

چار شمارے ایک ساتھ

مئی ۱۹۸۸ء سے اپریل ۱۹۸۹ء تک

سرِورق اور تزئین : مکتی ورما، اسداللہ

خوشنویسی : شفیق الرحمٰن

طباعت : عارض آفسیٹ پریس ۱۲۳ شہزادہ باغ، انڈسٹریل ایریا
فیز II دہلی ۱۱۰۰۳۵

قیمت عام شمارہ : ۲۰/- روپے

چار شماروں پر مشتمل اس شمارے کی قیمت : ۸۰/- روپے

قیمت ——— : (۸۰) اسی روپے

سالانہ (۴ شمارے) ——— : (۱۲۰) ایک سو بیس روپے، بمع ڈاک خرچ

بیرونی ممالک (۴ شمارے) ——— : (۵۰) پچاس ڈالر 〃 〃 〃

ترسیل زر کا پتہ :

آر بی پبلی کیشنز۔ جی ۸/۷، ساکیت، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

ٹیلی فون :- ۶۶۱۵۵۵ / ۶۵۳۵۲۷

مضامین بھیجنے کا پتہ :

ایڈیٹر تناظر ۲۴ ڈی پاکٹ ۳۔ فیز I میور وہار۔ دلّی ۱۱۰۰۹۱
فون ۲۲۰۶۳۱۹

تخلیقی ادب کی دستاویز

تناظر

ستارویں (۱۷) اینتھالوجی

منظرنامہ

فکشن

دوسرا منظر شعر و نغمہ

ف۔س اعجاز، اختر بستوی، انوار رضوی، باقر مہدی، پرکاش تیواڑی، جینت پرمار، حقیر آستانی، زبیر رضوی، سکھدیو شرما رشک، پریم ناتھ سکسینہ راز، ساحل احمد، کرشن موہن، کلدیپ گوہر، مخمور سعیدی، محسن زیدی، ڈاکٹر منشاء الرحمٰن منشا، مظہر امام، بلجیت سنگھ مطیر، اندر سروپ دت نادان،

تراجم: پدما سچدیو، رام پرکاش راہی، راجندر سنگھ ورما، ——— رگھوناتھ گھنی ناتھ پروین اے راؤ، منور سرحدی، بیدار سرمدی، عزیز بگھروی، ڈی راج کنول، افضل کرتپوری، ہری چند روشن لال روشن، ستیہ پال الفت اور بلراج ورما۔ "شام یاراں کی محفل سے"

تیسرا منظر نقد و نظر

مسافتِ زیست (گوشہ۔ امرتا پریتم)

چوتھا منظر مقالے۔ تقریریں

تہذیب و تمدن: ڈاکٹر ظ انصاری، مسعود منور، ڈاکٹر مست رام کپور

علم و ادب: پروفیسر قمر رئیس، محمد یوسف ٹینگ، مولانا حفظ الرحمٰن واصف، خالد علوی، ڈاکٹر محمد یعقوب عامر، یوگندر بہل تشنہ

تقریریں: مولانا ابوالکلام آزاد، پروفیسر گوپی چند نارنگ

سیاست: خالد الشیخ، پروفیسر محمد شفیع آگوانی، دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی اور علی صدیقی

پانچواں منظر

کتابوں کی دنیا، حلقۂ اربابِ سخن و بصیرت اور اردو دنیا کا خبرنامہ

اداریہ

آپ کے تناظر کی یہ ستارویں (۱۷) اینتھالوجی ہے ۔ ۴۱۶ صفحات اور پانچ مناظر پر مشتمل اس اینتھالوجی میں دس افسانے دو انشائیے اور دو تمثیلیں ہیں ۔ پنجابی زبان و ادب کی عظیم فنکارہ 'امرتا پریتم' پر ایک گوشہ بعنوان مسافتِ زیست ہے ۔ منظومات کا ایک مہکتا گلدستہ ہے علمی ، ادبی ، سماجی ، ثقافتی اور سیاسی مقالے ہیں ۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی دو مشہور زمانہ تقریریں ہیں ۔ آزاد صدی تقریبات کے افتتاح کے موقع پر ۱۱ نومبر ۱۹۸۸ء کے دن وگیان بھون نئی دہلی میں پیش کیا گیا پروفیسر (ڈاکٹر) گوپی چند نارنگ صاحب کا خراج عقیدت ہے ۔ اور ہیں چند تبصرے ۔ احباب کے خطوط اور مختصر سا خبر نامہ ۔

فلسطین کے موضوع پر تین پُر مغز مقالے ، جنھیں ہم اس شمارہ کا خصوصی گوشہ سمجھتے ہیں ، ۔ نئے سیاسی حالات کے پیش نظر آپ کو کچھ پرانے بھلے ہی نظر آئیں مگر بیت المقدس اور یروشلم آج بھی دشمنوں کے محور میں محصور ہیں ، اور امریکی منافقت آج بھی پہلے ہی کی طرح قایم ہے ۔ یہ مقالے تاریخی حیثیت کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کا مطالعہ ہمارے قارئین کے لیے فلسطینیوں کے جہاد کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا ۔

اس شمارے میں شائع شدہ مقالوں میں ظاہر کی گئی آرا ، سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں باوجودیکہ یہ مقالے تمام کے تمام اپنے طور پر اہم ہیں ۔

آخری نوٹ: اس شمارے کے تاخیر سے شائع ہونے کی وجہ آپ کے ایڈیٹر کی طویل علالت ہے ۔ اکتوبر سے تو بے چارہ داہنی ٹانگ میں ملٹی فریکچرز کی وجہ سے چلنا پھرنا تو درکنار خود سے اٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتا ۔

بلراج ورما

ف ۔س ۔ اعجاز

ایک منظوم کہانی

ہم تینوں

پہلا منظر

ان گلیوں میں موت پلی ہے کھیلی ہے اور پھاندی ہے
بچہ بچہ چیخ رہا تھا بھاگ رہا تھا دوڑ رہا تھا
ہم کو اپنا ہی خدشہ تھا کس کو بچاتے ہم
اک زہریلی قاتل بُو تھی
دھیمی دھیمی اٹھتی تھی پھر ہو جاتی تھی تیز
آناً فاناً سارے نگر کا یہ عالم تھا
نیچے گیس تھی اوپر گیس
چوپایوں کے پیٹ میں گیس
چڑیوں کے پوٹوں میں گیس
انسانوں کے خون میں شامل
اک چمکیلی، مٹیالی سی، نیلی سی، زہریلی گیس

بلبل کے نغموں کی موت
چوپائے بے صوت
شہر کے سارے طاقت والے
چیخ رہے تھے "بچاؤ"
ڈھونڈ رہے تھے ہاتھ
جہاں جہاں بھی خلقت بھاگی سر پر موت کے بادل تھے

دوسرا منظر (عوامی مکالمہ)

"ڈھائی ہزار انسان مرے ہیں!"
"مرجانے دو"
"میرا بچہ اپنی ماں کے پیٹ کے اندر مرجائے گا"
"مرجائے وہ میرا کیا ہے؟ — میں تو خود مرنے والا ہوں!"
"میری لنگڑی ماں کو اپنی پیٹھ پہ لے لو"
"کیسے لے لوں"
"ٹھہرو ٹھہرو! اپنے زیور گہنے لے لیں؟"
"کیسے زیور؟ کیسے گہنے؟ بھاگو بھاگو! جان بچاؤ!!"

تیسرا منظر

ناک اور منھ پر گیلے کپڑے باندھے بھاگ رہے تھے
بوڑھے بچے عورت مرد
ایک پر ایک چڑھا جاتا تھا
کوئی کہیں پر گر جاتا تھا
کوئی کہیں پس جاتا تھا
چابک مار کے دوڑاتا تھا موت کا خوف
دو گھنٹوں میں شہر ہی سارا خالی تھا
خاموشی تھی جیسے خلا سے اتری ہو
سناٹا تھا جنگل جیسے راتوں کا
کس کی لاش اٹھاتا کون
سب لاشے تھے!
ملا، پنڈت، چور، سپاہی، وید، حکیم
سب مردہ تھے!

کوے، چیلیں، گدھ غائب تھے۔
جادوگر نے ذی روحوں کی انتڑیوں میں کیا پھونکا تھا زہر کے جیسا ؟
مسجد میں زہریلی گیس
کون دعا کو ہاتھ اٹھاتا ؟
مندر میں بھی گیس بھری تھی
گھنٹی کون بجا سکتا تھا، کون کراتا پوجا ؟
گرجا میں تھی گیس کی دھول
کون صلیب اٹھاتا ؟

چوتھا منظر

آخر اک مدت کے بعد
شہر کے باسی پھر لوٹ آئے۔
لیکن کیا انسانوں کو یوں سڑنا تھا یوں گلنا تھا ؟
ذہن کے اندر بو باقی تھی اس سے پیچھا کون چھڑاتا ؟
شہر میں کتنی خوشبو چھڑکی
عطر کے دریا لاکھ بہائے
سلگائے لوبان
مجھ کو شک تھا میں مردہ ہوں
ایک سے پوچھا اس نے بولا "میں مردہ ہوں"
دوسرا بولا "ہم تینوں جب مردہ ہیں تو اپنی لاشیں کون اٹھائے ؟"
اس مردے نے ہاتھ اٹھا کر اک مسجد کی راہ دکھائی اور یہ بولا
"چلو چلیں ہم اس مسجد کے مولانا سے بولیں گے
ہم مُردوں کو دفن کراؤ"
مولانا نے ہلتا لاغر جسم سنبھالا
اور بڑے دھیمے لہجے میں ہم سے یہ فرمایا

"اس مدت میں میرے عزیزو!
اتنے جنازے، اتنے جنازے میں نے پڑھائے۔
میرے ہونٹ ہوئے ہیں پتھر، میری دعائیں نیلی
اپنا جنازہ پڑھوانے کو اور کہیں تم جاؤ
مجھ میں اتنی تاب نہیں ہے۔ میں مُردہ ہوں"

میں نے ساتھی مُردوں سے اصرار کیا
"چلو اب اس مندر میں چلیں گے، اس کا موٹا پجاری
ہوسکتا ہے ہم تینوں کا کریہ کر دے"
مندر کے موٹے پنڈت نے پہلے تو زنار سنبھالا
پھر ہم سے وہ کھانس کے بولا

"شمشانوں میں خرچ ہوئی مندر کی آگ!
شہر کے اندر آگ بچی ہے اور لکڑی باقی
تم ہی بتاؤ کیسے جلاؤں تم لوگوں کو؟
تھوڑی لکڑی تھوڑے شعلے اپنے لئے رکھ چھوڑے ہیں
آگے جاؤ بھائی"

مندر سے ہم تینوں چل کر گرجا پہنچے
بوڑھا پادری ہم سے ٹھنڈی مایوسی میں بولا
"میرے بچو میں نے خدا کے بیٹے سے یہ پوچھا ہے
میں ہوں اگر زندہ تو مجھ کو اس کا یقین کا مل دے۔
جب تک میرے زندہ ہونے کی تصدیق نہ ہوگی
تم تینوں کو کیا دفناؤں؟
میں زندہ ہوں مجھ کو اس میں شک لگتا ہے

جاؤ، بچو تم پھر آنا،
میں گرجے میں بیٹھ کے اپنے رب سے بات کروں گا..

پانچواں منظر

بالآخر ہم تینوں میں یہ بات ہوئی طے
اپنے ذہن میں بسنے والی مہلک بو کو باہر لائیں
جس نے ہم کو شک میں ڈالا ہم مردہ ہیں
قاتل گیس کو مٹی میں دفنا دیں ہم
تاکہ ہم ان لوگوں کی تکفین کی خاطر خود کو بچالیں
جو زندہ ہیں پر خود کو مردہ کہتے ہیں.

(بھوپال گیس کے المیہ کے پس منظر میں
جو ۸۴ء میں ہوا یہ نظم
اپریل ۱۹۸۸ء میں کہی)

بلراج ورما

پرکاش اور چھایا

> اس نے کہا تھا۔ اس دنیا
> میں یہ میرا آخری دن ہے
> چھایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں جا رہا
> ہوں اپنا یہ تھکا ہارا جسم اور اپنا یہ
> موذی مرض بھی اپنے ساتھ لیے
> جا رہا ہوں مگر مجھ میں جو کچھ بھی اچھا
> اور مناسب ہے میری آتما، میرے
> پیار کی خوشبو، میرے ادھ کھلے کنوارے
> ارمانوں کی مہک وہ سب میں نے
> تمہارے بدن کے مندر میں اپنی آخری
> پوجا کے طور پر چڑھا دئے ہیں میں
> تمہارا شوہر بن کر نہ جی سکا مگر میں تمہارا
> بیٹا بن کر ضرور جیوں گا۔

بروردھن کو ایجوکیشنل انسٹیٹیوٹ کے ہندی ڈیپارٹمینٹ کی لیکچرار مس چھایا ماتھر کو انگریزی ڈیپارٹمینٹ کے نوجوان ریڈر اور ہیڈ، ڈاکٹر پرکاش پنڈت سے عجیب قسم کی چڑ تھی۔ آکسفورڈ کا یہ بانکا ڈی لٹ اس کی نظر میں ہلکی پھلکی طبیعت والا ایک شیخی خور ڈینڈی تھا اور اس قماش کا ہر فرد اُسے ایک نظر نہ بھاتا تھا۔ اس ناپسندیدگی کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر پرکاش ہی کالج کی ایک واحد ہستی تھا جسے سب احتراماً یا غالباً آکسفورڈ سے اسکی وابستگی کی وجہ سے پروفیسر کے القاب سے مخاطب کرتے تھے، جب کہ کالج کا ہر دوسرا معلم سر ہوتا یا مس۔ کالج کے لڑکے لڑکیوں اور دیگر نوجوان معلمین میں بھی پرکاش حد سے زیادہ پاپولر تھا۔

کسرتی بدن والے بلند قامت پرکاش کو قدرت نے اچھی صحت اور دلکش شخصیت سے نوازا تھا۔ وہ خوش شکل اور خوش لباس تو تھا ہی، طبیعت کے معاملہ میں بھی بڑا شگفتہ دل واقع ہوا تھا۔ وہ ہر وقت مسرور اور شادماں رہتا۔ اس کی کھلی ہنسی اور دلفریب مسکراہٹ جو چھایا کی نگاہ میں ایک کھوکھلی

اور کلٹی ویٹڈ اشتہاری شے تھی۔ ہر کسی کو پسند تھی۔ وہ جس محفل میں ہوتا وہ کھل اٹھتی۔ خوش رہنا اور خوشیاں بانٹنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

چھایا بھی شکل وصورت اور جسمانی بناوٹ کے اعتبار سے اپسرا ہی لگتی تھی مگر سب حیران تھے کہ وہ گھمبیرتا کو ہر وقت کچھ ایسے اوڑھے رہتی گویا ماتم میں ہو۔ وہ جب کبھی بھولے بھٹکے سٹاف روم میں داخل ہوتی پرکاش کے قہقہے سوکھ جاتے اور زبان گنگ ہو جاتی۔ یہ ایک عجیب کیفیت تھی جسے سٹاف کے تقریباً سبھی ممبروں نے نوٹ کیا تھا۔ مگر بات کسی نے بھی نہ اٹھائی تھی۔ اخلاق کے معاملے میں اس انسٹی ٹیوٹ کے فرد بے حد محتاط رہتے تھے۔ جب پرکاش کے علاوہ دوسرے سٹاف ممبر بھی چپ ہو جاتے تو چھایا کو لگتا کہ اس کا سٹاف روم میں آنا سب کو ناگوار گذرا ہے۔ یہ اکثر ہوا تھا اکثر ہوتا تھا۔ چھایا دیوی کی ساتھی لیکچرار خواتین لیلا امرت، کلدیپ اور سطوت سبھی پرکاش پر جان چھڑکتی تھیں اور حیران تھیں کہ چھایا اور پرکاش کے مابین ایسی کون سی بات، کس قسم کا جذبہ تھا جو دونوں ایک دوسرے سے بلاوجہ کھنچے رہتے تھے۔

پرکاش کالج اپنی کار میں آتا تھا۔ بغیر چھت والی یہ بانکی ریڈ سنگر اس کے مرحوم نانا رائے بہادر کرشن رائے جی کا تحفہ تھی۔ لمبی ڈگی کے علاوہ اس اسپورٹ ماڈل کار میں صرف دو سیٹیں تھیں۔ ایک ڈرائیور کے لیے اور دوسری —— کرشن رائے جی نے کہا تھا "یہ دوسری سیٹ تیری دلہن کے لیے ہے۔ کبھی کبھی تم اس میں میری بیٹی یعنی اپنی ماں کو بھی بیٹھا سکتے ہو اور اپنے کسی مرد دوست کو بھی۔ مگر دوسری بیٹھنے والی تیری دلہن ہی ہونی چاہیے۔

پرکاش نانا کا دیا ہوا وعدہ دہراتا اور .... یہ گاڑی واقعی ایک مرد اور ایک عورت کے لیے بنی ہے۔ ایسے مرد عورت جو اگر میاں بیوی نہ ہوں تو کم از کم ایک دوسرے سے پیار ضرور کرتے ہوں۔ میں کسی لڑکی کو اس گاڑی میں اپنے ساتھ نہیں بٹھاتا کیونکہ گاڑی کی دوسری سیٹ کی حقدار ابھی نہیں ملی"

چھایا قریب ہوتی یا کہیں دور ہی سے دکھائی دے جاتی تو سرد آہ بھر کر کہتا۔ ملی بھی ہے کمبخت تو نہ ملنے کے برابر۔

وہ کالج میں اکیلا ہی آتا تھا مگر لوٹتی بار کم از کم چار پانچ سواریاں جو اکثر لیڈیز

ہوتیں ضرور لادے جاتا۔ کسی لیڈی لیکچرار کو اس کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت نہ ہوتی۔ ان کی کتابیں، کاپیاں، تھیلے یا پرس وغیرہ البتہ اپنے ساتھ والی سیٹ پر وہ بخوشی رکھوالیتا۔ ایک بار کلونت نے اس سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش کی تھی تو پرکاش نے متفکر ہو کر کہا تھا۔

"تم نئی ہو کلونت۔ سوچ سمجھ لو۔ پھر نہ کہنا تمہارے وارجی نہیں مانتے۔ یہاں سب کو علم ہے کہ یہ سیٹ میری ہونے والی یعنی میری اردھانگنی کے لیے ہے اور یہ طے ہے کہ جب بھی کوئی لڑکی اس سیٹ پر بیٹھے گی تو میں اُسے سیدھا اپنے گھرلے جاؤں گا اور ایک دم شادی کرلوں گا۔" باقی کا فقرہ گلدیپ نے پورا کیا۔ تیری ایسی کی تیسی، کہتے ہوئے کلونت چپ چاپ پیچھے دوسری سواریوں کے ساتھ جا بیٹھی تھی۔ پرکاش نے مسکین سی صورت بنا کر کہا تھا۔" دیکھ لو لیڈیز اینڈ جنٹلمین پرکاش صاحب اسی ایک ہفتہ میں دوسری بار ٹھکرائے گئے ہیں۔"

سطوت نے فقرہ چست کیا، تو بال رکھ لے۔ داڑھی بڑھا کر پگڑی پہن لے۔ کچھ ڈاکر پان سے لیس ہو کر امرت چکھ لے پھر کلونت نہ بیٹھے تیرے ساتھ تو کہنا سطوت مومن نہیں کافر ہے۔

کلونت نے چڑ کر کہا تھا "تو کیوں نہیں بیٹھ جاتی۔"

"یہ کلمہ پڑھ لے ابھی اس کے حرم کی ملکہ بننے کو تیار ہوں۔"

ملکہ!

چلو خادمہ سہی۔

دوسرے دن یہ بات دلیپ سنگھ راجپوت نے سُنی تو چہکا۔ مجھ سے کہتی تو ابھی دھریندر خان بن جاتا۔ اور اس نے واقعی پگڑی اتار دی۔ اس کے بال نہیں تھے اور داڑھی پہلے ہی کافی حد تک بڑی تھی۔

"تو بے پیندے کا لوٹا ہے۔ کبھی سکھ بنتا ہے تو کبھی مسلمان۔"

کالج میں کوئی راجپوت کیا نہیں ہے پیارے!

ایک دن کالج میں ایک کلچرل فنکشن تھا۔ جس میں کالج کے ٹیچنگ سٹاف کے قریب قریب ہر فرد (مرد و زن) نے حصہ لیا تھا۔ چھایا کے کلاسیکی نغموں سے سامعین

جھوم جھوم گئے تھے مگر میدان پھر بھی پرکاش ہی کے ہاتھ رہا تھا۔ اس نے اپنی مونو ایکٹنگ سے ہنسا ہنسا کر لوگوں کو دُہرا کر دیا تھا۔ فنکشن کافی دیر تک چلتا رہا۔ فنکشن کے بعد لوگ اِدھر اُدھر لفٹ کے لیے بھاگ رہے تھے جو باقی بچے تھے انہیں گوپال اپنی ریڈ ہنگر میں لاد لاد کر باری باری قریبی بس سٹینڈ پر پہنچا رہا تھا۔ آخری پور لینے آیا تو اس نے دیکھا کہ میری لیدا اور امرت کے علاوہ چھایا بھی اس کی منتظر ہے۔

پرکاش نے بڑے لطف سے دوسری طرف کا دروازہ کھولا اور چھایا کو اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھا لیا۔ باقی کی تینوں لیکچرار پُربہار قہقہے لگاتی ہوئیں پیچھے ڈگی میں بیٹھ گئیں۔ چھایا کے لیے پرکاش کی گاڑی میں بیٹھنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ وہ اس سیٹ میں بیٹھنے والی سے وابستہ کرتی سے ناواقف تھی۔ پیچھے بیٹھی تینوں سہیلیاں اس نئی ڈیویلپمنٹ کے مزے لے رہی تھیں۔ ان کے بس سٹینڈ پر جیسے ہی کار رُکی تو وہ تینوں اُتر گئیں۔ چھایا نے اترنا چاہا تو پرکاش نے یہ کہہ کر گاڑی چلا دی کہ چونکہ اس کی اور چھایا جی کی منزل ایک ہی ہے لہٰذا وہ ابھی بیٹھی رہیں۔

دونوں چپ چاپ بیٹھے تھے۔

"آپ اتنا اچھا گاتی ہیں یہ کسی کو پتا نہ تھا"

"آپ چیلن کی اتنی کامیاب کاپی کر سکتے ہیں، یہ میں بھی تو نہ جانتی تھی۔"

تھوڑی دیر بعد چھایا نے پوچھا۔ آپ کو میرے گھر کا پتہ معلوم ہے؟

پرکاش اُدھر دیکھے بغیر گاڑی چلا رہا تھا۔ نہیں، مگر مجھے اپنے گھر کا پتہ ضرور معلوم ہے۔

چھایا نے حیرت سے پوچھا۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

پرکاش نے نظریں گھمائے بغیر جواب دیا۔ میں آپ کو اپنے گھر بھی نہیں لے جا رہا۔ ہم مقامی آریہ سماج مندر جا رہے ہیں۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ یہ گاڑی ایک مرد اور ایک عورت کے لیے بنی ہیں۔ میں نے سارے کالج میں کہہ رکھا ہے کہ میرے ساتھ والی سیٹ پر وہی لڑکی بیٹھے گی جو اس گاڑی اور اس کے شوفر کو اپنانے کے لیے تیار ہو گی۔ آج خوش قسمتی سے آپ خود ہی —— لہٰذا ہم شادی کرنے جا رہے ہیں۔

چھایا مسکرائی۔ آپ مذاق خوب کر لیتے ہیں۔

پرکاش مسکرایا۔ میں مذاق نہیں کر رہا چھایا دیوی۔ میں آپ سے پیار تو آج تک کرتا ہی رہا ہوں۔ آج شادی بھی کر لوں گا۔

چھایا نے جیسے مذاق میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ میں انکار کر دوں تو؟

پرکاش نے کہا۔ یہ سراسر ظلم ہوگا۔ میں جانتا ہوں آپ باہر سے بھلے ہی کیسی ہوں، بھیتر سے اتنی ظالم نہیں ہیں۔

چھایا جو ابھی تک مسکرا رہی تھی۔ ایکا ایک سیریس ہو گئی۔

"آپ گاڑی روکیے مسٹر پرکاش شرما"

"مسٹر پرکاش شرما؟"

پروفیسر پرکاش شرما۔ آپ پروفیسر کہلایا جانا زیادہ پسند کرتے ہیں نہ۔ چھایا کے لہجہ میں طنز تھا۔

پرکاش نے گاڑی روک دی...... میں آپ کے پتاجی؟

پتاجی اس دنیا میں نہیں رہیں۔

"ماتاجی؟"

"وہ بھی نہیں ہیں"

مجھے افسوس ہے۔ مگر کوئی تو ہوگا آپ کا مقامی محا......میرا مطلب ہے گارڈین"

"میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میں کمد ورکنگ گرلز ہاسٹل میں اکیلی رہتی ہوں"

گوپال کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ آنکھیں رومال سے خشک کرتے ہوئے بھرائی آواز میں بولا۔ آپ کو میری نہ سہی ایک عدد ماں کی ضرورت ضرور ہے۔ خود میرا بھی ماں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ باپ کی موت کے بعد نانا نے پالا تھا۔ آج وہ بھی نہیں ہیں۔ بس ایک ماں جسے آپ کے ساتھ بانٹ لینے میں مجھے کوئی قباحت نہ ہوگی"

چھایا چپ ہو گئی۔

گاڑی پھر چلنے لگی۔

گھر کے دروازے پر گاڑی رکی تو پرکاش نے کہا۔ آج پہلی اور غالباً آخری بار

میں کسی لڑکی کو ماں کے پاس لے جا رہا ہوں ۔ میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے ۔ اس کے لہجہ میں عجیب قسم کی انکساری تھی ۔ چھایا نے سوالیہ نگاہ ڈالی تو اس نے کہا' آپ ماں کے پاؤں ضرور چھو دیجیئے ۔ وہ جس قسم کی بزرگ ہیں اس قسم کے بڑے بوڑھوں کے پاؤں چھونے سے ثواب ہی ملتا ہے ۔ وقار میں کسی قسم کی کمی نہیں آتی "۔

چھایا نے کوئی جواب نہیں دیا، مگر دروازہ کھلنے پر جیسے ہی چھایا نے شانتی دیوی کے پاؤں کو چھوا بڑھیا نے اٹھاکر اُسے سینے سے لگا لیا ۔

تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے میں نکٹائی اور کوٹ اتار کر وہ لوٹا تو اس نے دیکھا کہ چھایا بڑے صوفے پر شانتی دیوی سے چمٹی ان کی گود میں سُکڑی بیٹھی ہے ۔

' تو نے مجھے اس کا نام نہیں بتایا '۔

" چھایا ماتھر ۔ میرے ساتھ کالج میں پڑھاتی ہیں "۔

تو اپنا وعدہ بھول گیا ۔ تو نے پتاجی سے وعدہ کیا تھا کہ میرے علاوہ جو لڑکی اس کار میں بیٹھے گی تو اُسے میری بہو بنائے گا ۔

چھایا کو بُرا نہیں لگا ۔ شرما کر اُس نے ماں کی گود میں منہ چھپا لیا ۔

' تو میری بہو بنے گی نہ بیٹی ! '

چھایا ایک دم سُکڑ گئی ۔

" چھایا کی ماں نہیں ہے اماں "۔

" کیا بکتا ہے رے ۔ میری گود میں بیٹھی یہ لڑکی تجھے میری بیٹی نہیں لگتی ؟

پرکاش کچھ نہیں بولا ۔ مگر یہ انوکھا پیار پا کر چھایا ماں ۔ میری ماں ، چلائی شانتی دیوی سے ایسے چمٹ گئی ۔ جیسے برسوں سے بچھڑی بیٹی ماں سے ملتی ہے "۔

اس واقعہ کے بعد ہفتہ بھر گوپال کالج نہ گیا ۔ چھایا بھی نہ جا سکی ۔ سٹاف روم میں طرح طرح کی افواہیں مقامی تفریح کا موزوں بنی ہوئی تھیں ۔

' پرکاش بڑا چالو ہے آخر لے ہی اُڑا نہ ہماری مونالیسا کو "۔

' یہ بھی تو ممکن ہے کہ مونا ہی ہمارے کنہیا کو لے اُڑی ہو "۔

' بات ایک ہی ہے ۔ چھری تربوز کے اوپر ہو یا تربوز چھری کے ـــــ چھری کاٹے گی اور تربوز کٹے گا ۔ لو کھاؤ میرے پٹیالے کا تربوز ۔ مزہ نہ آجائے تو کہنا ۔

دوسرے دن سب نے دیکھا کہ دونوں لوٹ آئے ہیں۔

تم نے دیکھا کلونت بیچارہ ایک دم فلیٹ ہو گیا ہے۔ شکل و صورت سے تو آج بھی کنہیا ہی لگتا ہے مگر دِکھتا ہے وہ رادھا اس کی بنسری پر نہیں ناچی

تم نے چھایا کو نہیں دیکھا۔ بیچاری بستر مرگ سے اٹھ کر آئی لگتی ہے۔

اس کے بعد پرکاش کو کسی نے چہکتے نہیں دیکھا۔ چھایا کو تو پہلے ہی سے لڑکے لڑکیوں کو پڑھانے اور خالی اوقات میں بھی انہیں ادب کے نازک اور باریک نقطے سمجھانے کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا تھا اب پرکاش کا دوسرا کوئی شغل نہ رہا تھا۔ سٹاف روم میں بھی وہ اب بہت کم آتا تھا۔

چھایا نے بیچارے کا دِل توڑ دیا ہے۔

خود چھایا بیچاری ہی کون ایسی سالم بچی ہے۔ باہر سے بھلے ہی وہ پہلے والی مس ماتھر ہے مگر اندر سے بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی لگتی ہے۔ جانے کیا ہو گیا ہے بیچاری کو۔

وجہ کسی کو معلوم نہ تھی۔ کچھ تخمینے تھے تو کچھ اندازے۔ حقیقت کسی کو معلوم نہ تھی۔

پھر ایک نئی افواہ پھیلنا شروع ہو گئی کالج میں۔ مس ماتھر بیاہ منڈپ سے بھاگی ہوئی ایک ایسی ابھاگن ہے جس کا نا باپ ہے نہ ماں۔ نہ کوئی بہن بھائی ہی۔ وہ دنیا میں اکیلی ہے۔

کالج کے پرنسپل صاحب نے چھایا کے چچا کو جو اس سلسلہ میں ان سے ایک روز ملے تھے بے عزت کر کے اپنے کمرے سے نکال دیا تھا۔ اور وہ اپنی بوکھلاہٹ میں۔

"میں دیکھ لوں گا۔ لوگ کیسے اپنی کنواری بیٹیوں کو اس کالج میں بھیجتے ہیں۔ جہاں گھر کی مان مریادہ کو پامال کر کے بھاگی ہوئی لڑکیوں کو ادھیاپک جیسے پوتر پدوں سے نوازا جاتا ہے۔ چلاتے چلاتے چلا گیا تھا۔

وہ کس لڑکی کی بات کر رہا تھا یہ سمجھتے لوگوں کو دیر نہ لگی۔ اس حادثہ کے بعد پرنسپل صاحب نے چھایا کو کالج ہاسٹل کے فی میل وارڈ کی انچارج یعنی وارڈن بنا کر اسے وہیں رہنے کے لیے ایک کمرہ بھی دے دیا۔ پرنسپل جو ایک خدا ترس بزرگ تھا۔ جانتا تھا کہ چھایا جیسی اکیلی اور بے سہارا لڑکی کا کسی دوسری جگہ رہنا اب محفوظ نہ تھا۔ وہ خود چار بیٹیوں کا باپ تھا۔

پھر گرمیوں کی چھٹیاں آگئیں اور سب طلبا اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ چھایا اب اور بھی اکیلی ہو گئی۔

'تجھے ڈر نہیں لگتا بیٹی۔ اتنے بڑے ہاسٹل میں تُو اتنے دن اکیلی کیسے رہے گی۔

اکیلی کہاں' ہوں اماں۔ بابو جی روز آکر سب دیکھ جاتے ہیں۔ پھر ادھر مائی ہے، مہاراج ہے، چوکیدار ہے۔ سب مجھے بیٹی کی طرح مانتے ہیں۔ یہ ہاسٹل تو ایک فورٹ ہے اماں پولس کے دو مسلح سپاہی دن رات گشت کیا کرتے ہیں اس عمارت کے آس پاس۔

پھر بھی بیٹی ان پچاس کمروں کی اس چار منزلہ عمارت میں تجھے اکیلی نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ سوچ کر کہ تمہیں یہاں ایک دو روز نہیں پورے دو مہینے اسی طرح رہنا ہے اکیلی اس سونے سونے، میں مجھے تو خوف آتا ہے بیٹی۔ باہر کا خدشہ نہ بھی آدمی ان حالات میں خود اپنے آپ سے، ڈرنے لگتا ہے۔

دوسرے روز صبح صبح ہی شانتی دیوی اپنے چار کپڑے لے کر چھایا کے ساتھ رہنے آگئیں۔

پر کاش پہاڑ پر چلا گیا ہے۔ اس کا دل بہل جائے گا۔ اور تو بھی اب اکیلی نہ رہے گی۔

آپ کتنی اچھی ہیں اماں۔ میرے بارے میں سب کچھ جان کر بھی آپ!'

تیرے ساتھ جو ہوا ہے وہ ہولی تھی جس پر کسی کا بس نہیں ہوتا۔ تو سزا کی نہیں پیار کی حقدار ہے بیٹی۔

'اُن کو معلوم ہے!'

میں اپنی بیٹی کی بات اس سے کیوں کہوں گی۔ مگر تیرے بچے کے بارے میں وہ سب جانتا ہے۔

بڑی نفرت ہو گئی ہو گی اُنھیں!

میں نے اس سے ایک روز پوچھا تھا جانتی ہو کیا بولا۔ کہنے لگا پیار پہلے ہوتا ہے۔ رشتے ناطے بعد میں طے ہوتے ہیں۔ چھایا میری بیوی رہے یا بہن، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اس سے پیار کرتا ہوں۔ کیوں کرتا ہوں میں یہ بھی نہیں جانتا۔

وہ دیوتا ہیں۔ اے کاش میں ان کے یوگیہ ہوتی۔ جانے کہاں کہاں بھٹکتے پھرتے ہوں گے!

وہ آدمی ہے بیٹی۔ اس کے بھٹکنے میں کوئی قباحت نہیں۔ مجھے ڈر ہے تو بس اتنا ہی کہ وہ بڑا ابو[illegible] ہے۔ [illegible] بے ڈھنگ کا کھا پی لیا کرے۔ کہیں اپنی سونے جیسی کایا بگاڑ نہ لے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے وہ نیچے ہال میں گئیں تو دیکھا کہ پرنسپل صاحب بیٹھے کسی کو ٹیلی فون کر رہے تھے۔ ریسیور رکھ کر بولے ماتھر صاحب کا ٹیلی فون تھا۔ بہت شرمندہ تھے، معافی مانگ رہے تھے۔ میں نے بھی اس روز طیش میں آکر بہت برا بھلا کہہ دیا تھا۔ بتا رہے تھے کہ ان کا بیٹا امریکہ سے تعلیم ختم کر کے لوٹ آیا ہے اور تم سے ملنا چاہتا ہے

میں ان کی قصوروار ہوں۔ میرا بیٹا حرامی نہ کہلائے اسی لیے انھوں نے میری شادی کا اہتمام کیا تھا۔ میں ان کو دوش نہیں دیتی۔ بیاہ کی پوری تیاریوں کے باوجود میرا ایک دم روپوش ہو جانا ظاہر ہے کہ غلط فعل تھا۔ مگر میں مجبور تھی۔

کوئی بچہ حرامی نہیں ہوتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے بھی اپنے بیٹے کو کبھی حرامی نہیں سمجھا۔ سریش ہی ہے نہ تمہارے چچازاد بھائی کا نام۔ وہ کل ادھر پہنچ رہا ہے۔ وہ تمہارے سورج کا دوست ہے اور اس کے بچے کو خود گود لینا چاہتا ہے۔

سریش بہت اچھا ہے۔ مجھے اپنی سگی ماں جائی بہن کی طرح پیار کرتا ہے میرے اور سورج کے تعلقات کے بارے میں بھی وہ سب کچھ جانتا ہے۔ اسی نے مجھے سورج سے ملوایا تھا۔ دونوں گہرے دوست تھے۔

"ایک تپ دق کے مریض کے ساتھ تمہارے لگاؤ میں مددگار ہونا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کون بھائی اپنی بہن کو سب جانتے بوجھتے بھی۔۔۔۔"

میری والدہ دق سے مری تھی اور اگرچہ ڈاکٹر لوگ ایسا نہیں سمجھتے ہیں جانتی ہوں کہ پتا جی بھی اسی موذی مرض کا شکار ہوئے تھے۔ مجھے دق نہیں ہوا یہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ سورج تیسرا مریض تھا جو میری زندگی میں آیا۔ اس کے پیار میں ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت تھی۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔

"سورج کو آپ نہیں جانتے مگر اُوپر والے سورج کو تو آپ روز ہی دیکھتے ہیں دنیا کے لیے اوپر والے سورج کا جو مہتو ہے وہی مہتو میرے اپنے سورج کا تھا۔ اُس جیسا تیجسوی پُرش میں نے نہیں دیکھا۔

"مگر اس نے!"

"نہیں بابوجی۔ جب آپ نے اُسے دیکھا نہیں تو پھر محض اندازوں پر اُسے قصوروار نہ ٹھہرائیے۔"

"خیر۔ میں تمہارے اتیت کی سرد پڑی راکھ کو کرید کر اس میں چھپی چنگاریوں کو بلا وجہ ہوا دینا نہیں چاہتا۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم سریش سے ملنا چاہو گی کہ نہیں۔"

"سریش میرا سچا غمگسار میرا ہمدرد میرا بھائی ہے۔ اس سے ملنے میں مجھے بھلا کیا جھجھک ہو سکتی ہے۔ مجھے تو چاچا جی سے ملنے میں بھی کوئی آپتی نہیں وہ میری حقیقت سے بھلے ہی واقف نہ ہوں مگر وہ میرے دشمن ہیں یہ میں کبھی نہ کہوں گی۔"

چھایا پرنسپل کے آبائی مکان کی چھت پر بیٹھی اپنے بیٹے کے لیے سوئیٹر بن رہی تھی۔ سُریش پاس ہی کین کی کُرسی میں دھنسا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ کافی دیر چپ رہنے کے بعد بولا، اور سب باتیں میری سمجھ میں آ رہی ہیں۔ مگر ایک بات مجھے برابر کھائے جا رہی ہے۔

"کون سی بات بھیا؟"

"یہی تمہارا ماں بننا۔"

چھایا مُسکرائی۔ یہ کون سی نئی بات ہے بھیا۔ ایک نوجوان لڑکی۔ ایک نوجوان لڑکا۔

وہ سب ٹھیک ہے چھایا مگر...... ایسا کبھی نہ تھا۔ وہ میرا دوست تھا اور بھلی بھانتی جانتا تھا کہ وہ تپ دق کا مریض ہے۔ اس مرض کے بیماروں سے تمہاری فطری ہمدردی کی وجہ سے ہی میں نے اسے تم سے ملوایا تھا۔ وہ بھی تمہاری طرح اکیلا تھا۔ تمہارے تو پھر بھی تھے۔ ہم سب تھے مگر اس کا کوئی بھی نہ تھا۔ میرا تمہیں اس سے ملانا تمہارا اتنا بڑا نقصان کر دے گا اس کا مجھے ذرا بھی خدشہ ہوتا تو میں اسے تم سے کبھی نہ ملواتا۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔

"میری تقدیر تم نے نہیں ودھاتا نے لکھی تھی۔"
'مگر یہ وشواس گھات۔ وہ جانتا تھا کہ وہ مریض ہے اور تم میری بہن ہو۔'
'مریض کو بھی پیار کا حق ہوتا ہے سریش بھیا۔'
"پیار جسم ہی تو نہیں ہوتا۔"
'پیار کا بھی ایک جسم ہوتا ہے بھیا۔'
'پیار اور آتما کی باتیں کرنے والا وہ افلاطون کا بچہ!'
"تم مجھے، اپنی بہن، اپنی پیاری بہن کو۔ بے حیا کہو گے۔ اگر میں تمہیں بتاؤں کہ میں خود ایک رات!"
سریش چلایا، 'نہیں،' پھر کچھ دیر رک کر اور سنبھل کر بولا "تم نے میرے سر سے ایک بھاری بوجھ اتار دیا ہے چھایا۔ اپنے آڈیل کو مجروح پا کر میں بے حد پریشان ہو گیا تھا تم نہیں جانتی ہو بہن کہ آدرشوں کی موت کتنا بڑا سانحہ ہوتا ہے۔
"وہ جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ جا رہا ہے۔ میں بھی جانتی تھی کہ وہ جا رہا ہے وہ کہاں جا رہا ہے میں یہ بھی جانتی تھی۔ میرے لیے دو ہی راستے تھے اس کے ساتھ خود بھی مر جاتی یا وہ کرتی جو میں نے کیا۔"
سریش نے مسکرا کر اپنی بہن کو دیکھا۔ تم ایک بہادر لڑکی ہو، بالکل اپنے ماں باپ کی طرح۔ مگر تم ایک ہندوستانی لڑکی ہو۔ یہی تمہیں یاد نہ رہا۔
ہم دونوں اناڑی تھے۔ نہ اس نے پہلے کبھی کسی لڑکی کو اتنے قریب سے دیکھا تھا نہ میں نے ہی کسی مرد کو کبھی اپنے اتنے قریب پایا تھا۔ نرسنگ ہوم کی وہ ختم ہوتی ہوئی رات جب کائنات کا ذرہ ذرہ نیند میں مدہوش تھا۔ ہم دونوں ———"
'تمہیں یہ سب بتاتے ہوئے۔'
ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہو رہی۔ تم میرے بھائی ہی نہیں میرے اور سورج کے سچے دوست ہو۔ جانتے ہو دوسری صبح جب میں لوٹ رہی تھی تو اس نے کیا کہا تھا؟"
سریش سوالیہ جملہ بنا بیٹھا رہا کچھ نہ بولا۔ جذبہ شدید ہو تو الفاظ اکثر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔
چھایا جیسے ایک رو میں بہہ رہی تھی۔ اس نے کہا تھا اس دنیا میں یہ میرا آخری

دن بے چھایا تمہاری طرح وہ بھی مجھے اسی طرح بلایا کرتا تھا۔ میں جا رہا ہوں۔ اپنا یہ تھکا ہارا جسم اور اپنا یہ موذی مرض بھی اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں مگر مجھ میں جو کچھ بھی اچھا اور مناسب ہے میری آتما۔ میرے پیار کی خوشبو، میرے ادھ کھلے کنوارے ارمانوں کی مہک وہ سب میں نے تمہارے بدن کے مندر میں اپنی آخری پوجا کے طور پر چڑھا دیے ہیں۔ میں تمہارا شوہر بن کر نہ جی سکا۔ مگر میں تمہارا بیٹا بن کر ضرور جیوں گا۔

"اے کاش میرے پیارے دوست نے تمہاری مشکلات کا اندازہ بھی لگایا ہوتا وہ جانتا تھا کہ اس کی چھایا ایک بیوہ کی طرح جی سکنے کا دم خم رکھتی ہے۔ جانتے ہو یہ کہانی جو آج تمہیں سنا رہی ہوں کسی کو پہلے بھی سنا چکی ہوں،

پر کاش کو؟

نہیں بابو جی کو

پوری تفصیل سے؟

'بالکل آپ کی طرح۔ میرے بابو جی بڑے شاندار آدمی ہیں'۔

'مجھے تم پر ناز ہے۔ مگر سورج کہاں ہے'۔

چھایا نے حیران سی ہو کر دیکھا۔

میں سورج کھنہ کی نہیں تمہارے مرحوم شوہر کی نہیں۔ ہاں میں اب اُسے تمہارا شوہر ہی کہوں گا۔ میں تمہارے بیٹے اپنے بھتیجے کی بات کر رہا ہوں۔ وہ میرے دوست کی نشانی ہے میں اُسے گود لوں گا اور تمہیں تمہارے ماضی سے رہائی دلا دوں گا۔

'سورج اپنے مشرق میں محفوظ ہے۔ ایک غریب مگر مہربان بزرگ کی چھتر چھایا میں پل رہا ہے'۔

'میں اس کا ماموں بھی ہوں اور چاچا بھی۔ میں بھیشم نہیں مگر پرتگیا کرتا ہوں کہ اس کی خاطر، اسے سوتیلی ماں کے سایہ سے بچانے کی خاطر کبھی شادی نہ کروں گا۔

تم میرے لیے سب کچھ ہو میرے پیارے بھیا۔ مگر اسے اپنی حقیقت کو، زندگی میں اپنی انوکھی سچوایشن کو سمجھنے کا موقعہ دو۔ پھر وہ خود ہی تم سب سے مل لے گا۔ میرا بیٹا ایک بہادر باپ اور ایک بہادر ماں کی نژاد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی

ماں کو کبھی دوشی نہ ٹھہرائے گا۔ دوسرے میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ کیا کیا کہتے ہیں اس کی مجھے قطعاً کوئی چنتا نہیں۔"

تم بمشکل ۲۴-۲۳ سال کی ایک نوجوان عورت ہو چھایا۔ زندگی ایک پہاڑ کی طرح تمہارے سامنے تنی کھڑی ہے میری بہن۔ بیساکھیوں کے بغیر اس مغرور ہمالہ کو پار کر جانا تمہارے لیے ممکن نہ ہوگا۔

"میرا بیٹا میرا سہارا بنے گا سریش۔ وہ سورج ہے۔"

"مگر بیٹے کو بھی باپ چاہیے میری بہن۔ ہر بیٹے کے لیے باپ ماں ہی کی طرح ضروری ہوتا ہے۔ اپنی شناخت کے لیے۔ سماج میں اپنے مقام کے لیے۔"

"جن کے باپ مر جاتے ہیں وہ کیا زندہ نہیں رہتے۔"

"میں جس باپ کا ذکر کر رہا ہوں بہن وہ اس ملک کا سماج ہے۔ تم سورج کو مجھے دیدو اور شادی کر لو۔ یہ خلا جس میں تم ٹنگی ہو اسی طرح پوری ہو سکتی ہے۔"

"دوسری شادی؟"

"لوگ دوسری شادی بھی کرتے ہیں۔"

"کون کرے گا میری ایسی ابھاگن سے شادی؟"

"ایک لڑکے کو تو میں بھی جانتی ہوں جو تم سے بلکہ اگر میں کہوں کہ صرف تم ہی سے شادی کرے گا تو بھی بھگوان گواہ میں غلط نہ ہوگا۔ یہ شانتی دیوی تھیں جو ان کے جانے بوجھے بغیر چھت پر آکھڑی ہوئی تھیں

"آج مجھے تمہارے بابوجی نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ انہوں نے مجھے ایک بات اور بھی بتائی ہے۔ جو مجھے قطعی معلوم نہ تھی اور جو تم بھی نہیں جانتی ہو بیٹی وہ یہ کہ میرا پرکاش پچھلے مہینہ بھر سے اپنے بیٹے کے ساتھ نینی تال میں رہ رہا ہے۔"

چھایا ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی مگر اپنے بابوجی کو چھت پر آتے دیکھ کر کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

پرکاش کو تمہارے بیٹے کے بارے میں سب بتا دینا میرے لیے ضروری ہو گیا تھا بیٹی۔ میں نے تمہارے سورج کو نہیں دیکھا یقیناً وہ بہت بڑا انسان رہا ہوگا مگر میں اپنے شاگرد کو جانتا ہوں۔ سورج تمہارا ایک خواب ہے بیٹی جب کہ میرا

پرکاش ایک زندہ حقیقت ہے۔ تم نے اپنے سورج کی خالی اور ختم ہوتی ہوئی ہستی، تِل تِل مٹتی ہوئی زندگی کی تکمیل کے لیے۔ اُسے اُس کے بنانے والے کے گھر خالی ہاتھ لوٹنے سے بچانے کے لیے۔ اس کے سوکھے مرجھائے دل میں ایک آخری کنول کھلانے کے لیے اپنے سوکھشم پیار کا جو پرساد جو اپہار دیا تھا۔ اپنی پوتر کنواری آتما کی جو مہک بخشی تھی وہ یقیناً ایک بڑی بات تھی۔ ہم سب جو جانتے اور سمجھتے ہیں تمہارا احترام کرتے ہیں۔"

"مگر بابوجی   کا پتہ؟"

"تمہیں ورکنگ گرلز ہاسٹل سے اٹھا کر اپنے ہاسٹل کی وارڈن بنانے کا میرا ایک مقصد تمہارے بیٹے کا سراغ لگانا بھی تھا۔ جو میں نے بڑی آسانی سے لگا لیا۔

نہیں نہیں بیٹی تم مجھے اس طرح نہ دیکھو۔ میں نے تمہارے اور پنڈت رادھے شیام جی کے مابین ہو رہی خط و کتابت کو کسی ذاتی غرض سے نہیں ایک باپ کی ضرورت کے طور پر پڑھا تھا۔ یہ دیکھو ــــــ"

انھوں نے ایک لفافہ جیب سے نکال کر چھایا کو تھما دیا۔ جسے سریش نے بلند آواز پڑھا۔

"سورج میرے ساتھ ایسے گھُل مل گیا ہے۔ جیسے ہم ایک دوسرے کو جنم جنمانتر سے جانتے پہچانتے ہوں۔ پنڈت جی بڑے نیک بزرگ ہیں۔ چھایا کا بھیجا ہوا ایک ایک پیسہ انھوں نے الگ سے سورج کے لیے رکھا ہوا ہے اور آج تک اپنی سکول کی قلیل تنخواہ میں سے ہی سورج کی پرورش کرتے آئے ہیں۔ یہ ان ہی کی مہربانی ہے کہ سورج مجھے پاپا کہہ کر بلاتا ہے۔ رات کو میرے ساتھ سوتا ہے۔ دن کو بھی منٹ بھر سے زیادہ مجھ سے الگ نہیں ہوتا۔ آپ چھایا دیوی کو کہیں کہ وہ پنڈت جی کو لکھ دیں کہ وہ مجھے سورج کو اپنے ساتھ ادھر لے آنے کی اجازت دے دیں۔ میں ان سے اور کچھ کبھی نہ مانگوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ پنڈت جی بھی جو پچھلے سال بھر سے علیل چل رہے ہیں یہی چاہتے ہیں مگر وچن سے بندھے ہیں۔ وہ سورج کو جانتے تھے۔ اس سے ذہین شاگرد انھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کہتے ہیں تم دیکھ لینا پرکاش یہ چھوٹا سورج اپنے باپ کی طرح ہی تیجسوی ہوگا۔ چھایا نے انہیں نہیں لکھا تو میں سورج کو اغوا کر کے کسی ایسی

جگہ لے جاؤں گا جہاں سے چھایا کو نہ اپنے سورج کی اور نہ آپ سب کو اپنے پرکاش کی کوئی خبر ملے گی۔ چھایا جی سے کہیں کہ وہ میری بوڑھی ماں پر ترس کھائے میرے نہ ہونے سے ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ مگر میری غریب ماں بے موت مر جائے گی۔

"سورج بڑا بدمعاش ہے۔ ہر رات میرے پیٹ پر پیشاب کرتا ہے۔ بچوں کے پیشاب میں کیسی عجیب مہک ہوتی ہے بابوجی۔ سچ بڑا لطف آتا ہے۔"

"پرکاش کی ہر بات۔ اماں نے مسکرا کر کہا ان کی آنکھوں سے جھڑتے ماتا کے موتیوں کا جوہر سب نے دیکھا۔ سبھی آنکھیں بھر آئیں۔

چھایا جو پتھر بنی سب دیکھ سن رہی تھی ایکا ایک بلک بلک کر رونے لگی۔ عین اسی وقت آسمان نے بھی چند بے موسمی بوندیں برسا کر دور نینی تال میں اپنے ننھے سورج کے ساتھ کھیل رہے پرکاش کو اپنی عقیدت کا خراج پیش کیا۔ موسم اچانک بڑا خوشگوار ہو گیا تھا۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ کالج کے سٹاف روم میں لیکچرار لوگ گذرے چھ ہفتوں کی چرچا کر کے چہک رہے تھے کہ سطوت نے بھانڈا پھوڑا۔ کمبخت رنڈوا ہے۔ کس کو معلوم تھا اور ادھر ہم لوگ کیسی کیسی خوش فہمیوں میں مبتلا تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے قیاس لگایا کرتی تھیں کہ وہ ہم میں کس خوش نصیب کو دلہن بنائے گا۔"

کلونت نے کہا۔ میں نے بھی دیکھا ہے اس کا بیٹا۔ ایک دم فرشتوں ایسی صورت پالی ہے۔

میری بولی۔ نقصان نہ تمہیں ہوا ہے نہ مجھے۔ میں عیسائی ہوں تم سکھ ہو اور سطوت مسلمان۔ نقصان تو بیچاری شیلا اور امرت کا ہوا ہے۔ وہی اس دوڑ میں سب سے آگے تھیں۔

امرت نے کہا۔ اور وہ چھایا کی بچی۔

شیلا۔ اس کی اصلی منظور نظر؟

کلدیپ سنگھ چہکا۔ وہ سالی تو ہمالہ کی برف ہے جو کبھی نہیں پگھلتی۔

سطوت۔ کل جوالے۔

کلونت نے فقرہ چست کیا۔ بغیر نمک مرچ اور مسالہ والی مونگ کی دھلی دال

مگر تم جیسی چٹ پٹی۔ گوشت روٹی چھوڑ کر بھی وہ ایک بار اُسی کے پیچھے بھاگا تھا۔
سطوت ہنسی۔ غالباً اسی لیے کہ بھانڈا پھوٹ جانے کی صورت میں بیاہ منڈپ سے بھاگی ہوئی وہ بدنام لڑکی ہی اسے گوارہ کر سکے گی۔
بھئی ایسامت کہو سطوت، کلونت بولی۔ کمبخت نے معمولی سا اشارہ بھی کبھی کیا ہوتا تو میں بھاگ کھڑی ہوتی اس کے ساتھ۔
دلیپ مصنوعی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ سردارنی ہوکر کم بخت مونے پر جان چھڑکتی ہو۔
تم نے اس کا بیٹا نہیں دیکھا دلیپ۔ جو آدمی اتنی خوبصورت اولاد پیدا کر سکتا ہے اسے کوئی بھی خواب دیکھنے والی لڑکی "
کون جانے بچے کی مرحوم ماں کی کنٹری بیوشن اس سے بھی زیادہ رہی ہو۔
اس میں کیا شک ہے وہ بلا کی سیلن رہی ہوگی۔
"تو پھر؟"
"مجھے تو اب بھی کوئی اعتراض نہیں۔"
"مجھے بھی پیلا پھیکی"
"میری، سطوت اور کلونت ایک ساتھ چلائیں، تم دونوں کمینی ہو محض مذہب کی بنا پر ہیرا ہتھیانا چاہتی ہو —
دلیپ سنگھ بولا۔ لڑو نہیں بلیو۔ ہم ابھی لاٹری ڈال کر فیصلہ کئے دیتے ہیں کہ کنہیا کی رادھا کون بنے گی۔
ابھی یہ بحث چل ہی رہی تھی کہ پرکاش اپنے بیٹے کا ہاتھ تھامے کمرہ میں داخل ہوا اور لڑکے سے مخاطب ہوکر بولا۔ دیکھو بیٹے یہ تمہارے چاچا جی ہیں اور یہ سب تمہاری بوا ہیں۔ انہیں پرنام کرو۔
"تو نے ساری محفل کی گرمی ایک ہی ہلے میں چوس لی۔ بڑے خشک ہو گئے ہو میاں۔"
انہیں بھلے ہی اعتراض ہو مگر مجھے قطعی نہیں۔ سطوت بولی۔
مجھے بھی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں یہ پنڈت کی اولاد عیسائی بھیڑ نہیں بنے گی۔

کلونت نے ہنس کر کہا۔ میرے لیے ایک گورو کے سچے سکھ سے بڑا کوئی نہیں۔
'یہ سب کیا ہو رہا ہے پرکاش حیران تھا۔
ایک تمہیں مسخرے نہیں ہو اس کالج میں، دلیپ نے جملہ کسا۔
لیلا نے سورج کو اٹھالیا میرا بیٹا۔
۔مجھے دے۔ یہ تو میرا بیٹا ہے۔
میرا راجہ بیٹا۔
میں پاپا کا بیٹا ہوں۔ سورج نے پروٹسٹ کیا۔
دلیپ نے بچے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ہم کب کہتے ہیں کہ تم پاپا کے بیٹے نہیں ہو۔ ہم تو تمہارے لیے ایک عدد ماں کا بندوبست کر رہے تھے
سطوت نے للکارا۔ ہمت ہے پرکاش تو وعدہ کرو کہ بچہ جسے ماں کہے گا تم اُسے...
اس سے پہلے کہ پرکاش مذاق کا جواب دیتا چھایا اچانک کمرے میں چلی آئی۔ سورج بھاگ کر اس کے پاس چلا گیا اور باپ سے مخاطب ہو کر بولا یہ آنٹی سب سے سندر ہے۔
سب ایک دم چپ ہو گئے۔ چھایا کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ اس کے سامنے کوئی بھی ہلکی بات نہ کر سکتا تھا ورنہ شوخ سطوت ضرور کہہ دیتی۔
"لڑکے نے اپنی ماں چن لی":
چند ہی دنوں میں سورج سارے انکلوں اور آنٹیوں سے ہل مل گیا پرکاش اپنے پیریڈ میں اسے کبھی ایک تو کبھی دوسرے کی حفاظت میں چھوڑ دیتا۔ چھایا چونکہ سٹاف روم میں کبھی کبھار ہی آتی تھی۔ لہٰذا بچے کی نگرانی کا سوبھاگیہ اسے کبھی پراپت نہ ہوا۔
صورت حال ایک دم بدل گئی تھی۔ مگر چھایا کے ایٹی چیوڈ میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ اپنے لاڈلے کو دُور سے ایک نظر دیکھ کر ہی اپنی مامتا کی ساری ضروریات پوری کر لیتی تھی۔ اُسے اطمینان تھا کہ اُس کے سورج کو باپ اور گھر مل گیا تھا ڈاکٹر پرکاش شرما کا گھر ایک ایسا خوشحال گھرانہ تھا جہاں ہر وہ چیز موجود تھی جو بچوں کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

،سوائے ماں کے ۔ایک دن بابوجی نے اسے جھنجھوڑا تم بڑی نشٹھر ہو چھایا۔ ایک آدمی نے اپنے آپ کو رنڈوا اور ایک بے ماں کے بچے کا باپ مشتہر کر کے اپنے جوان مستقبل کے سارے دروازے بند کر لیے ہیں اور ایک تم ہو کہ —— اب تم ہی بتاؤ کس بھلے گھر کی لڑکی اُسے اپنائے گی ؛

مگر میں کیا کروں بابوجی ۔

یہ کیا مجھے بتانا ہوگا ۔ میں جانتا ہوں کہ مرد کے پہلے ہی لمس سے تمہاری نسوانی شخصیت کی تکمیل ہو گئی تھی ۔ مگر یہ سنیاس اب واجب نہیں ہے ۔ ایک شادی کے بعد وہ شخص بھلے ہی دوسری شادی نہ کرے جس کی پہلی ازدواجی زندگی ناکام رہی ہو ۔ تمہارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا ۔ تم نے سورج سے پیار کیا تھا ۔ اب پرکاش بھی کوئی ایسا معمولی آدمی نہیں ۔ اپنی چھوٹی سی عمر میں ہی علم و ادب کی دنیا میں اس نے جو مقام بنالیا ہے .... وہ تم سے چھپا نہیں ۔ تم اس کی پریرنا بنو ۔ اس کی بے پناہ کیرتی میں شریک ہو کر اُسے اور آگے بڑھنے میں مدد دو ۔ میں حیران ہوں کہ تمہیں اِس غریب کی بوڑھی ماں کا بھی کبھی خیال نہیں آتا ۔ زندگی میں صرف اپنے لیے ہی نہیں جیا جاتا بیٹی ۔ آدمی کو دوسروں کے لیے جینا بھی سیکھنا چاہیے ۔

آپ میرے تپاسمان ہیں بابوجی ۔ آپ مجھے دوسری شادی کا درس دے رہے ہیں ۔

میں تمہیں شادی کا مشورہ دے رہا ہوں ۔ تم زندگی کے ایک لمحہ کی لغزش کو بلا وجہ طول دے رہی ہو ۔ تم اس طرح شہید بن سکتی ہو چھایا مگر ایک عورت نہیں ۔ جسم کا بھی ایک دھرم ہوتا ہے بیٹی ۔ مجھے ڈر ہے کہ تم پرکاش کو بھی اُسی طرح کھودو گی جس طرح ...... تم نے کبھی سوچا ہے کہ پرکاش اتنے دنوں سے کالج کیوں نہیں آرہا ۔ اس کا بیٹا بیمار ہے ۔ انھوں نے جملہ ختم ہی کیا تھا کہ ....

،،سورج بہت بیمار ہے بابوجی؛؛ یہ پرکاش تھا پریشان حال، پرکاش چھایا کو دیکھ کر بولا ۔ میں ہار گیا ہوں چھایا دیوی آپ اپنے بیٹے کو سنبھالیے ۔ مجھ سے اس معصوم کا مرنا نہ دیکھا جائے گا ۔ میں تقریباً پاگل ہو گیا ہوں ۔ میری ماں بیچاری جو پہلے ہی سے نیم مردہ ہے رو رو کر . . . . .

چھایا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ گویا کسی ڈراؤنے خواب سے بیدار ہوئی ہو۔ چلا کر بولی۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ سورج مجھے دوسری بار چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

دونوں کے دیکھتے دیکھتے اس نے باہر آ کر کار کا دروازہ کھولا اور جم کر بیٹھ گئی۔

پرنسپل صاحب حیران و ششدر کھڑے تھے۔

چھایا نے پرنام کرتے ہوئے کہا۔ بیٹی اپنے گھر جا رہی ہے بابو جی۔ اُسے آشیرباد نہ دیں گے۔

پرنسپل صاحب کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے چھایا کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پرکاش سے گویا ہوئے۔ لے جاؤ بیٹا اپنے بیٹے کی دوا اور دعا۔ میری بیٹی پانی اور ہوا کی طرح پوتر ہے۔ کبھی بھولے سے بھی نہ سمجھنا کہ اِسے اپنا کر تم نے اس پر کوئی بڑا احسان کیا ہے۔ تم خوش نصیب ہو جو اِسے پا رہے ہو۔ اب اگر تم پرکاش ہو تو یہ تمہاری چھایا ہے۔ اب تم دو نہیں ایک ہو۔ تم ہو اِسی سے یہ ہے، یہ لڑکی میرا تحفہ نہیں میرا آشیرباد ہے۔

دوسرے روز سٹاف روم میں سب ملے تو سطوت نے کہا۔" ہم سب نے اُس مگرمچھ کو پکڑنے کے لیے جال پھینکے تھے مگر اُسے تو کوئی جل پری ہی پکڑ سکتی تھی۔"

شادی کی پارٹی میں سبھی مسرور تھے۔

دلیپ سنگھ نے مبارک باد پیش کرتے ہوئے چھایا سے کہا۔ اب تم دیکھ لینا چھایا جی اسی ایک سال میں کالج کے سب کنوارے کنواریاں بیاہی جائیں گی۔ میں نے کتنی بار اعلان کیا ہے کہ کنہیا کو ایک بار برندا بن سے جانے دو۔ سارے کنواروں کے بھاگیہ کھل جائیں گے۔ بیچاری گوپیاں۔

چھایا کا سر فخر سے اُونچا ہو گیا۔

کوڑ نکھٹے نانکا اوڑک سچ سہی

कूड़ निखुटे नानका ओड़क सच सही !

अन्‌जाम-कार फ़ानी-ओ-मरदूद है दरोग़
होता नहीं जहां में मयस्सर इसे फ़रोग़

इसको नहीं दवाम ज़माने में जीत-हार
चढ़ती भी है जो काठ की हंडिया तो एक बार

वोः कम-नज़र जो झूठ के दामन में ले पनाह
होता है सब के सामने बदनाम-ओ-रूसियाह

लेता हर इक बशर है हिक़ारत से उसका नाम
आता नहीं कोई भी ज़रूरत में उसके काम

लेकिन नहीं है आंच का डर सांच को कहीं
मुम्किन नहीं कि सिदक़ भी मरदूद हो कहीं

क्या आज़माईशों की कसौटी से उसको बाक
होता है पड़ के आग में ज़र और ताबनाक

ठनती है जब कहीं हक़-ओ-बातिल के दर्मियां
इस जंग का येः होता है अंजाम बेगुमां

होता है हक़ मुज़फ़्फ़र-ओ-मनसूर-ओ-फ़त:याब
ठहरे मुक़ाबले में येः बातिल को कब है ताब।

قدیم دکنی ادب کی صورت اتنی واضح ہے کہ آج کے ہندی ادیب اسے ہندی ادب کا حصہ بنانے پر تلے ہوئے ہیں یا اس پر ہندی کے اثرات تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ بات بے بنیاد نہیں قدیم ادب کا ایک بڑا سرمایہ ہندی میں منتقل ہو چکا ہے، ہندی روایات کی توسیع کرنے والے اسے اپنے ادب میں ضم کرنا چاہتے ہیں اور اسے ہندی ادب کا اٹوٹ حصہ سمجھنے لگے ہیں، ایک ادب کو دوسری زبان کے ادب سے اخذ واستفادہ کوئی برا عمل نہیں۔

یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ اردو اور ہندی دونوں میں اتنی صلاحیت موجود ہے کہ وہ دوسری ملکی اور غیر ملکی زبانوں کو بھی اپنے اپنے رسم الخط میں سمو سکتی ہیں زبان کی، کھال سے اس کی روح زیادہ اہم ہوتی ہے اسی نظریئے کے تناظر میں مہاتما گاندھی اور ہمارے سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اصرار کیا تھا کہ ہمیں اردو اور ہندی کو ایک دوسرے کے قریب لانا چاہیئے اور وہ اس طرح کہ ایک ہی بات دونوں زبانوں میں ایک ساتھ لکھی جا سکے اس شمارے کے 30، 40، 64 اور 96 صفحات اس نظریئے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

جوگندر پال

عفریت

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، پپا؟"

ہم باپ بیٹا دونوں دسہرے کے دن رام لیلا گراؤنڈ میں ایک محفوظ خیمے میں کرسیوں پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے اور راون کے گرنے کا انتظار کر رہے تھے۔

"کیا کیسے ہو سکتا ہے، موہت؟" میرے بیٹے نے ابھی دوسری جماعت بھی پاس نہ کی تھی مگر کیا مجال، بال کی کھال نکالے بغیر چپ سادھ لے۔

"یہی کہ راون کے دس سر تھے؟"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اُسے کیسے سمجھاؤں، مگر میں اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ ایک ہی شخص دس سروں سے سوچ کر کسی فیصلے پر پہنچتا ہے تو یہی ہونا ہے جو راون سے ہوا۔ "زیادہ سوچا مت کرو بیٹے؟" قریب ہی ایک آئس کریم والے کو روک کر میں نے اس سے کہا۔ "لو آئس کریم کھاؤ۔"

آئس کریم ہاتھ میں لے کر وہ پھر پوچھنے لگا۔ "بتاؤ نا، پپا، راون کے دس سر کیسے ہو سکتے ہیں؟"

"راون بڑا بدھی وان تھا، بیٹا" موہت کے ساتھ کی کرسی سے ایک بوڑھا اُسے بتانے لگا۔

"تو پھر وہ سیتا میّا کو کیوں اٹھا لے گیا؟"

اس بوڑھے سے کوئی جواب نہ بن پایا تو ہمارے عقب سے کسی جوان نے اسے جواب دیا۔

"اسی لیے کہ بدھی وان تھا۔"

آئس کریم کو منہ میں گھلتے پا کر موہت کو گویا سب کچھ سرل معلوم ہونے لگا اور وہ بے سبب مسکرانے لگا۔ مگر تابکے؟ آئس کریم کا کپ خالی ہوتے ہی اس کے ذہن میں پھر اینٹھن مچنے لگی اور اس نے لکشمن کے تیر کے مانند اپنا وہی سوال چھوڑا۔ "مگر پپا، راون کے دس سر کیسے

ہو سکتے ہیں؟" اُس کا مسئلہ حل کیے بغیر اب کوئی چارہ ہی نہ تھا
"کیوں نہیں ہو سکتے، بیٹے؟"

"تو پھر تمھارے ایک ہی کیوں ہے، پپا؟"

"میں راون تھوڑا ہی ہوں۔"

"ہاں، یہی تو پوچھ رہا ہوں، راون کے دس سر کیسے ہو سکتے ہیں؟"

اپنا بزنس شروع کرنے سے پہلے میں اسکول ماسٹر تھا اور طرار بچوں کو کنفیوز کر کے مجھے بہت اطمینان ہوتا تھا۔ "اچھا بتاؤ تمھارا ایک ہی سر کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میرا تو ہے ہی ایک سر۔"

"ہاں" میں نے زور ڈال کر کہا۔ "جس کے جتنے بھی سر ہوں، اتنے ہی ہوتے ہیں۔"

بچہ سر کھجانے لگا۔ "نہیں میں یہ پوچھ رہا ہوں، صرف راون کے ہی دس سر کیوں تھے؟"

"ویری سمپل، بیٹے، کیوں کہ صرف راون ہی راون تھا۔"

جواب میں اُسے چپ پا کر میں نے شکریہ ادا کیا۔

کئی دفعہ اپنی ماں کے بارے میں موہت کے سوال ختم ہونے میں نہیں آتے۔ اُس وقت میرا سر اتنا بوجھل ہو جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے راون کے مانند میں بھی دس سر اٹھائے ہوئے ہوں اور جی چاہتا ہے اپنی بیوی کو اُس کے شوہر کے یہاں سے زبردستی اٹھا لاؤں۔ موہت ابھی تین سال کا ہی ہوا تھا کہ سرلا نے مجھ سے طلاق لے کر دوسری شادی کر لی۔ وجہ؟— اور کیا وجہ ہوتا تھی؟ مجھ سے شادی کرنے سے پہلے وہ ایک شادی شدہ مرد کے عشق میں گرفتار تھی۔ آخر چند سال بعد اُس کے عاشق کی بیوی پُراسرار حالات میں چل بسی تو وہ طلاق کے حیلے تلاش کرنے لگی اور اسی وقت دم لیا جب اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئی۔ مجھے شک تھا کہ موہت میری بیوی کے عاشق کا ہی بیٹا ہو گا اس کا منہ ماتھا اُسی پر گیا تھا، پر موہت سے میں اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ اس سے جدا ہونے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ جسے ہم خون کے رشتے کا نام دے کر اتراتے ہیں اس میں بھی ہماری چاہ کی عادات ہی کام کرتی ہیں، ورنہ آدمی اور جانور کے رشتوں کی سچائی پر باور نہ کیا جا سکے۔ بلکہ رشتوں کی سچائی ہی ناقابل یقین معلوم ہونے لگے۔ میں نے شکر کیا جب میری بیوی موہت کو میرے پاس چھوڑنے پر راضی ہو گئی۔ موت پر نقل و حرکت شاید اسی لئے آنکھ جھپکنے میں ہوتی ہے کہ کسی کو اپنے

گناہ نہیں ڈھونا ہوتے۔ سچ پوچھئے تو میں بھی بعض اوقات اپنی اس خواہش سے بے تاب ہونے لگتا ہوں کہ مرکر بھی کوئی نیا اور کورا جیون نصیب ہو۔

میں شاید اونگھنے لگا تھا۔ الٹے سیدھے دھندے کرنے والے کی رات توکروٹیں بدل کر بیت جاتی ہے، اس کا بس اٹھتے بیٹھتے اونگھ اونگھ کر ہی سونا ہو تو ہو۔ میں جب اسکول ماسٹر تھا تو موٹا کھاتا اور گہرا سوتا تھا مگر موہت کی ماں میرے خراٹے سن سن کر سر پھوڑنے لگتی تھی اسی کے کہنے پر میں نے اپنے سارے وسائل اکٹھے کر کے اور اچھا خاصا قرض اٹھا کر ایک بڑا ہوٹل کھول لیا۔ اب میرے دن رات تو ہوٹل کی دیکھ بھال میں گزرنے لگے اور سرلا کے اپنے پرانے عاشق سے بے روک ٹوک ملنے ملانے میں غریب کی کمائی یکلخت اتنی بڑھ جائے اور اس سے سنبھلنے نہیں نہ آئے تو اندھے کو خوشی میں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ہوٹل سے میں کبھی گھر کی راہ اختیار کرتا تو ہوٹل ہی آ پہنچتا۔ ان ہی دنوں سرلا نے سراسیمہ سی آواز میں مجھے بتایا کہ جانے موہت کس راستے اس کی کوکھ میں آ پہنچا ہے۔ اسی روز میں اس کے لئے لڈو لایا تھا۔ کیوں کہ میرے ہوٹل کا تھری اسٹار نشان تسلیم کر لیا تھا میں نے اس کا سٹپٹایا ہوا منہ لڈوؤں سے بھر دیا۔ وہ بچے کو تلف کر دینا چاہتی تھی لیکن میں نے ایسا نہ ہونے دیا۔ اپنے ہوٹل کے اسٹاف کو بھی میں یہی سمجھایا کرتا تھا کہ نو وارد اپنے قیام و طعام کے لئے منہ مانگی پیشگی ادا کر دے، اس کے لئے اپنے وجود میں بھی جگہ بنا کر اسے رکھ لو۔

اپنی اونگھ سے باہر آنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ راون کا بت اپنے دسوں سر ہلا ہلا کر میرے سر پر کھڑا قہقہہ رہا ہے یا شاید میں ہی دس مہینوں سے پٹاخے چھوڑنے لگا ہوں۔ میں نے ہڑبڑا کر موہت سے پوچھا۔ "کیا راون کو آگ لگا دی گئی ہے بیٹے؟"

"نہیں پپا، ابھی کہاں؟"

میں اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنسنے لگا۔

"تم ہنس کیوں رہے، پپا؟"

رام لیلا میں راکشش کسی کھجان بلب پا کر اس طرح بے اختیار ہنستے ہیں گویا انھیں گدگدایا جا رہا ہو۔ میرے ذہن میں دراصل ایک آبدوز کشتی چلی آ رہی تھی جس میں لاکھوں کے خودکار تخریبی ہتھیار لدے ہوئے تھے۔ پچھلے سال اپنے ہوٹل میں مسافروں میں سے

میرا ملنا مغرب کے ایک ایسے صنعت کار سے ہو گیا تھا جو تیسری دنیا کے ممالک میں افیون اور کوکین کے عوض ہتھیار سپلائی کرتا تھا۔ میرا اس سے معاملہ پٹ گیا تو میرا بیشتر وقت اسی کاروبار میں صرف ہونے لگا۔ ہوٹل ووٹل تو دکھاوے کا پیشہ ہو کر رہ گیا۔ کوئی اچھا تاجر تو ایک ہی تھیوری کو کام میں لاتا ہے۔ ڈیمانڈ اور سپلائی کی تھیوری۔ مغرب اپنی طاقت سے اتنا خوفزدہ ہے کہ ہوش و حواس کھو کر جینا چاہتا ہے اور مشرق لڑتا بھڑتا نہ رہے تو اسے اپنی آزادی کا یقین نہیں ہوتا، سو میں دونوں طرف کی ضرورتیں سمگل کرنے میں جٹ گیا ــــ نہیں، لوگ مرتے ہیں تو میرا کیا دوش؟ مردے گننا بیکار لوگوں کا شغل ہے میں تو سیدھے سیدھے اپنے کام سے کام رکھتا ہوں، جیسے بھی ایک کے دس بن جائیں۔

"پپا!ــ"

"ہاں، بیٹے!"

"کیا سوچ رہے ہو، پپا؟"

"تم بھی سوچا کرو بیٹے۔"

"کیا سوچا کروں؟"

میں نے سوچا اسے ایک سے دس بنانے کی بات بتاؤں گا تو پھر راون کے دس سروں کا قصہ لے بیٹھے گا۔ "کچھ بھی بیٹے، چاکلیٹ، کیک، برتھ ڈے ــ"

موہت کی برتھ پر نہیں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اس کی پرورش کیسے ہوگی۔ میری ماں ہر روز ایک بچے کا کھانا پکا کر کسی یتیم خانے میں لے جایا کرتی تھی کہ بے ماں بچوں کے منہ ہلنا بند ہو گئے تو پر لے آجائے گی، مگر آج ایسی گھور پرلے آچکی تھی کہ ماؤں کے ہوتے ہوا تے بچے اپنے منہ نہ کھول پائیں، ماں باپ دونوں سارا سارا دن مزے سے اپنے دھندوں۔ گورکھ دھندوں میں الجھے رہیں اور بچے تربیت یافتہ نرسوں کی نگرانی میں اتنے خاموش انہماک سے کھلونوں سے کھیلتے رہیں جیسے مہاتما بدھ مگنی اور نروان کے لئے سُدھ بدھ کھوئے بیٹھے ہوں ــــ ماں ــ ن ا ــ کسی باؤلے بالے سے نہیں رہا جاتا تو چیخ پڑتا ہے ــ ٹھپ!۔ نرس کا تربیت یافتہ ہاتھ اسے تھپڑ رسید کرتا ہے تو بالا آپ ہی آپ سیدھا بیٹھ کر چپ چاپ کھیلنے لگتا ہے ــ ہائے میڈم کپور کا کریش کتنا اچھا ہے! بھوک سے بچوں کی جان بھی نکل رہی ہو تو مسکرا مسکرا کر بڑے صبر اور ادب سے کھانے کے ٹائم کا انتظار

کیے جاتے ہیں۔

مگر ہمارے موہت کی پرورش کے لیے ہمیں ایک نہایت اچھی آیا مل گئی۔ نہ ملتی تو اپنی ماں کے پیٹ سے سلامت آپانے کے بعد بھی اس کی جان کا خطرہ بنا رہتا۔ نہ جانے آیا کا نام اماں کیوں پڑ گیا، حالانکہ عمر میں وہ سرلا سے بھی چھوٹی تھی۔ سرلا کو اپنی چھاتیاں ڈھلک جانے کا ڈر تھا۔ اس کی یہ مشکل بھی اماں نے حل کر دی۔ ان ہی دنوں اس نے بھی بچّہ جنا ہوا تھا۔ اس نے آپ ہی پیش کش کی۔ "میرا دودھ اگر آپ کے کام نہ آیا تو کس کام کا، ساب؟"

"ہم تمھیں دودھ کے ڈیڑھ سو روپے الگ دیں گے۔"

"ڈیڑھ سو روپے الگ دیں گے ساب تو میرے بچے کے لئے میرا مرد ہی اپنی چھاتیوں سے دودھ نکال لیا کرے گا۔"

خوب اچھی طرح سوچ لو۔ تمھیں اپنے گھر جانے کی چھٹی ہفتے میں صرف ایک بار ملے گی۔"

"بے شک وہ بھی نہ دیں ساب۔ میرا مرد آپ ہی اپنی روٹی پکا لیا کرے گا بڑا گنوا آدمی ہے۔"

لیکن ایک دن میں نے ایک میلے کچیلے اجنبی کو ایک بلکتے ہوئے شیر خوار کو گود میں لئے اپنے بنگلے کے آگے دمنڈلاتے ہوئے دیکھ لیا۔ میرا پارہ ایک دم چڑھ گیا اور میں اماں کو کھینچ کر باہر لے آیا اور اُس آدمی کی طرف اشارہ کر کے اس سے طلب کیا۔ "وہ یہاں کیوں آیا ہے؟"

وہ شخص بے چارگی سے ہماری طرف دیکھنے لگا اور بچہ اور زور سے رونے لگا۔

میں نہیں جانتی، ساب کون ہے؟" اس نے گویا قسم کھانے کے لئے گلے کی گانٹھ چھو کر کہا۔

اس شخص نے خطرہ بھانپ لیا تھا اور بڑی مضحکہ خیز شناسائی سے اپنی اجنبیت پر زور ڈالنے کے لئے نفی میں سر ہلائے جا رہا تھا۔

"وہ بچّہ؟ وہ بھی تمہارا نہیں؟"

اماں نے بچّے کو جی بھر کے دیکھا اور رک کر بولی، "نہیں ساب۔" اور پھر وہ ایک دم

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مجھے معاف کر دو ساب، آج کے بعد میں ہفتے میں ایک بار بھی ان سے ملنے نہیں جاؤں گی۔ آپ خود ہی انھیں میری تنکھا بھیج دیا کریں"

"پپا! ــــ پپا! ــــ" موہت پھر مجھے بلا رہا تھا۔ "اماں کو بھی ساتھ کیوں نہیں لائے؟"

"اماں نے بہت راون دیکھے ہیں بیٹے۔"

میں نے یونہی راون کے پتلے کی طرف نگاہ اٹھائی اور نیچے سے اوپر اس کے چہروں پر پہنچتے پہنچتے میری گردن ٹیڑھی ہو گئی۔ نامعلوم راون ہر دسہرے پر پچھلے سال سے بڑا کیوں ہو جاتا ہے۔ میرے بچپن میں اس کا پتلا عام انسانی قد سے اونچا نہ ہوتا تھا، اس کے باوجود ہم حیرت سے کہا کرتے تھے، دیکھو پورے قد کا راون ہے، کتنا بڑا ہے! مگر اب تو وہ اتنا اونچا ہوتا ہے کہ ہمارے سکائی سکریپروں کی کھڑکیوں سے بھی ہمیں اپنے دلوں میں دربار لگائے محسوس ہوتا ہے۔

میرا نہایت شاندار رہائشی فلیٹ ایک سکائی سکریپر کی بیسویں منزل پر واقع تھا میں نے بڑے چاؤ سے اپنا یہ گھر آباد کرنا چاہا تھا۔ اماں نہ ہوتی تو یہ اجڑ پجڑ کر رہ جاتا سرلا کے بھی اماں ہی گھر کی دیکھ بھال کرتی تھی مگر ہمارے طلاق کے بعد تو میں نے اسے مالکن کا سارا اختیار سونپ دیا جب سے میں اسے غور سے دیکھنے لگا سرلا کے ہوتے ہوئے بھی میں ایسا کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ اُسی وقت سے اس کے چہرے کے خطوط میرے دل و دماغ میں گھر کرنے لگے تھے۔ سرلا کے چہرے کو تو اس کا چڑچڑاپن جا بجا جھریوں میں سئے ہوتا تھا جبکہ اماں اپنی بے شکایت محنت اور محبت سے سیراب سی اپنے وجود میں بھرپور اُگی معلوم ہوتی تھی پہلی بار جب میں بھوک سے پاگل ہو کر بیٹر پر چڑھ آیا اور بے تحاشا پھل توڑنے لگا تو پیڑ نے سی بھی نہ کی بلکہ اس کی خدمت گزار شاخیں مجھے پنکھا کرتی رہیں کہ بڑے مزے اور دھیان سے منہ چلا رہا ہوں ــــ میں اتنا موٹا تازہ اس لئے ہوں کہ خوب ڈٹ کر کھاتا ہوں۔ اگر سرلا مجھے چھٹی نہ دے دیتی اور اماں نہ ہوتی تو اب تک میرا اتنا سا منہ نکل آتا۔ کوئی میری مانے تو عورت سے شادی کرنے کی بجائے اسے نوکر بنا کر اپنا گھر سونپ دینا چاہیئے۔ وہ شادی شدہ بھی ہو تو کیا حرج ہے؟ اس کے غریب مردوئے کو عمر بھی اس کی پوری تنخواہ اور ڈیڑھ سو روپلی دودھ کا بذریعہ منی آرڈر

بھیجتے رہو۔ تم بھی خوش، وہ بھی خوش۔

"پپا!— پپا!—"

موہت شاید ابھی تک اماں کے بارے میں ہی پوچھے جا رہا تھا۔ "ہاں بیٹے، تمہاری اماں کو بھی ساتھ لے آتے تو اچھا ہوتا۔"

"نہیں پپا میں یہ پوچھ رہا ہوں، اماں تو اماں ہے۔ میری ممی کون تھی؟"

راون کے مرنے کا وقت قریب آ رہا تھا اور ہمارے آس پاس سبھی لوگوں کی نظریں ہوا میں اڑتے رام بانوں کا پیچھا کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔

"بتاؤ نا، پپا۔"

"تمہاری ممی تمہاری آنٹی تھی بیٹے، اسی لئے وہ انکل کے پاس چلی گئی۔"

اسی دوران فضا میں بیک وقت کئی پٹاخے چھوٹ پڑے اور موہت اور میں راون کے بھائی کے پتلے سے اٹھتے شعلے دیکھنے لگے۔ اس کے پہلو میں راون کے دسوں چہرے آگ کی روشنی اور تپش میں اتنے حواس باختہ دکھ رہے تھے کہ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ اسے کیا پڑی تھی کہ اپنے سے طاقتور دشمن کی جورو کو اڑا لے آیا۔ اپنی لنکا میں ہی کسی سیتا پر نظر ٹھہرا لیتا اور اس کے رام کی تنخواہ باندھ کر بڑے آرام سے اسی کو گھر میں ڈال لیتا اس پر بھی رام راضی نہ ہوتا تو اسے دودھ کے پیسے تنخواہ کے علاوہ ادا کر دیتا۔ دسوں چہروں کی مونچھوں کے تاؤ تو وہیں ممکن ہیں جہاں اپنا سکہ چلتا ہو۔ اپنی حکومت سے باہر تو سچ مچ کا راون بھی کاغذ کا ہو کے رہ جاتا ہے۔

"پپا، یہ راون سچ مچ کا تھوڑا ہی ہے۔"

"ہاں بیٹے، یہ راون سچ مچ کا تو نہیں۔"

"سچ مچ کا راون کہاں تھا پپا؟"

"والمیک کی کلپنا میں بیٹے۔"

"کلپنا کیا ہے پپا؟"

مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھاؤں۔

"اور والمیک کون تھا؟"

"میرا باپ!" اس کے سوالوں کے تانتے سے میں چڑ سا گیا۔

"لڑتے کیوں ہو، پپا ؟"

میں ڈھیلا پڑ گیا۔

" والمیک ہم سبھوں کا باپ تھا بیٹے "

" تم جھوٹ بول رہے ہو پپا" وہ بدستور خفا تھا۔ " یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟"

اب میں اسے کیسے بتاتا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟

"جیسے راون کے دس سر تھے "

" مگر پپا میری سمجھ میں تو ابھی تک نہیں آیا کہ راون کے دس سر کیسے تھے

مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔

"جیسے میرے ایک سر کے اندر دس سر ہیں جنھیں تم چاٹ چاٹ کر خالی کر رہے ہو "

اس نے چونک کر سوال کیا۔ تمہارے ایک سر کے اندر دس سر ہیں پپا ؟ کیسے ؟"

" جیسے تمہارا ایک سر بھی نہیں "

"مگر میرا ایک سر تو ہے، یہ دیکھو"

" کہاں ؟ میں نے بچے کے چھوٹے سے سر کو ہتھیلی میں لے لیا اور ناراض ہونے کے باوجود کھلکھلا کر ہنسنے لگا اور اس کیفیت میں گویا اپنا ایک سر بھی کھو کر مسرت سے چھلک پڑا۔

" تم ٹھیک تو ہو پپا ؟ " موہت نے اپنا سر جھٹک کر میری ہتھیلی سے چھڑوا لیا۔

مجھے واقعی جب کبھی بے ذہن، معصوم مسرت کا احساس ہوتا ہے تو میرا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے اور میں بہت پریشان ہونے لگتا ہوں اور اپنی اس حالت میں کام کاج کرتے ہوئے مجھ سے بعض اوقات بڑی سنجیدہ نوعیت کی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں چند ہی ماہ پہلے تو حد ہو گئی۔ ہتھیاروں کی ٹسکری کے ایک معاملے میں مجھ سے اتنی بھیانک چوک ہو گئی کہ میری ساری شیخی دھری رہ جاتی۔ بھلا ہو سرکاری اسٹاف میں سے اپنے ایک آدمی کا، جس نے اتنی صفائی سے سارے کیس کو گول مول کر دکھایا کہ میں کہیں نظر ہی نہ آتا تھا نتیجے میں اس بے چارے کو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑ گیا۔

موہت شاید بیزار ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا مگر اسی اثنا میں گولوں کے دھاکوں کی آواز سے گھبرا کر میری گود میں آ بیٹھا۔ راون کے پتلے پر چاروں طرف سے میزائل چھوڑے جا رہے تھے اور اس کے باوجود آناً فاناً شعلے اٹھنے لگے تھے۔ عین اس وقت ہمارے قریب ہی ایک خیمہ میں ہلڑ مچ گیا اور بھیڑ کی بھیڑ ادھر ادھر دوڑنے لگی۔

"کیا ہوا؟ — کیا — ؟"

" دہشت گرد ٹریٹرز گولیاں چلا کر بھاگ نکلے ہیں "

میں نے گھبرا کر موہت کو اپنے بازوؤں میں اٹھالیا اور دھکم پیل کے باوجود رام لیلا گراؤنڈ کے بیرونی گیٹ کی طرف ہولیا اپنی گاڑی تک پہنچ کر ہی دم لیا۔

گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے میں نے دیکھا کہ شعلے راون کے وجود سے اٹھ کر آسمان تک پہنچ رہے ہیں۔

"پپا! موہت نے اپنا کوئی سوال پوچھنے کے لئے منہ کھولا تو میں نے اسے ڈانٹ کر ٹوکا "چپ!" اور سٹارٹر کے حلق میں چابی ٹھونس دی!"

"بول شری رام چندر کی جے!"

رام لیلا گراؤنڈ میں بکھری بکھری چیخ پکار اب شادماں نعروں کی مُنظّم گونج میں ڈوبنے لگی تھی۔

"پپا۔" ہماری گاڑی نے حرکت کی تو موہت نے منہ میں رو کا ہوا سوال اُگل ہی دیا۔ "کیا راون کاغذ کا بنا ہوا تھا۔؟"

"نہیں کیوں؟" میں اسے ڈانٹ کر چپ رہنے کو کہنا چاہتا تھا مگر پوچھ بیٹھا۔

"تو پھر یہ لوگ ہر سال کاغذ کا راون کیوں جلاتے ہیں؟"

"چپ!" میں اسے کیا بتاتا؟ — کیوں کہ اصلی راون ہر سال بچ کر نکل جاتا ہے؟۔

•••

۲۰۶ مندا کنی اینکلیو۔ الکھ نندا کمپلیکس نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

فون ۶۴۱۴۰۳۶

ایکو صاحب سب کے ماہیں
برا بھلا سب کہیئے کاہیں

गोपाल मित्तल

एको साहिब सब के माहीं,
बुरा भला सब कहिये काहीं।

जाते-ख़ुदा-ए-पाक है सर चश्मःए-हयात
रोशन उसी के नूर से है सारी कायनात

रोशन इसी चिराग़ से होता है हर दिया
इनसान क्या है अक्स है उस ज़ात पाक का

रोशन उसी के नूर से हिन्दू का है ज़मीर
मुस्लिम का क़ल्ब भी है उसी ज़ौ से मुस्तनीर

येः है तो फ़र्क़ काफ़िर-ो-दीं-दार किस लिये
येः बहस किस लिये है येः तकरार किस लिये

किस को बुरा बताइये कहिये किसे भला
जलवः नुमा है दोनों में जब एक ही ख़ुदा

ख़ालिक़ वोः सब का है सभी बंदे उसी के हैं
पुर-नूर जिस से दिल हैं वोः जलवे उसी के हैं

اُتّم سنگت اُتّم ہووے
گُن کو دھارے اوگن دھووے

उत्तम संगत उत्तम होवे,
गुण को धारे औगण धोवे।

गर आरज़ू है क़ल्ब तेरा भी हो ताबदार
सोहबत को एहले-सिद्क़-ो-सफ़ा की कर इख़्तियार

करता है जैसे मेहर से चांद इक़्तिसाबे नूर
है क़ुर्बे एहले-हाल युहीं मूजिबे-सरूर

होती है उस से रूह पुर अनवार-ओ-पुरज़िया
दिल के लिये निगाह है मोमन की कीमीया

पानी से धुल के कपड़ा हो जिस तरह साफ़-ो-पाक
होती है रूह सोहबते-सालेह से ताबनाक

मर्दान-सिदक़ की है निगाहों में वोः फ़सूं
जिस से बदी फ़ना हो और औसाफ़ हों फ़ज़ूं

पाकीज़गी-ओ-नूर की हामिल है येः निगाह
करती है दूर क़ल्ब से तारीकिये-गुनाह

خورشید عالم
۶/۶۴، سمیع ہاؤس، مالویا روڈ
دیوریا- ۲۷۴۰۰۱ (یوپی)

افسانہ

سہمے ہوئے

گھڑی نے لنچ کے وقت کا اعلان کردیا۔

آفس کے سارے لوگ روز کی طرح میز پر اپنے اپنے ٹفن بکس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ لوگ ٹھنڈی روٹی کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد پیٹ نے کہا — اب بس!

من نے کہا — میرے حصے میں کچھ نہیں آیا۔

تن اُکھڑا اُکھڑا سا چونچلے کرتا رہا۔ اس کی خاطر تواضع کے لئے کچھ تو کرنا ہی تھا تاکہ انھیں سچ مچ انسان ہونے کا احساس ہو سکے۔ اس انسانی آنچ میں ان کے مستقبل کے سچ بستہ خواب پھر سے لہلہانے لگیں گے، اس میں پھر سے کچھ نئی کونپلیں پھوٹ پڑیں گی، ان کی آوازوں میں اعتماد کی جان پڑ جائے گی۔

تخیلات کے گھوڑے دھرتی کی دھڑ پکڑ کے حدود پار کر کے دور خلا تک جا پہنچیں گے اور تب وہ بھول جائیں گے کہ نوکری ان کے دل اور ارمانوں کا خون پی رہی ہے — کہ یہ محکمہ والے کم سے کم تیل میں اپنے زیادہ سے زیادہ پکوڑے تل لینا چاہتے ہیں — کہ ساری دنیا کی چھٹی ہوتی ہے پھر بھی ان کے کڑاہے کے نیچے آگ جلتی رہتی ہے — کہ دنیا اتوار کو چھٹی مناتی ہے اور ہمیں دوشنبہ کو چھٹی ملتی ہے۔ اب بتاؤ دوشنبہ بھی چھٹی کے لئے کوئی دن ہے۔ جب ہم کالج میں تھے تو لگتا تھا ہم دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں لیکن نوکری کرتے ہی محسوس ہوا جیسے ہم پھر سے اسکول میں بھرتی کر دیئے گئے ہوں اور گیٹ پر تالا لگ گیا ہو۔

ام بیش نے ایک سگریٹ اسلم کی طرف بڑھایا اور ایک اپنے ہونٹوں کو تھما دیا۔ اسلم نے دونوں کو ماچس سے سلگا دیا کہ دونوں سگریٹ کے سرے گلابی ہو گئے۔

وہ دونوں اپنی اپنی کرسی پر بے خوابی کے عالم میں آگئے پہلے منھ میں دھواں بھر لیتے ——— کچھ پل اُسے وہیں روکے رکھتے جیسے ذہن میں کسی جمی ہوئی شئے کو دھوئیں کی حرارت سے پگھلا رہے ہوں ——— پھر رفتہ رفتہ ہونٹوں کے کناروں سے باہر پھینک دیتے۔

کچھ پل ایسا کرنے کے بعد وہ اُٹھے اور سیڑھیاں طے کرکے پاتال سے دھرتی پر آگئے ہلکی پھلکی باتوں کا الاؤ سلگ اُٹھا۔

ایک طرف خوبصورت بنگلے نما جدید طرز کے مکانوں کی قطاریں دوسری جانب درختوں سے گھرا پارک اور درمیان میں بچھی ہوئی بجری کی صاف ستھری کالی سڑک۔ ہر چیز جیسے کنواری ہو۔ ایک انجانی مسرت کے احساس نے انھیں گھیر لیا۔ ہلکے دھوپ میں ٹہلتے ہوئے چھوٹے سے بازار کی طرف بڑھ گئے۔ بازار جہاں ہر چیز کی قیمت شہر سے دوری کی وجہ سے دوسرے بازاروں سے زیادہ ہے۔ بھیڑ بھاڑ، شوروغل اور سبزی والوں کی چیخ و پکار سے محرومی کی وجہ سے یہ بازار نہ لگ کر کوئی ننھی سی بے شمار رنگوں والی نمائش لگتی ہے۔

وہ پان والے کی دوکان کی طرف بڑھ گئے۔ چمچماتے برتن کی قطار کے پاس بیٹھے پان والے نے انھیں دیکھتے ہی ان کے رنگ کا پان بنانا شروع کر دیا۔ ننھے ننھے بیلن اور چمچی برتنوں سے نکل نکل کر پان کے پتّوں پر تیزی سے مصوری کرنے لگے۔

دونوں نے ایک ایک پان لیا اور منہ کے لیٹر بکس کے حوالے کیا کہ مَن تک پہنچا دے مَن سنگترے کی قاشوں کی طرح مسکرانے لگا۔

گھڑی دیکھی۔ دو بجنے والے تھے۔ قدم واپس آفس کی طرف لوٹا لیے گئے۔

آکاشوانی سے نشر شدہ دُھنوں کو گوشِ گذار کرتے رہے۔ محترم دانت پان کا سنگیت چبا رہے تھے، ؟ زبان باتوں کی دُھن کترتی ہوئی چلی جا رہی تھیں اور مَن مہاراج اپنے چیلوں کے درمیان چوکڑی مارے مَند مَند مسکرائے جا رہے تھے۔

"پکڑ لو انھیں!" جیپ میں بیٹھا گشتی حولدار اچانک کسی آدم خور کی طرح ان کی گردن پر سوار ہو گیا۔" اے! یہاں کیا کر رہے ہو؟ شہر میں شکھ شانتی اور عورتوں کی عزت و آبرو کی حفاظت میں لگے حولدار نے پوچھا۔

"کیوں، ہم نے کیا کیا ہے؟" دونوں کی سہمی ہوئی آوازیں تقریباً ایک ساتھ باہر آئیں۔
تھانہ چل کر تم لوگوں کو سب پتہ چل جائے گا کہ تم لوگ کیا کر رہے تھے؟"
تھانہ؟ لیکن تھانہ کیوں؟ تھانے کے لائق کون سا کام ہم لوگوں نے کیا ہے؟"
ان کا دماغ اخباروں کی سڑک پر بدحواس دوڑ پڑا۔ کہیں پھر راتوں رات ایمرجنسی تو نافذ نہیں کر دی گئی ہے؟ کیا ہمارا ٹھگنا سا وجود اتنا باغی ہو گیا ہے کہ حکومت کو ہم سے خطرہ معلوم ہونے لگا ہے؟ کیا ہم اچانک اتنے اہم ہو گئے ہیں؟ کہیں ہم سوتے سوتے کسی غیر قانونی پارٹی سے، کالے دھندے سے، کسی اسمگلروں کے گروہ سے وابستہ تو نہیں ہو گئے ہیں؟ کہیں کوئی کالا دھن تو ہم نے اپنے گھر میں نہیں چھپا رکھا ہے، اور جس کی ہمیں خبر ہی نہیں ہے۔ سفید دھن تو ہمارے پاس اتنا ہے نہیں کہ ہم اسے چھپا سکیں۔ کہیں ہم انکم ٹیکس کی چوری تو نہیں کر رہے ہیں؟ لیکن انکم تو ٹیکس جتنی ہے نہیں کیا ہم نے کمپنی کے دھن کا غبن کر لیا ہے؟ یا جعلی نوٹ چھاپے ہیں، یا کسی لیڈر پر انجانے میں چاقو سے وار کر دیا ہے، یا کہیں غلطی سے کوئی سچ بک دیا ہے؟ یا صحیح اناج کا کھانا کھا لیا ہے، یا کسی سے رشوت لے لی ہے؟ اس نوکری کے لیے تو دینی پڑی تھی لیکن واپس لینے کا ابھی کوئی سنہرا موقع ہاتھ نہیں آیا ہے۔ کیا ہم نے کسی جہاز کا اغوا کر لیا ہے؟ لیکن ہم اسے اغوا کر کے کریں گے کیا؟ اسے رکھیں گے کہاں؟ پٹرول کتنا مہنگا ہے۔ فی الحال تو ہمارے لیے پیروں سے چلنے والی سائیکل اور ٹرین کا ماہانہ پاس کافی ہے۔
اخباروں کی کوئی بھی سنسنی خیز سرخی اُن پر نہ چپک سکی۔ تب انھیں محسوس ہوا کہ وہ کسی بڑے حادثے نہیں بلکہ کسی مذاق کے شکار ہو گئے ہیں۔ اس لیے دوستانہ انداز میں پوچھا "یار! ہم نے کیا کیا ہے؟ ہمیں کیوں یونہی پریشان کر رہے ہو؟ آج تو اپریل کی پہلی تاریخ بھی نہیں ہے۔" "اوہ! ہمیں اپنا یار کہتے ہو؟ ہمیں گالی دیتے ہو۔ کیا ہم تم لوگوں کو بدمعاش نظر آتے ہیں؟"
اُرے تو کیوں بے وجہ ہم پہ تھانیداری جھاڑ رہے ہو؟ ہم تو اپنے آفس جا رہے ہیں۔ وہ سامنے ہی تو ہمارا آفس ہے۔ جہاں ہم کام کرتے ہیں۔ بے شک ہمارے صاحب سے چل کر پوچھ لو۔ کیا تم نے ہمیں سڑک چھاپ آدمی سمجھ رکھا ہے؟
"بک بک مت کرو! ہم سب سمجھتے ہیں۔ تم لوگوں کا ہیڈ آفس تو یہ ہے۔ گشتی

حولدار نے داہنے طرف بس کا انتظار کرتی لڑکیوں اور ان کے کالج کی طرف اشارہ کیا۔
"سالے ہمیں بدھو بناتے ہیں۔ اب تم لوگوں کے دن لد گئے ہیں۔ شاید تم لوگوں کو ابھی تک پتہ نہیں چلا ہے۔ شاید تم لوگ اخبار نہیں پڑھتے۔ اب لڑکیوں کے ساتھ چھیڑخانی کرنا جُرم ہے، سالے لڑکیوں کے دشمن !"
"گالی کیوں دیتے ہو، تمیز سے بات کرو !"
"یونہی رعب جمائے جا رہے ہو۔ ہم نے کسی کو چھیڑا ہے، پہلے یہ تو بتاؤ۔ کسی سے بھی پوچھ لو۔ لنچ کے وقت ہم یہاں پان کھانے آئے تھے۔ پان والے سے پوچھ لو، ہم روز یہاں آتے ہیں۔ بے شک ہمارے صاحب کو بُلا کر پوچھ لو"
"کیا پوچھ پوچھ کا پہاڑہ پڑھ رہے ہو۔ یہ گھاس کسی اور کو ڈالنا۔ تھانے میں چل کر ہم سب کچھ پوچھ پوچھوا لیں گے۔ سیدھے سے جیپ میں بیٹھو ورنہ ......"
ورنہ ...... ورنہ کیا؟ ہتھکڑی، نوکری سے چھٹی غیر معینہ مدّت کے لیے جیل؟ مقدمہ؟ پولیس کی رسّی میں بندھے آگے آگے وہ لوگ اور ایک معزز تماشہ بین پیچھے پیچھے؟ ان کا جی چاہا اپنی عزت جیب میں ڈال کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوں۔ جیسے سارا جسم پتھر کا ہوگیا ہو۔
آج تو وہ ہو رہا ہے جو کبھی نہیں ہوا —— جیسا کبھی سوچا نہیں، جیپ کی طرف بڑھتے ہوئے ان کی نگاہوں نے اس جمہوریت کو بار بار ملامت بھیجی۔
جب تھانے پہنچے وہاں پہلے سے ہی پکڑے گئے عورتوں کے دشمن ایک کمرے میں بند کئے گئے تھے۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ یا نی پی کر ایک کھاٹ پر سو رہے تھے۔ انھیں بھی اسی گھاٹ ڈال دیا گیا۔ شرم کے مارے ان کی آنکھیں اوپر نہیں اُٹھ پا رہی تھیں کتنے ہی لمحے خاموشی میں بیت گئے۔ ایک لفظ تک منہ سے نہ نکل سکا۔ انھیں لگا ان کے اور دوسرے قیدیوں کے درمیان ایک اونچی دیوار ہے۔ وہ، وہ نہیں ہیں جو اور لوگ ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ آپ بیتی، بحثوں، ہنسی مذاق اور گالی گلوچ کے ماحول نے ساری دیواریں گرا دیں اور وہ صرف ذات آدم رہ گئے۔
فائل میں ان کا نام۔ ان کے والد کا نام، پتہ اور ان کا قصور نوٹ کرلیا گیا۔ ان کی گھڑی، جیب کے پیسے، انگوٹھی سب جمع کرلیے گئے۔

حولدار نے اپنی ڈائری کھولی۔ ایک لمبی فہرست کے نیچے دو آدمیوں کا اور اندراج کیا۔ اندر ہی اندر جوڑ گھٹانا لگایا ـــــــ بس دس آدمی اور چاہیئے۔ اپنے اس علاقہ کا کوٹہ پورا کرنے کے لئے۔ کبھی پریوار نیوجن کا کوٹہ، کبھی غیر سماجی عناصر کی پکڑ دھکڑ کا کوٹہ، اسمگلروں کا کوٹہ، کالے دھن والوں کا کوٹہ، ٹیکس چوروں کا کوٹہ اور اب عورتوں کے ساتھ چھیڑ خوانی کرنے والوں کا کوٹہ ـــــــ ہمارے وزیروں، افسروں اور سماج کی یہ شکایت دور ہونی ہی چاہیئے ہم موجودہ قانون کا پورا فائدہ نہیں اٹھاتے ـــــــ ہم فرض شناس نہیں ہیں۔ یہ دونوں نوجوان کہتے ہیں کہ یہ بے گناہ ہیں۔ میں بھی کہتا ہوں کہ وہ بے گناہ ہیں۔ جمہوریت میں تو اِسی بات کی آزادی ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی بات کہہ سکے، لیکن یہ کوٹہ کی طے شدہ پالیسی کہتی ہے کہ وہ بہت بڑے مجرم ہیں ـــــــ ہماری لیاقت اور فرائض کو پوری کرانے کے مجرم۔ خیر، کوئی حرج نہیں۔ ہم انھیں زیادہ پریشان نہیں کریں گے۔ جس طرح کبھی جنتا کو ہماری ضرورت پڑتی ہے اسی طرح ہمیں بھی تو کبھی عوام کے مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی تو جمہوری نظام کا فائدہ۔ ہم ان کے لئے کتنی بار جان پر کھیل جاتے ہیں تو کیا عوام ہمارے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتے؟ دن کے دو سے شام کے پانچ بج گئے۔ بار بار کی خوشامد کے بعد ان کے آفس میں فون کیا گیا۔ انھیں اپنے باس سے بات کرنے کی اجازت دی گئی۔

ان کے 'باس' معاملہ سنتے ہی اپنے دو معاونین کے ساتھ وہاں آ پہنچے۔ ان کی ضمانت پر اس رات انھیں رہا کر دیا گیا۔ جن کا کوئی وارث نہیں تھا یا کہیں خبر کر پانے میں مجبور تھے۔ جن کی کوئی ضمانت نہیں تھی انھیں وہ رات اسی تھانے کی سلاخوں کے اندر کاٹنی پڑی۔ تھانہ چاہتا بھی یہی ہے کہ وہ ایک رات اس کے پاس گزاریں' تاکہ انھیں معاملہ کی سنجیدگی کا پتہ چلے ـــــــ تاکہ وہ لڑکیوں کی عزت کرنے کا پہلا سبق سیکھ سکیں۔

'باس' اپنی کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ دونوں سر جھکائے، خاموش، احسان کے بوجھ تلے دبے، پیچھے پیچھے گھسٹتے چلے جا رہے تھے۔

'اب تم لوگ شادی کر لو! عمر تو تم لوگوں کی ہے ہی!' انھوں نے سنا باس اُن سے کچھ کہہ رہا تھا۔

"لیکن سر، ہم لوگوں نے ایسا ویسا کچھ نہیں کیا!"

"خیر کوئی بات نہیں۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہ کسی بات کا کوئی مطلب ہی نہیں نکلتا!!"

رام لعل
شانتی نکیتن، ڈی ۲۳۹ اندرانگر
لکھنؤ ۲۲۶۰۱۶

(افسانہ)

جلتا ہوا ٹائر

"سُنو جی! کیا کہہ رہی ہوں میں !!!!"
"ٹفن پیک کر دیا ہے میں نے!!!!"
ڈبہ اُٹھا کر لے جاؤ نا اب !!!!
رسوئی میں سے گونج کر نکلتی ہوئی سکھونت کور کی مترنم آواز کے ہر جملے کے آخری حرف پر نہ صرف غیر ضروری زور ہے بلکہ اُس میں ایک غیر معمولی طوالت بھی ہے۔ جیسے کوئی بچہ ببل گم چباتے چباتے اُسے منہ سے بار بار کھینچ کر لطف اٹھا رہا ہو،
"سن لیا حضور، سن لیا، زیادہ مت چلاؤ مہربانی کر کے۔ یہ ــــ پینٹ کی زپ پھنس گئی ہے ذرا۔ آتا ہوں !!!"
'آتا ہوں' کو اُس نے بھی ببل گم کی طرح کافی لمبا کھینچا ہے۔ یہ سردار بے انت سنگھ بھلر ہے۔ کریم سے تازہ تازہ جمائی ہوئی داڑھی پر ٹھاٹھا باندھ رکھا ہے جس کے دونوں سروں کو اس کی لال رنگ کی پگڑی کے عین اوپر گانٹھ لگا دی گئی ہے پیشانی پر اتری ہوئی پگڑی کی خوبصورت تہوں کے نیچے پلٹے ہوئے پیلے پٹکے کی جھلک بھی بڑی خوشنما لگ رہی ہے۔ اسی رنگ کی آدھی آستین کی جالی دار جرسی اور اُس کے نیچے سفید پتلون، جس کی زپ اس نے اپنی ہڑبڑاہٹ میں ہی پھنسا لی ہے۔ اونچی ایڑی کے سفید کاف کے بوٹوں سے ٹھپ ٹھپ کی آواز کرتا ہوا رسوئی میں آ دھمکتا ہے۔
دس خال بلیئے! اب کیا کروں؟ اسی لفڑے میں روز ہی گھر سے نکلنے میں دیر ہو جاتی ہے"
سکھونت ذرا سا جھک کر اس کی اُلجھن کا جائزہ لیتی ہے۔ بھلر کا ہاتھ ہٹا کر جھٹ سے زپ چڑھا دیتی ہے اور مصنوعی غصے سے کہتی ہے ــــ "آپ کو

تو بلا وجہ ہر چیز سے اُلجھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اوپر سے مجھے بھی پریشان کر دیتے ہیں؟"

ابھی وہ سیدھی کھڑی بھی نہیں ہونے پائی کہ وہ خود کو اپنے مرد کے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں جکڑا ہوا محسوس کرتی ہے۔

"یہ — یہ کیا کر رہے ہیں جی! اُفوہ! اب تو دیر نہیں ہو رہی ہے نا دفتر جانے میں! — میں کہتی ہوں، ہٹیئے بھی! نہیں تو بے بے کو بلاتی ہوں — بے بے!"

لیکن وہ اُس کی آواز اُس کے حلق میں ہی دبا دیتا ہے۔ اس کے نازک سے دہانے پر اپنا پورا وحشی منہ رکھ کر۔

"بے بے دی بچّی! بھول گئی، انہوں نے تیرا انتخاب لاکھوں میں سے کیا تھا؟ یہی سوچ کر کہ تُو اُس کے اکلوتے پُتّر کے لئے میٹھی برفی ہی ثابت ہو گی!"

"مَیں کہتی ہوں آپ جاتے ہیں کہ نہیں؟" وہ ہاتھ بڑھا کر کلکنگ بینچ پر سے اسٹین لیس اسٹیل کا بیلنا اٹھا لیتی ہے۔ "دے ماروں گی اب! پھر مت کہیئے گا!"

"لے مار! مار نا، میری بُلبُل! مارتی کیوں نہیں اب؟"

وہ پیٹھ گھمائے لیکن گردن موڑے اُس کی طرف بڑی شریر نظروں سے تاک رہا ہے اور مسکرا رہا ہے اور اپنے ہونٹوں پر جیسے لگی ہوئی مٹھاس کو بھی زبان پھیر پھیر کر چاٹتا جا رہا ہے۔

سکھونت بے بس سی ہو کر بیلنا پھر سے اپنی جگہ پر رکھ دیتی ہے "آپ کو تو واہگورو ہی بخشے تو بخشے میں تو ہار گئی۔ اب جائیے بھی، میں کہتی ہوں! دس بجنے کو آگئے اور یہ ہیں کہ ابھی تک!"

وہ دروازے کی جانب بڑھتے بڑھتے اچانک رُک جاتا ہے۔ پھر پلٹ کر دیکھتا ہے اور معذرتی انداز سے کہتا ہے — "جان کیا کروں؟ تیری بے پناہ خوبصورتی دیکھ کر سب کچھ بھول جاتا ہوں۔"

"میں بے پناہ خوبصورت لگ رہی ہوں آپ کو؟ اس حال میں!" وہ اپنی مُدھلی ہوئی شلوار قمیض پر ایک نگاہ ڈالتی ہے۔ پھر اپنے چہرے کے ارد گرد جھولتی ہوئی بالوں کی لٹوں کو چھوتی ہے — "نہائی نہ دھوئی! کنگھی تک تو نہیں پھیر پائی ہوں ابھی تک

اس پر بھی کہتے ہیں (بھلر کی نقل اتارتی ہوئی) جان، کیا کروں؟ سب کچھ بھول جاتا ہوں !لیجیے، پکڑیے اپنا ٹفن باکس اور چلتے پھرتے نظر آیئے۔ مجھے اور بہت سے کام کرنے ہیں ابھی۔ سارے کمروں میں جھاڑو پوچا مارنا ہے، کپڑے بھی دھونے ہیں، ایک نوکر کا بندوبست تو کر کے دیتے نہیں اور چاہتے ہیں خوبصورت بھی بنی رہوں جانیے؟"

"ہائے! تیری اسی ادا نے تو مجھے!۔۔ تو ہر حال غضب ہے، بس غضب!"

وہ پھر آگے بڑھنا چاہتا ہے لیکن سکھونت اپنی پھوٹتی ہوئی اندرونی خوشی کو بمشکل تمام چھپا کر اسے دونوں ہاتھوں سے پرے دھکیل دیتی ہے۔ ساتھ ساتھ چلا بھی اٹھتی ہے ۔۔ "بے بے جی!"

بھلر اپنی ماں کے ڈر سے جلدی سے کھسک جاتا ہے جو دوسرے کمرے میں آنکھیں بند کئے جپ جی کا پاٹھ کر رہی ہے۔ وہ اپنے بہو بیٹے کی یہ پیار بھری تکرار روز ہی سنتی ہے۔ آج بھی اس نے پہلے کی طرح سنی اَن سُنی کر دی ہے۔

بے انت کے گھر سے باہر جاتے ہی جیسی سکھونت اچانک تنہا رہ جاتی ہے۔ وہ سارا شور جو اس کے اندر اور باہر بپا تھا یکسر ختم ہو جاتا ہے وہ اب کون سے کام کی طرف متوجہ ہو، کھڑی کھڑی یہی سوچ رہی ہے۔ اُسے نیچے سے اسکوٹر کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دے جاتی ہے تو وہ جلدی جلدی اپنے بال کھول کر انھیں پھر سے جوڑے میں لپیٹتی ہوئی بال کنی میں چلی جاتی ہے۔ دو منزل نیچے جھانک کر دیکھتی ہے۔ بے انت سنگھ بھلر معمول کے مطابق اس کے الوداعی دیدار کے لئے منتظر ہے۔ دونوں مسکرا کر ایک دوسرے کو "ویو" کرتے ہیں۔ اسکوٹر پارک کے گرد چکر لگاتی ہوئی درختوں کے پیچھے غائب ہو جاتی ہے۔ گھر سے نکلتے ہی وہ کس قدر مہذب اور متوازن ہو جاتا ہے! گھر کے اندر ہی اور وہ بھی اس وقت جب وہ اُسے اکیلی نظر آتی ہے۔ وہ کتنا بے قابو ہوا اٹھتا ہے! بالکل چانچے بچوں کی مانند جن کا شیوہ ہر خوشنما چیز کو لپک کر لے لینے والا ہوتا ہے۔

سکھونت کور کی نظر اچانک بغل والے فلیٹ کی بالکنی پر کھڑی ارچنا سریتواس کی طرف اٹھ جاتی ہے۔ دونوں کی نظریں ملتی ہیں تو وہ بے اختیار مسکرا

دیتی ہیں

"تمہارے وہ چلے گئے؟"

"ہا آں، وہ تو نو بجے ہی چلا جاتا۔ راستہ میں ببلی کو بھی اسکول میں چھوڑنا ہوتا نا۔"

شکھونت اپنے پڑوسیوں کے اس معمول کو بخوبی جانتی ہے۔ پھر بھی اکثر اسی طرح کی بات پوچھ بیٹھتی ہے اور کبھی شرمندہ نہیں ہوتی۔ اس وقت بھی اس نے اپنی بات پر غور نہ کیا اور نیچے اور دور سڑک کے موڑ تک نگاہ دوڑا کر پوچھا ہے۔ — "ابھی تک کوئی ترکاری والا نہیں آیا!"

"آیا۔ کوئی کھاس چیز نہیں رہا اُس کا پاس۔ ابھی دوسرا کوئی آیا تو تم کو پکارے گا۔"

"اچھا جی۔ ہاں آج مجھے ردّی بھی نکالنی ہے۔ دو مہینے سے بہت جمع ہو گئے ہیں اخبار وغیرہ۔ لیکن کمبخت ٹھیک طرح سے بھاؤ بھی تو نہیں بتاتے!"

"ہم کو بھی نکالنا ہے ردّی۔ ہمارے پاس تو گھی تیل کا بہت سا ڈبہ بھی جمع ہے بلب اور پلاسٹک کا پرانا چپل بھی ہے۔"

"اچھا، تم وہ جاپانی جارجیٹ کی ساڑی لے آئیں؟ کہہ رہی تھیں نا، نیا بازار میں ایک دکان پر دیکھی تھی!"

"ابھی نہیں۔ دو مہینے بعد ان کا سسٹر کا میرج طے ہو گیا ہے۔ آندھرا جانا ہو گا۔ ہا تم کونڈا میں تبھی لے گا۔ کچھ اور کپڑا بھی۔"

اچانک اپنی ساس کی پکار سن کر وہ 'آئی بے بے جی'، کہتی ہوئی اندر چلی آتی ہے وہ پاٹھ پورا کر کے اب ناشتے کا انتظار کر رہی ہے۔ سکھونت جلدی جلدی رسوئی سے پلیٹیں اور ڈونگے لا کر ڈائننگ ٹیبل پر رکھنے لگتی ہے۔ ساتھ ساتھ پوچھتی بھی جاتی ہے — "کل رات والی ماہنہ چھولے کی دال بھی نکالوں بے بے جی؟ مکھن اور ڈبل روٹی تو ہے ہی۔ صبح تھوڑا سا پنیر بھی بنا دیا تھا۔ وہ بھی لے آؤں؟ ساتھ کیا لیجے گا؟ لسی یا چائے!"

شام کو چار بجے کے قریب جب وہ دھوپ میں پھیلائے ہوئے ڈھیر سارے

کپڑے اُتار کر کمرے میں واپس آئی تو بہت تھک چکی تھی۔ اب کوئی اور کام کرنے کی اس کے اندر ہمت نہیں رہ گئی تھی۔ اُس کی ساس دیوان پر گہری نیند سو رہی تھی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے ہی کپڑوں کے ڈھیر پر سر ٹکا دیا۔

پارک میں کرکٹ کھیلتے ہوئے بچوں کے شور کی وجہ سے سکھونت کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن تھوڑی دیر سو لینے سے ہی وہ پوری طرح تر و تازہ ہو گئی تھی۔ اس کی ساس ابھی تک سو رہی تھی۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ جلدی جلدی دُھلے ہوئے کپڑوں کو تہ کیا۔ بستر کی چادریں، تکیوں و گدیوں کے غلاف اور تولیے الگ کئے۔ اپنے ساس کے دو پٹے، قمیض و شلواریں اور بے انت سنگھ کی بُشرٹیں و پتلونیں اٹھا کر کمرے کے ایک کونے میں لے گئی جہاں فرش پر بیٹھ کر وہ انہیں پریس کیا کرتی تھی۔ گھنٹے بھر میں یہ سارا کام کر چکی تو جلدی سے کپڑے بدل ڈالے بالوں کو بھی سنوار لیا۔ جب وہ آئینے کے سامنے بیٹھی میک اپ کر رہی تھی تو اسے بار بار یہی خیال آرہا تھا کہ اس کی یہ ساری آرائش اُس کے شوہر کو دیکھتے ہی پاگل بنا دے گی۔ وہ یوں بھی ایک جوش میں بھر جاتا ہے۔ کسی بھی عورت کے لئے اپنے آدمی کے دل میں پیار کے ایسے شدید جذبے کا ابل ابل پڑنا باعث فخر ہی ہوتا ہے لیکن وہ اپنا پیار ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ جس قسم کے بازارو جملے زبان سے نکالتا ہے، انھیں سن کر سکھونت کو بڑی الجھن ہونے لگتی ہے۔ بلکہ ایک صدمہ سا محسوس ہوتا ہے اُسے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ عورت ہے۔ اس کا شوہر بھی فرٹیلائزر کارپوریشن میں ایک جونیئر افسر ہے۔ لمبا تڑنگا، خوبصورت اور باوقار۔ لیکن پتہ نہیں کیوں اس کے قریب آتے ہی اُسے کیا ہو جاتا ہے! جان، غضب، میری لیلیٰ، میری ہیر، برفی کی ڈلی جیسے کئی القاب سے اسے پکارنے کے علاوہ کبھی کبھی وہ اس قسم کی گھٹیا باتیں بھی کہہ جاتا ہے۔

"جی چاہتا ہے، آج تجھے کچّا چبا جاؤں!"

"آج تو تیرے بدن سے تازہ بھُنی ہوئی جوار کی خوشبو پھوٹ رہی ہے! مرک مرک کرکے یوں ہی کھا جاؤں!"

یہ سب سننا اُسے بے حد تکلیف دہ لگتا ہے۔ توہین آمیز بھی جیسے گلی بازار

میں سے اُسے جاتا دیکھ کر کسی لوفر نے فقرے بازی کر دی ہو!

اپنی ساس کے جاگ اٹھنے کی آہٹ پاکر وہ اُسکے کمرے میں گئی تو وہ بھی اُسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں اپنی بہو کے حُسن کے لئے بے پناہ تعریف واپنائیت بھری ہوئی تھی۔ وہ شرماسی گئی۔ جلدی سے بولی۔

"چائے بنالاؤں بے بے جی!"

"میرا پُتر آگیا؟" وہ اس کی طرف ابھی تک اپنے بیٹے کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

آنے کا وقت تو ہو ہی گیا ہے" ساس کی نظروں سے بچنے کے لئے وہ وہاں سے ہٹ کر بالکنی میں چلی گئی یہ سوچتی ہوئی کہ اس ماں نے اُسے واقعی کچا چبا جانے کے لئے ہی اپنے بیٹے کے لئے انتخاب کیا تھا بے شمار لڑکیوں کو دیکھنے اور پرکھنے کے بعد۔ اسے اس بات کے لئے ذرا سا بھی افسوس نہیں ہوتا کہ اس کا بیٹا اس کے لئے کتنے گندے گندے الفاظ زبان پر لے آتا ہے۔ وہ سب سنتی اور سمجھتی ہے شاید من ہی من میں خوش بھی ہوتی ہے! ہر ماں اپنے بیٹے سے اپنی پسند کا اعتراف اسی طرح چاہتی ہے۔ بھلے ہی وہ اپنی بیوی کا ناک میں دم کر دیتا ہو۔

بچّے کھڑی اینٹوں کے وکٹ بنا کر کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے دفتروں میں کام کرنے والے اب واپس آرہے تھے۔ سائیکلوں، اسکوٹروں اور دوسری آٹو گاڑیوں سے۔ کئی لوگ بسوں سے اتر کر دھیرے دھیرے پیدل بھی آتے دکھائی دیے۔ ارچنا سر نیواس کے آدمی نے اپنی آٹھ نو برس کی بیٹی کو اسکوٹر کے پیچھے بیٹھائے پارک کا موڑ کاٹا اور بی بلاک کے فلیٹوں کے سامنے پہنچ کر سڑک پر رک گیا۔ اس نے سر اُٹھا کر دو منزل اوپر دیکھا۔ ارچنا اپنے جوڑے میں ہیئر پن ٹھونکتی ہوئی اسی وقت اندر سے برآمد ہوئی تھی دونوں نے ایک دوسرے کی طرف بڑی خاموشی لیکن مسرور نظروں سے دیکھا۔ اُن کی بیٹی 'ہیلو ممی' کہتی اور اپنے کتابوں سے بھرے ہوئے بیگ کو پھر سے پیٹھ پر لادتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ آنے جانے والوں کی بھیڑ میں سکھونت کو بھی

اپنا آدمی آتا ہوا دکھائی دے گیا۔ اس نے دور سے سکھونت کو اپنے انتظار میں کھڑا دیکھا تو وہیں سے اپنے ہونٹوں پر ایک ہاتھ رکھ کر لہرا دیا۔ یہ اس کا ہوائی بوسہ تھا۔ وہی نوخروں والا انداز! نہ جانے کس کس نے اپنے فلیٹ سے یہ منظر نہ دیکھا ہوگا! وہ برا سا منہ بنا کر وہاں سے ہٹ آئی۔ اندر آکر سیدھی کچن میں چلی گئی۔ گیس پر ابلنے کے لئے پانی چڑھایا اور پھر اسی کمرے میں لوٹ آئی جہاں اس کی ساس موجود تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بے انت اوپر پہنچ کر اُسے تلاش کرتا ہوا کچن میں آجائے اور اس کی وہ گت بنا کر رکھ دے جس کے تصوّر سے بھی اس کی جان جاتی تھی۔

وہ اندر آگیا لیکن سکھونت اس کی طرف نگاہ اٹھانے کے بجائے ڈبے کھول کھول کر بسکٹ وغیرہ نکالنے میں لگی رہی۔ اس نے اس کی چاپ سن کر ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ادھر اُدھر بڑی بے چینی سے گھوم رہا ہے اپنی ماں کے ساتھ تو اس نے بس رسمی طور پر ہی ایک دو باتیں کہہ سن لی تھیں۔ اصل بات تو وہ اسی سے تنہائی میں کہنے کے لئے بے تاب تھا۔ ایک دو بار ہاتھ بڑھا کر اس نے بسکٹ بھی اٹھائے اور سکھونت کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ لیکن وہ تیزی سے پلٹ کر رسوئی کی جانب جاتی ہوئی بولی ــ "کپڑے نہیں بدلتے ہیں کیا؟ ہاتھ منہ بھی دھو لیتے؟"

اُس کا بس چلتا تو ان لمحوں میں ہرگز رسوئی میں نہ جاتی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی وہ اس کے پیچھے پیچھے لپکا ہوا ضرور چلا آئے گا۔ وہی ہوا۔ وہ کھولتے ہوئے پانی میں چائے کی پتی ملا رہی تھی کہ پیچھے سے آکر اس نے اسے اپنی باہنوں میں جکڑ لیا ــ "سوہنیوں، آج تو ایسا لگتا ہے کہ تجھے کوئی دوسرا دیکھ لے تو میں تجھ سے ہاتھ ہی دھو بیٹھوں گا!"

"اونہوں، ہٹیے بھی! ــ میں کہتی ہوں چائے گر جائے گی اوپر! دیکھ نہیں رہے، کتنی گرم ہے!"

"پر آج تو نے اس طرح بن سنور کر میرے اندر جو گرمی پیدا کر دی ہے، اس کا کیا ہوگا؟"

وہ بڑے جتن سے چائے کی کیتلی اٹھائے اٹھائے اس کے گھیراؤ سے نکل سکی۔

گھونٹ گھونٹ چائے سُڑکتے کے دوران بھی وہ ماں کی نظریں بچا بچا کر اس کی اور تاکتا رہا۔ اس کی ماں نے اپنے دیوان کے پاس ہی ایک تپائی پر اپنے لیے چائے رکھوالی تھی۔ پتہ نہیں وہ ان کی طرف متوجہ تھی بھی کہ نہیں لیکن سکھونت سر جھکا کر چائے پینے میں لگی رہی۔ اسے اپنی دلکشی پر پورا اعتماد تھا۔ جانتی تھی، وہ بے انت کی طرف توجہ نہیں بھی دے گی تب بھی وہ اس پر سے نظریں نہیں ہٹا سکتا!

اچانک بے انت نے سرگوشی کی — "آج کہیں باہر چلیں؟ کوئی فلم ہی دیکھ آئیں!"

اس کے شوہر کی دلچسپیاں بہت محدود تھیں۔ گھر سے گھر کے باہر لکچر ہال تک کبھی کبھار جان پہچان والوں کے یہاں وزٹ۔ جب وہ چنڈی گڑھ میں تھی تو وہاں سیمناروں، آرٹ گیلریوں اور تھیئٹر کے پروگراموں میں بے طرح مصروف رہتی تھی صبح کا اخبار دیکھتے ہی وہ معلوم کر لیتی تھی کہ اُسے شام کہاں گزارنا ہے۔ دعوت نامہ حاصل کر لینا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اپنی فرینڈز کو فون کر لیتی اور انہی کے جھرمٹ میں چہکتی ہوئی ہر جگہ پہنچ جاتی تھی۔ لیکن اس مرد کے ساتھ شادی کر لینے کے بعد جیسے اس کی ہر پسندیدہ سرگرمی کو بریک سا لگ گیا ہے۔ ایک اچھا اور آزاد گھر تو ہے لیکن اس کے ساتھ صرف جسم اور سستی قسم کی تفریح کے علاوہ کوئی دوسرا تصور وابستہ نہیں ہے۔ پچھلی بار وہ مائکے گئی تو وہاں سے اپنی پسند کی خریدی ہوئی کتابوں کے ذخیرے میں سے کچھ کتابیں اٹھا کر لے آئی تھی جو اُس کے ایک بیڈ روم کے پاس بنے ہوئے ایک ریک میں سجی ہوئی تھیں۔ گھر میں اس قدر کام رہتا ہے کہ اسے ان کتابوں کو کھول کر دیکھنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ مطالعے کا تھوڑا سا شوق بے انت کو بھی ہوتا تو وہ اس کے ساتھ اپنے تاثرات کی شرکت میں بے پناہ خوشی محسوس کرتی۔ لیکن وہ تو صبح کا اخبار تک بڑی بے دلی سے دیکھتا ہے۔ ٹی وی پر جب خبریں آنے لگتی ہیں تو وہ اکثر سوئچ آف کر دیتا ہے۔ کہتا ہے — "کیا رکھا ہے دنیا بھر کے لفڑوں میں۔ کچھ بھی بدلنے والا نہیں ہے۔ بدل بھی گیا تو ہمیں دال روٹی ملتی

رہے گی یہ کوئی نہیں چھین سکتا۔"

بے انت سنگھ نے کچھ دیر کے لئے باہر گھوم آنے کی تجویز رکھی تو وہ انکار نہ کر سکی۔ تھوڑی سی تبدیلی تو ضرور محسوس ہو گی۔ اس نے دھیرے سے ہوں، کہہ کر اپنی ساس کی طرف دیکھا۔ بے انت اس کا اشارہ سمجھ کر اپنی ماں کے پاس گیا۔ بولا ۔۔"بے بے، ہم ذرا دیر کے لئے گھومنے جا رہے ہیں۔ کھانا کھا کر آئیں گے۔ آپ کے لئے کیا لے آئیں؟ تندوری روٹی اور سندر داس کی دکان سے مچھلی؟ آپ نے کئی روز سے مچھلی نہیں چکھی ہے۔ جلدی لوٹ آئیں گے۔"

اس کی ماں نے ہاں یا نہ میں کوئی جواب نہ دیا۔ ایک بات یاد کر کے بولی ۔۔"ستندر پتر کا کوئی خط نہیں آیا بہت دنوں سے۔ واہ گورو سب خیر کرے۔"

اپنے چھوٹے بھائی کا اچانک ذکر سن کر وہ چونک اٹھا۔ لیکن بڑے اطمینان سے بولا۔ وہ ٹھیک ہی ہو گا بے بے۔ فکر والی کوئی بات نہیں ہے۔ کل ہی اسے چٹھی ڈال دوں گا۔ لکھوں گا کسی روز آ کر ہم سب سے مل جائے۔ بے بے بہت یاد کر رہی ہے۔ بس نا!"

سکھونت نے محسوس کیا، اس کی ساس کو گھر میں تنہا رہ جانا اچھا نہیں لگتا ہے۔ اکیلے، وہ ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے ہی رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن وہ اپنے شوہر کے ساتھ باہر نکل آئی۔ بے انت نے شہر جانے کے لئے ایک لمبا راستہ پکڑا۔ چوڑی، فراخ رنگ روڈ کا جس پر کئی اور گاڑیاں بھی فل اسپیڈ بھاگی چلی جا رہی تھیں۔ ہوا بہت اچھی تھی۔ ٹھنڈی اور تازہ۔ اس نے اسکوٹر کے پیچھے بیٹھے بیٹھے اپنے اڑتے ہوئے دوپٹے کو گردن کے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا۔ بے انت نے اسکوٹر کی رفتار اور تیز کر کے سر گھما کر کہا۔"مکھنوں، اپنی باہیں میری کمر کے گرد باندھ لو نا ذرا۔ ہاں خوب کس کے۔ نہیں تو اڑ جاؤ گی۔ بتا دوں!"

سکھونت نے ویسا ہی کیا۔ ان لمحوں میں وہ اچانک بے حد خوش ہو اٹھی تھی۔ یوں بھی اپنے مرد کے پیچھے بیٹھ کر گاڑی پر جانا اسے اچھا ہی لگتا تھا۔ اس کی مضبوط اونچی کاٹھی اس کے لئے ایک ڈھال سی بن جاتی تھی جس کے ساتھ

چپک کر اور اس کے ساتھ سر لگانے سے بڑا سکون ملتا تھا۔ اُسے صرف اس کی باتیں — اور باتوں میں تیسرے درجے کے حوالے ہرگز نہیں بھاتے تھے۔ لیکن ان حوالوں سے بچنا بھی تو مشکل تھا!

سینما ہال کے اندر بھی بے انت سنگھ بھلّر کا وہی رویہ رہتا تھا۔ وہ ایک اچھے درجے میں بیٹھ کر بھی سستے قسم کے لوگوں کی طرح فلم دیکھتا تھا۔ زوردار ڈائیلاگ سن کر تالی بجا دینا اور رومانی یا ہیجان انگیز مناظر دیکھ کر بے اختیار 'ہائے' کہہ اٹھنا اس کا خاص شیوہ تھا۔ آگے کی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تماشائیوں کی طرح وہ بھی ناچ ناچ کر گاتی ہوئی ہیروئن پر سکّے پھینک سکتا تھا، اگر وہ اسکرین کے کہیں قریب ہوتا تو! اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر وہ اسے دبوچ بھی لیتا تھا۔

اس روز سکھونت نے اس کی کوئی سرزنش نہ کی۔ اس کی ہر حرکت بڑے صبر کے ساتھ برداشت کرتی رہی اور سوچتی بھی رہی۔ وہ اپنے آدمی کی عادتیں کیسے بدلے؟ اس کے اندر کونسی ایسی کمی ہے جن کی وجہ سے وہ اتنا حد سے گزر جاتا ہے یہ صحیح ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت میں اس کے آبائی گاؤں کا بڑا ہاتھ ہے۔ لیکن گاؤں کے سارے لوگ تو ایسے ہرگز نہیں ہوتے۔ اُس نے اپنی تعلیم کا ایک دور دہلی جیسے شہر میں رہ کر بھی پورا کیا ہے۔ اور اسی شہر میں اب اُسے ایک معقول ملازمت بھی ملی ہوئی ہے۔ شاید اس لئے کہ اس کی کوئی بہن نہیں ہے۔" اس کے خاندان میں چچازاد، پھوپھی زاد، خالہ زاد بہنوں کا بھی ایک قحط سا ہے۔ یہ کمی تو سکھونت نے بھی اس گھر میں آکر محسوس کی ہے۔ وہ اس کی جھولی میں ایک ایسی نعمت کی طرح آگری ہے جس کی شاید اسے توقع نہ تھی۔

اُس نے اپنے رویوں پر بھی غور کیا۔ وہ ایک صوبائی صدر مقام پر پل کر بڑی ہوئی تھی اس کی ساری تعلیم و تربیت ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں لڑکوں و لڑکیوں کا ایک دوسرے سے ملنا جلنا کوئی غیر متوقع واقعہ ہرگز نہیں تھا۔ اس کے ڈیڈی ایک ریٹائرڈ منصف تھے جن کے مزاج میں تحمل، متانت، سنجیدگی اور غور و فکر کی عادات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ وہ اپنے تین بھائیوں اور چار بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ آرٹ اور ادب کی طرف گہرے رجحان نے اُس کے اندر کی وہ ساری شوخی

عرصہ ہوا چھین لی تھی جو ایک لاڈلی بیٹی ہونے کی وجہ سے اُسے فطری طور پر ملی تھی
شادی ہو جانے کے بعد اُسے جس طرح کے تجربے سے گزرنا پڑ رہا ہے اس کا اس
نے پہلے تصور نہیں کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ خود کو نئے حالات میں
کس طرح ڈھالے جو اس گھر کی دین ہیں۔ یہ گھر خاصا آرام دہ ہے مگر حیرت ناک طور پر
تنہا تنہا بھی لگتا ہے۔ اس میں ایک بیوہ ساس اپنے مسرور وجود کے باوجود خوفناک
بڑھاپے کی پرچھائیں زیادہ لگتی ہے اس کا ایک چھوٹا بیٹا پنجاب کے ایک ضلعی شہر میں
ٹرکوں کے کل پرزے کی ایک چھوٹی سی دکان کا مالک ہے۔ اس کا بڑا بیٹا سرکاری
نوکری میں ایک ذمہ دار عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اپنی نجی زندگی میں بے حد
ہولا واقع ہوا ہے۔ جیسے اس کے لڑکپن کی عمر ضرورت سے زیادہ لمبی ہو گئی ہو!

وہ رات کو گھر لوٹے تو بھلّر حسب معمول بے حد شوخ تھا۔ اپنے فلیٹ کے
دروازے پر بھی اس نے سکھونت کو دھر دبوچا جس سے سکھونت کے آنسو نکل نکل
پڑے۔ اس کی چیخیں بھلّر کی ماں نے بھی ضرور سن لی ہوں گی۔ لیکن وہ اندر
پہنچے تو بے بے ہاتھ میں ایک تار لئے بے حد اُداس بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ ایک پڑوسی
سے تار کا مضمون پڑھوا کر وہ سن چکی تھی۔ بھلّر اور سکھونت بھی وہ تار پڑھ ہکا
بکّا رہ گئے۔ بے انت سنگھ کے چھوٹے بھائی سنونت سنگھ کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا
تار اس کی بیوی بلجیت کور نے دیا تھا کہ بے بے کو فوراً بھیج دیا جائے۔

جب پچھلی بار سکھونت جالندھر گئی تھی تو اس نے اپنے دیور کی سرگرمیوں کو
خاصی شک بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ ایک تو وہ بہت سے اخبار پڑھنے لگا تھا
دوسرے کچھ لوگ رات کو چھپ کر اس سے ملنے آتے تھے جن کے ساتھ وہ لمبی لمبی
بحثیں کرتا اور انھیں چندہ بھی دیتا تھا۔

جالندھر جانے والی آخری گاڑی نکل چکی تھی رات کو روڈویز کی بھی کوئی بس
اُدھر نہیں جاتی تھی۔ آخر طے ہوا کہ صبح کی پہلی گاڑی سے بے انت بے بے کو
لے کر جائے گا۔

بے بے نے ساری رات پاٹھ کرتے ہوئے گزار دی۔ بے انت کو بھی نیند نہیں
آئی۔ وہ بستر پر خاموشی سے لیٹا چھت کو تکتا رہا۔ سکھونت اس کے پاس اسی ڈبل

بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرانی ہو رہی تھی کہ اس کے شوہر کا سارا جوش و خروش کیوں سرد پڑ گیا ہے۔ اس نے کئی بار ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا۔ اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا اور اس کے ساتھ خود ہی لپٹ لپٹ گئی۔

"کیا ہوا؟ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے، ستونت کی ضمانت نہیں ہو پائے گی۔ پولیس ہونے ہی نہیں دے گی میں جانتا ہوں ہو سکتا ہے اُسی سے سی آئی ڈی نے ہمارا پتہ بھی لے لیا ہو! اب میری سروس بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ بے بے کو وہاں پہنچانا نہ ہوتا تو میں وہاں جانا ہی نہیں۔ اب بھی کوشش کروں گا کہ وہاں چند منٹ سے زیادہ نہ رکوں۔"

جس روز بے انت سنگھ کو واپس آنا تھا اسی دن مسز گاندھی کو گولی مار دی گئی اور رات ہوتے ہوتے دلّی شہر فسادات کی لپیٹ میں آگیا۔ جن لوگوں نے آزادی کی لڑائی میں ساتھ دیا تھا، جنھوں نے کئی جنگی مورچوں پر ملک کا دفاع کرنے میں جانیں قربان کی تھیں، اور کھیل کود، تعلیم، آرٹ، کاروبار اور سیاست کے میدانوں میں ملک کا نام روشن کیا تھا اور جو روٹی روزی کے حالات بہتر بنانے کے لیے سڑکوں پر انقلاب زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگاتے وقت کندھے سے کندھا ملا کر ساتھ چلتے تھے ان، کے گھر لوٹے جا رہے تھے انھیں جلایا جا رہا تھا۔

ارچنا سرنواس بھاگی بھاگی سکھونت کور کے پاس آئی اور اس سے کہا "تم یہاں اکیلا نہیں رہو۔ بڑا خطرا ہے۔ چلو ہمارے گھر۔ وہاں کوئی تم کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔"

سکھونت کور کو یہ تو معلوم تھا کہ دہشت پسندوں کے کچھ گروہ پنجاب کے خاص خاص ہندوؤں و سکھوں کو اچانک گولی کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔ دربار صاحب پر حملے کے بعد تو یہ سلسلہ ہر روز کا ایک معمول بن گیا تھا لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایک روز اچانک پورے سکھ فرقے پر ایسا قہر ٹوٹ پڑے گا، کئی کالونیوں کو آگ لگا دی جائے گی اور کرفیو لگا دیا جائے گا اور فوج بھیج دی جائے گی۔ رات

کے کسی پہر میں اس کے فلیٹ میں بھی بلوائی گھس آئے اور سارا سامان اٹھا کر لے گئے۔ فرج، ٹی وی، برتن، کپڑوں سے بھرے ہوئے ٹرنک اور — اور بھی بہت کچھ۔ باقی جو بچا اسے جاتے جاتے دیا سلائی دکھا گئے۔

اُس وقت وہ ارچنا سرینواس کے اسٹور میں چھپی بیٹھی تھی۔ ارچنا اسے پل پل کی خبریں دے جاتی تھی اور یہ وشواس بھی دلا جاتی — تمہارے موجود ہونے کا کسی کو خبر نہیں۔ ''اچھا ہوا، تم رات پڑتے ہی چلی آئیں۔ نہیں تو وہ لوگاں کچھ بھی کر دیتا۔ کیا مالوم، آگ میں ہی جھونک دیتا!''

سرینواس نے کہا — یہ سین تو ہو بہو ویسا ہے جیسا پاکستان بنتے وقت دیکھا گیا۔ میں نے اس زمانے کی ہسٹری پڑھی ہے۔ ہندو مسلمین ایک دوسرے کو گاجر مولی کے موافق کاٹتا رہا۔ کتنی گاڑی ایک دم مسافروں سے بھری ہوئی ختم کر دیا۔ ساری ورلڈ میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ ہم کو مالوم ہے۔''

سکھونت نے رات بھر اتنے آنسو بہائے تھے کہ اب اس کی آنکھوں میں ایک بھی قطرہ باقی نہیں رہ گیا تھا اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت بھری ہوئی تھی۔ اُسے بار بار اپنے آدمی کا خیال ستا رہا تھا۔ کہیں وہ سچ مچ جالندھر پہنچتے ہی واپس نہ چل دیا ہو!

اگلی صبح اور زیادہ بھیانک خبریں لے کر آئی۔ دہلی میں کئی ہزار آدمی مار ڈالے گئے۔ دوسرے کئی شہروں میں بھی بلوے ہوئے ہیں بلوائی گاڑیوں اور بسوں میں سے چن چن کر سکھوں کو مار رہے ہیں وہ اسٹور کے اندر دُبکی پڑی ہوئی باہر کی آوازیں سن رہی ہے۔ پارک کے آس پاس کئی اسکوٹر اور موٹریں دھوں دھوں جل رہی ہیں۔ اچانک سرینواس کی بیٹی ببلی چیختی ہوئی اندر آئی۔

''ایک سردار جی کے گلے میں جلتا ہوا ٹائر ڈال دیا گیا ہے۔''

سکھونت اچانک اسٹور کی کنڈی کھول کر باہر نکل آئی بھاگتی ہوئی بالکنی میں پہنچی۔ بنا پگڑی کے کھلے ہوئے بالوں والا ایک سکھ گلے میں آگ کی مالا پہنے اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا تھا۔ اس کا چہرہ جل رہا تھا۔ اس کے کپڑے بھی آگ پکڑ چکے تھے لوگوں کا ہجوم اسے کہیں بھی رکنے نہیں دیتا تھا۔

"میرے آدمی کو بچاؤ! میرے سردار جی کو بچاؤ!" وہ چیختی ہوئی نیچے کود جانے پر آتارو ہو گئی۔ لیکن ارچنا اور اس کا پتی اسے فوراً گھسیٹ کر اندر لے گئے۔

پاگل ہو گئی کیا؟ وہ تمہارا ہسبنڈ نہیں ہے۔ دیکھا نہیں اس کا کد کتنا چھوٹا ہے۔ تمہارا اٹھلّر صاب تو بہوت لمبا اور ہینڈسم ہے!"

اچھا ہوا، شور میں تمہارا آواز نہیں سنا کسی نے۔ اب باہر مت آنا۔ نہیں تو ہمارے اوپر بڑا آفت آجائے گا بابا!"

انہوں نے اسٹور کو باہر سے بند کر دیا۔ بالکنی کی طرف کھلنے والے دروازے پر بھی کنڈی ڈال دی۔

"ہم سے نہیں دیکھا جاتا یہ سب! اِٹ اِز اِن ہیومن! اٹ از ہاریبل!!"

"لگتا ہے آدمی لوگ پاگل ہو گیا! بالکل جنگلی کے موافک!!"

جب ہم آجاد ہوا تھا۔ لاکھوں لوگاں کی جان ایسے ہی گیا تھا۔ پہلے انڈیا پاکستان، پھر پینسٹھ کا وار۔ اس کے باد بانگلا دیش۔ اب پنجاب کا ایک نیا اسٹرگل!"

"اور بھی تو بہوت بلوے ہوئے! روج ہی کہیں نہ کہیں پر جھگڑا فساد ہوتا ہے ہائے تروپتی بابا! ہم لوگاں کو شانتی کب ملے گا!"

"دیکھو ارچنا، تم نے ہسٹری نہیں پڑھا۔ جب انسان دھرتی پر آیا اسی سمے سے اس نے لڑنا بھی سیکھا سب سے پہلے دوسرے کے ہاتھ سے نوالا چھینا۔ تبھی، وہ ابھی تک نوالا ہی جھپٹ رہا ہے۔ چاہے اس کا نام بدل گیا۔ دھرم، جین، آئیڈیالوجی رنگ بھید، یہ سب ایک بہانہ ہے۔ ایک کہنے کی بات ہے دوسرے کا وہی روٹی کا ٹکڑا چھینا جا رہا ہے۔"

سکھونت اُن کی باتیں سنتی رہتی ہے۔ گھٹنوں پر سر ڈالے بیٹھی رہتی ہے۔ اپنے سر کے اوپر دونوں ہاتھ باندھے رہتی ہے۔ اب تک جتنے آدمی مارے جا چکے ہیں، ان میں اس کے آدمی جیسا تو پیار کرنے والا ایک نہ ہوگا۔ وہ اس کے لئے کتنا بھوکا اور دیوانہ تھا۔! وہ زچ ہو کر اس کے ہاتھ جھٹک جھٹک دیتی تھی۔ کبھی کبھی دانتوں سے کاٹ بھی لیتی تھی۔ وہ تب بھی تو باز نہیں آتا تھا۔ وہ ابھی تک لوٹا کیوں نہیں ہے پہلے ہی دن سے اس کے من میں یہ بات بیٹھ چکی ہے، وہ اب زندہ نہیں ہے۔

وہ — وہی تھا جو گلے میں آگ کی مالا پہنے بے تحاشا بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ ارچنا نے جھوٹ موٹ کہہ دیا تھا وہ دوسرا آدمی ہے۔ میں اُسے کیوں نہ بچا سکی! اس صدمے سے میں زندگی بھر نہیں نکل پاؤں گی!"

آج تیسرا دن ہے۔ اب تو ساری خبریں پرانی لگنے لگی ہیں۔ جو ہونا تھا، ہو چکا ہے۔ اب تو جگہ جگہ امن کمیٹیاں بنائی جا رہی ہیں۔ جلوس نکل رہے ہیں۔ نعرے گونج رہے ہیں۔ ہندو مسلم، سکھ عیسائی، آپس میں ہیں بھائی بھائی! امدادی کیمپ کھول دیے گئے ہیں۔ کمبل بانٹے جا رہے ہیں۔ اناج دیا جا رہا ہے۔ بیواؤں اور یتیموں کو معاوضہ مل رہا ہے۔ ان ہی کی تعداد زیادہ ہے۔ لوگ اپنے اپنے گھر لوٹ رہے ہیں۔ آج سکھونت بھی پڑوسیوں کا فلیٹ چھوڑ کر اپنے فلیٹ میں واپس آگئی ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کتنا کچھ لٹا ہے! کتنا کچھ بچا ہے؟

باہر کا دروازہ منہ پھاڑے ہوئے اُسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے اندر سہمے سہمے قدم دھرا ہے۔ پچکی ہوئی بالٹیاں اور ٹب، کڑاہیاں اور جگ، پرانے جوتے میں سے جھانکتا ہوا ایک چمچ۔ ربڑ پلانٹ، مارننگ گلوری، پام وغیرہ کے لوٹتے ہوئے گملے اور تیز ہوا سے ورق ورق ہو کر اڑتے ہوئے پرانے اخبار جو گیلری میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔

یہ ان کا بیڈ روم ہے۔ بستر اور پلنگ ادھ جلے پڑے ہیں۔ اسی پلنگ پر اس نے اپنے پتی کے ساتھ پہلی رات کا کبھی نہ بھولنے والا تجربہ کیا تھا۔ بے انت سنگھ نے اس کے سرخ گالوں کو وحشیوں کی طرح دانتوں سے کاٹ کاٹ لیا تھا۔ اگلی صبح وہ دوپٹے کے آنچل سے اپنی ساس سے اپنا چہرہ چھپائے چھپائے پھرتی رہی تھی۔

جس ریک میں اس کی پسند کی کتابیں سجی رہتی تھیں وہ فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ اے ٹیل آف ٹو سٹیز، ڈاکٹر ژواگو، گورکی، چیخوف، جھوٹا سچ، ہیر وارث شاہ، پیراڈائیز لاسٹ! ساری کتابیں یہاں وہاں کچلی ہوئی سی پڑی ہیں — جیسے کوئی انھیں نہایت بے دردی سے اپنے پاؤں کے نیچے روندتا رہا ہو۔

وہ کسی چیز کو بھی نہیں چھوتی۔ کسی چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی جیسے اس کی

خواہش ہی مر چکی ہو۔ وہ صرف دیکھتی ہے اور حیران بھی نہیں ہوتی۔ بالکل کھوئی کھوئی سی دوسرے کمرے میں جا نکلتی ہے۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی۔

'ہاں، یہ ہمارا ڈرائنگ روم ہی تو تھا۔ لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ چھوٹا سا خوبصورت قالین میرے لئے میری ماسی کینیڈا سے لے کر آئی تھی۔ صوفے ڈائننگ ٹیبل اور کرسیاں اور شوکیس، جو میرے بھائیوں نے مل کر تحفے کے طور پر دیے تھے اور وہ نرم نرم گدّے والا دیوان جس پر بیٹھ کر بے بے صبح شام پاٹھ کرتی تھی اور اس پر سوتی بھی تھی۔!

فرش پر بدھ کی مورتی ٹوٹی پڑی ہے۔ سر الگ، دھڑ الگ۔ اہنسا پر مو دھرما! مہا یان کے خلاف تیسری بڑی جنگ۔ جیسے اسی کمرے میں ہوئی ہو۔ بدھ مت کو کئی صدیوں کے بعد پھر سے اس کا کھویا ہوا وقار حاصل ہونے لگا تھا۔ لیکن اب بدھ یہاں کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس کی مورتیاں اسی دھرتی پر پہلے بھی تہس نہس کر کے اس کی تذلیل کی گئی تھی۔

اس کی نگاہ اچانک دیوار پر الٹی لٹکی ہوئی ایک فوٹو پر جا اٹکتی ہے۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کر دیتی ہے اور غور سے دیکھنے لگتی ہے۔ حیران بھی نظر آتی ہے۔ یہ دونوں چہرے کتنے جانے پہچانے لگتے ہیں! مسرور اور پر اعتماد ایک دوسرے کی طرف آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے اور مسکراتے ہوئے "سوہنیوں تکو گے کہ مار ہی چھڈو گے؟"

اپنے پیچھے آہٹ سن کر اسے یاد آجاتا ہے۔ ارچنا نے کہا تھا "تم چلو میں بھی آرہی ہوں۔ مل کر جھاڑو لگائیں گی۔ گھر بھر کو پھر سے چمکا دیں گی۔"

سکھونت فوٹو کی طرف اشارا کر کے کہتی ہے "ارچنا، دیکھو تو! میرے سردار جی میری طرف کتنی محبت سے دیکھ رہے ہیں!"

لیکن وہ کوئی جواب نہ پا کر گردن گھماتی ہے اور ہکّا بکّا رہ جاتی ہے۔

یہ تو کوئی اور ہے! ارچنا نے کس کو یہاں بھیج دیا؟ ایک طویل قامت، کلین شیو، بھرے بھرے جسم والا نوجوان! وہ اس قدر چپ چپ کیوں کھڑا ہے۔ اتنی خاموشی سے کیوں اسے تک رہا ہے؟ جس دن بے انت سنگھ بھلّر یہاں سے

جالندھر گیا تھا وہ بھی اسی طرح بے حد خاموش تھا کیا دو آدمیوں کی خاموشی ایک جیسی ہو سکتی ہے۔

اس کے دونوں بازوؤں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ ایک بازو گلے میں لٹکی ہوئی سلنگ میں پڑا جھول رہا ہے۔

وہ اسے گھورتی ہوئی اس کے پاس جاتی ہے۔ اس کے بالکل سامنے کھڑی ہو کر اُس کے رخساروں کے گڈھوں کو دیکھتی ہے۔ اور اچانک چلّا کر پوچھتی ہے۔

"یہ سب کیسے ہوا؟ تم نے کیوں ہونے دیا!"

وہ خامی اذیت سے پٹیوں میں لپٹا ہوا ایک بازو اٹھا کر اُس کے کندھے پر رکھ دیتا ہے۔

"اور کوئی طریقہ نہیں رہ گیا تھا بلیئے! تیری خیر خبر معلوم کرنے کے لئے زندہ رہ گیا۔ واہگورو کی یہی بڑی کرپا مانو۔"

لیکن اُسے یقین نہیں آتا۔ اس بازو میں وہ گرمی کیوں نہیں ہے؟ پہلے جیسا زور کیا ہوا؟ اُسے ٹھیک طرح سے پہچاننے کے لئے وہ پھر سے سر اٹھا کر دیکھتی ہے۔ سیدھے اس کی آنکھوں میں اور پھر اس کے ساتھ لپٹ کر رونے لگتی ہے۔

چت بولیاں تت پائیے سو بولیے پروان
پھکا بول وگچھنا، سن مورکھ انجان

चित बोलेंया तित पाईये सो बोलीये परवान
फिका बोल विगच्छना सुन मूर्ख अनजान।

गोपाल मित्तल

हर हाल में परहेज़ कर इस आदते-बद से
हर ऐब से है ऐब बुरा नख़्वते-गुफ़तार

ये: चीज़ बना देती है अहबाब को दुश्मन
हक़ में है मुहब्बत के ये: चलती हुई तलवार

अपना हो कि बेगान: हो दुश्मन हो कि हो दोस्त
हो जायेगा तल्ख़ी से ते री बात की बेज़ार

दुनिया में कोई भी ते रा हामी न: रहेगा
हो जायेंगे तुझ से सभी आमाद:-ए-पैकार

गुम्बद ही की मानिंद है ये: बज़्मे-जहां भी
होती है यहां अपने ही अल्फ़ाज़ की तकरार

जो कुछ भी कहेगा उसे सुनना भी पड़ेगा
इस बात को कर दिल से फ़रामोश न: ज़िनहार

लाज़िम है उन अल्फ़ाज़ के कहने से भी परहेज़
सुनने से जिन अल्फ़ाज़ के आती हो तुझे आर

होती है इसी चीज़ से तस्ख़ीर दिलों की
ऐ दोस्त बड़ी चीज़ है शीरीनी-ए-गुफ़तार

کال کرنتا اب کرے اب کرتا سوئے تال
پاچھے کچھ نہ ہوئے گا جب سر پر آوے کال

काल करतां अब करे अब करता सोय ताल,
पाछे कुछ न होयेगा जब सर पर आवे काल।

दौलते-वक़्त को न: कर बरबाद
देख ऐ माइले-तन-आसानी

है वुही काम-गार दुनिया में
जिसने इस शै की क़द्र पहचानी

फ़ुरसते-कार है यहां महदूद
देह्र में कब है इस की अरज़ानी

जो भी करना है आज ही कर ले
कल प: तकिय: है ऐन नादानी

कब किसी शै को है सबात यहां
देह्र फ़ानी है ज़िन्दगी फ़ानी

बज़्मे-इम्कां में मौत बर-हक़ है
एक दिन तो है वो: घड़ी आनी

तब न: काम आयेगी कोई तदबीर
होगी बेसूद गिरया-सामानी

क्या सबूत इस का कल वुही होगी
तुझे जो बात दिल में है ठानी

पेश जिस दम हो तेरी फ़र्दे-अमल
ये: न: हो तुझ को हो पशेमानी

کہانی: شرون کمار ورما

پندار کا صنم کدہ

مجھے کیا معلوم تھا کہ سینی ٹوریم میں کلپنا سے یوں اچانک ملاقات ہو جائے گی۔

میں اپنے ایک دوست سے ملنے وہاں گیا تھا۔ وارڈ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ گھومنے گیا ہے۔ میں اسی کی تلاش میں، قدرتی مناظر سے محظوظ ہوتا، چلا جا رہا تھا کہ ایک موڑ پر کلپنا دکھائی دے گئی۔ وہ براس کے سائے میں، بنچ پر بیٹھی، دور پہاڑوں کے اٹھتے، گرتے سلسلے کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے اُسے اس کے شال سے ہی پہچان لیا تھا۔ وہ شال میں ہی تو امرتسر سے اس کے لئے لے کر گیا تھا۔

میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ایک دو بار حیرت سے آنکھیں جھپکائیں، جیسے یقین نہ آرہا ہو، پھر مسکرا دی:

"ارے سریندر، تم! یہاں کہاں — خیریت تو ہے سب —!"

"بالکل خیریت ہے —" میں ہنسا۔ "میں تو خیر آج ہی آیا ہوں — لیکن تم — تم کب سے یہاں ہو —؟" میں نے غور سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ بیمار، پژمردہ سی نظر آرہی تھی۔

"زندگی میں کون سا موڑ کب، کسے، کہاں پہنچا دے، کہا نہیں جا سکتا، خیر چھوڑو یہ بتاؤ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں —؟" اس کے لہجے میں ہلکی سی مسرت کی جھلک نمایاں تھی۔ یہ احساس کہ وہ سرے سے بھلا نہیں دی گئی، اس کے زرد اترے سے چہرے کو خوشگوار تازگی اور رنگت دے گیا تھا۔

میں سچ بول کر اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا، اسے تنہائی اور اداسی کے اندھیروں میں نہیں گرانا چاہتا تھا۔ ہر وقت ہر جگہ سچ بولنا کوئی ایسا ضروری

بھی نہیں ہوتا۔ وہ اتنی بڑی دنیا میں بالکل اکیلی تھی اسے دُکھی کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے جھوٹ بولا۔

"دلی میں تمہارے آفس کے ایک کلرک نے بتایا تھا۔"

"ان لوگوں کو میں آج بھی یاد ہوں۔" اُس کی آنکھوں کے کونے بھیگ گئے تھے اس کے گلے میں شاید کچھ پھنس رہا تھا۔ ایک لمحہ کو چپ رہ کر، خود کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں نے ان لوگوں کے ساتھ شاید کبھی نرمی کا برتاؤ نہیں کیا بس افسر بنی رہی، ڈسپلن، کام، وقت کی پابندی، سختی اور خشک سارویہ۔"

"انھیں تمہاری بیماری کا بے حد افسوس ہے۔" میں نے ایک اور جھوٹ بولا۔

"دلی میں رونق تو خوب ہوگی۔؟" اس نے بنچ سے براس کا سُرخ پھول اُٹھالیا۔ اور کوٹلہ فیروز شاہ ـــ" وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔ اس کی آنکھوں سے گہری اُداسی جھانک رہی تھی۔

کوٹلہ فیروز شاہ کے تواریخی کھنڈرات اسے اچانک کیسے یاد آ گئے۔! مجھے کیوں یاد نہیں آئے۔ شاید مرد اور عورت کے مزاج کا یہی فرق آدمی کے وجود کو معنی عطا کرتا ہے۔

"ہاں، کئی بار گیا ہوں ـــ" میں جھوٹ کا سہارا لینے پر نہ جانے کیوں خود کو مجبور پا رہا تھا۔ "اکثر چلا جاتا ہوں۔ اشوکا پلر کو بانہوں میں لینے والوں کی بھیڑ ویسی ہی ہوتی ہے۔"

وہ پہاڑوں کے سلسلے پر نظریں ٹکائے تھی براس کا پھول اس کی گودی میں پڑا تھا۔ مجھے وہ سہ پہر یاد آگئی جب ہم وہاں گئے تھے اور بارش میں بھیگتے رہے تھے۔ کلپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھائے موسم کی پہلی بارش سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور میں اپنے سوٹ کو دیکھ دیکھ کر خود کو کوس رہا تھا کہ کیوں اس پاگل لڑکی کے ساتھ آگیا تھا۔ جب ہم بارش میں

شرابور ہو لئے تو وہ میرا ہاتھ تھام کر نیچے اُتر آئی اور ہم برآمدے میں بیٹھ کر پچھلی طرف، جلتی ہوئی سڑک کو دیکھنے لگے۔ دو لڑکے جو وہاں پڑھنے آئے تھے، اب بار بار ہمارے گرد چکر لگا رہے تھے۔ انہیں ایسا کرتے دیکھ کر، کلپنا نے ہنس کر کہا تھا۔

یہ سمجھتے ہیں ہم یہاں عشق کرنے آئے ہیں" اِم میچور

اور وہ اس بات کو دہرا کر دیر تک خوش ہوتی رہی تھی۔

میں ماضی کے جھروکے سے پلٹا۔ کلپنا کی نگاہیں پہاڑوں پر جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر یاس کے سائے گہرے ہو گئے تھے اور آنکھوں میں اُس پہلی بارش والے دن کا سماں تھا۔ میرا دل اس کے لئے اتھاہ ہمدردی سے بھر گیا۔ وہ دنیا سے الگ تھلگ، چپ چاپ، موت کے سرد تاریک راستے پر گامزن ہو گئی تھی۔ کسی دن خاموشی سے موت کے غار میں اتر جائے گی۔ شاید سینی ٹوریم سے باہر، کسی کو اس کی خبر بھی نہ ہو۔ نہ کوئی اس کی لاش پر آنسو بہانے والا ہو گا، نہ اس کی چتا کو آگ دکھانے والا۔ تو کیا اس کی روح بھی اسی طرح بھٹکتی رہے گی۔ سینی ٹوریم کے رجسٹر میں ایک نمبر کے آگے "مر گئی" لکھ دیا جائے گا۔ بس۔

گھر پر تو سب ٹھیک ہیں؟" وہ اس پہلی بارش سے، خود کو نکال کر بولی

"ہاں —"

میرا دوست سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ہمارے قریب آ گیا۔ کلپنا سے چند رسمی سی باتیں کرنے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے فوراً ہی اُسے یہ نہیں بتایا کہ میں اس سے ملنے آیا تھا۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ اس لئے ہم باتیں کرتے ہوئے سینی ٹوریم کی عمارت کی طرف چلنے لگے۔

اگلے موڑ پر کلپنا، دوسرے دن ملنے کا وعدہ کر کے، ہم سے جدا ہو گئی اور اُوپر جانے والے راستے پر دھیرے دھیرے چڑھنے لگی۔ کچھ دور جا کر وہ رُکی۔

پلٹ کر ہماری جانب دیکھا۔ شاید وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ یا چاہتی تھی کہ میں اسے آواز دوں گا۔ ہم آگے بڑھ گئے۔ کچھ دور جا کر میرے دوست نے بنا کسی تمہید کے پوچھا:

"تم کلپنا کو جانتے ہو؟"

"ہاں ۔۔۔ ایک عرصہ سے ۔۔۔ کیوں ۔ ؟"

"عجیب عورت ہے!" میرے دوست نے یوکلپٹس کی پتیوں سے جھانکتے چاند کی طرف دیکھ کر گمبھیرتا سے کہا ۔۔۔ "سینی ٹوریم میں بھی عشق فرما رہی ہیں محترمہ"

"کیا ۔۔۔ کیا فرما رہی ہیں ۔۔!"

"عشق ۔۔۔ ایک مصوّر سے ۔۔۔ وہاں بنچ پر بیٹھی یہ اسی کا انتظار کر رہی تھی وہ ہر شام اس سڑک پر سیر کیا کرتا ہے۔ آج وہ نہیں آیا تو اوپر اس کے کاٹیج پر گئی ہے۔ وہ اسے گھاس نہیں ڈالتا"

"نہیں ۔۔۔ کلپنا ایسی لڑکی نہیں ہے ۔۔۔" وہ مصور کون ہے۔

"وہ بھی ٹی۔ بی۔ کا مریض ہے۔ دن بھر تصویریں بناتا ہے۔ یہ اس کے پاس جا بیٹھتی ہے اور ضد کرتی ہے کہ اس کا بھی پورٹریٹ بنائے۔ وہ انکار کر چکا ہے۔ لیکن یہ نہ جانے کس ہڈی کی بنی ہے۔ ڈھٹائی سے وہاں پہنچ جاتی ہے وہ کئی بار اسے دیکھ کر اپنی کاٹیج کا دروازہ بند کر چکا ہے۔ یہ باہر گھنٹوں بیٹھی رہتی ہے۔

اپنے دوست کو وارڈ میں پہنچا کر میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں چلا آیا۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہیں آ رہی تھی میں نے سگریٹ سلگایا اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

ہوا میں خنکی آ گئی تھی۔ چاند یوکلپٹس کی ڈالیوں پر آ بیٹھا تھا چاروں طرف خاموشی تھی۔ سینی ٹوریم کی عمارت اندھیرے میں خاموش کھڑی تھی۔

ڈھلوانوں پر کاٹجوں کی ہلکی، زرد بتیاں اُداسی سے روشن تھیں۔ یہاں آکر رہنے والوں کو زندگی سے زیادہ موت کا یقین تھا۔۔۔ کلپنا بھی ان میں سے ایک تھی مجھے محسوس ہوا میں کلپنا کے پاس ہونا چاہتا ہوں۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہنا چاہتا ہوں۔ تم زندہ رہوگی، لیکن اس نے کہا تھا۔ مجھے یہ ہمدردی جتانے والے زہر لگتے ہیں۔

کلپنا، امرت سر میں ہمارے محلّے میں ہی رہا کرتی تھی۔ ہمارے اس کے گھر والوں سے گہرے مراسم تھے اور چونکہ وہ خاصی ذہین اور محنتی تھی، ماں مجھے اس کے پاس پڑھنے کے لئے بھیج دیا کرتی تھی۔ وہ دسویں کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی اور میں ساتویں جماعت میں تھا۔ وہ اپنے کمرے میں کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھی، میز پر ٹانگیں پھیلائے نہایت انہماک سے پڑھا کرتی۔ اُسے یہی لگن تھی کہ اسکول میں فرسٹ آئے۔ لیکن اس کی پوزیشن ہمیشہ دوسری یا تیسری رہتی۔ نتیجہ سن کر، بجائے خوش ہونے کے، وہ گھنٹوں روتی رہتی۔ استانیوں کو کوستی کہ انہوں نے اس کے جوابی پرچے توجّہ سے مارک نہیں کئے۔ رشتے اور تعلقات نبھانے کا الزام لگاتی۔ اس کا خیال تھا کہ یونیورسٹی میں ایسا نہیں ہوگا۔

میں کتاب کاپی لے کر دبے پاؤں اس کے کمرے میں داخل ہوتا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا اپنی مخصوص کرسی پر جا بیٹھتا۔ ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا کہ وہ ذرا سی غلطی پر پھٹکار دے گی۔ ہوسکتا ہے، سزا کے طور پر، تمام وقت کھڑا رکھے یا غصہ میں کمرے ہی سے نکال دے۔ وہ کتاب سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھتی اور تحکمانہ لہجے میں پوچھتی:

"ہوم ورک" کر لائے۔"

"ہاں" میں قدرے خوفزدہ سا کہتا۔

"پھر ہاں۔" وہ سختی سے کہتی

"جی۔"

"غلطی کرنے پر کیا کہا جاتا ہے۔"

"سوری میڈم۔"

"پہلے کیوں نہیں کہا۔"

"سوری"

وہ کاپی لے کر دیکھنے لگتی اور اغلاط پر سرخ پنسل سے نشان لگائے جاتی جن الفاظ کے ہجے غلط ہوتے۔ انھیں دس دس بار لکھنے کا حکم دیتی۔ کسی کسی دن وہ "فیئر یا گڈ" بھی لکھ دیا کرتی لیکن ایسا بہت کم ہوتا۔ کچھ نہیں تو وہ بدخطی کا نقص ڈھونڈ لیتی۔

کلپنا نے میٹرک ہائی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اخبار بازو میں لے کر وہ زار زار روئی کہ یونیورسٹی میں اس کی کوئی پوزیشن نہیں تھی۔ اس میں بھی اُسے یونیورسٹی والوں کی گہری سازش نظر آئی۔ کالج میں داخلہ لے کر وہ اور بھی زیادہ لگن اور محنت سے پڑھنے لگی۔

بی۔ اے کے بعد اس نے ایم اے میں داخلہ لے لیا اور اس کے لئے اسے شہر سے باہر جانا پڑا۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں ایک ایک کر کے بیاہی گئی تھیں، زیادہ دسویں کے بعد، کچھ بی۔ اے کے بعد۔ خود کلپنا کی ماں بھی زیادہ تعلیم کے خلاف تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کلپنا اپنے گھر کی ہو جائے، بچوں والی ہو۔ لیکن کلپنا بضد تھی کہ وہ ایم اے کرے گی۔ لیکچرار بنے گی۔ ریشماں جو اس سے ایک برس چھوٹی تھی، ابھی ایک خوبصورت بیٹے کی ماں تھی اور اس پہ قدرے مغرور بھی تھی کہ سسرال میں اس کا مان پہلے ہی بیٹے کی وجہ سے بڑھ گیا تھا۔ اسے اپنے بچے سے توتلی باتیں کرتے اور کھیلتے دیکھ کر کلپنا چڑ جاتی۔ اس نے ریشماں سے بات تک کرنا چھوڑ دیا۔

چھٹیوں میں جب وہ گھر آتی تو میں اس سے ملنے چلا جاتا کہ اب مجھ میں کسی

حاز تک خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔ وہ کالج کا کوئی قصہ لے بیٹھتی۔ کون سی لڑکی کس امیر لڑکے یا پروفیسر کے چکّر میں ہے۔ کون سا لیکچرار کس لڑکی کو لفٹ دے رہا ہے۔ اس کے بعد وہ قوم کے گرتے ہوئے اخلاق اور بدکرداری پر زوردار لیکچر جھاڑتی اور قدیم مشرقی کلچر کا حوالہ دے کر موجودہ حالات پر سخت نکتہ چینی کرتی اور تاریک مستقبل اور بے راہ روی کی پیشین گوئی کرتی۔ پھر وہ ان جھگڑوں کا تفصیلی ذکر کرتی، جو اس نے کالج اور ہوسٹل میں کئے تھے اور کامیاب ہوئی تھی۔ اکاؤنٹنٹ سے، کلرک سے، کسی پروفیسر یا پراکٹر سے کینٹین والے اور میس کے انچارج سے، کسی سر پھرے طالب علم سے، کیونکہ کے سر سے اس نے عشق کا بھوت منٹوں میں اتار دیا تھا۔

مجھے اس کی باتیں سن کر بہت مزا آتا تھا۔ خاموشی سے سنتا رہتا، اسے ٹوکنا، صلاح دینا یا کسی مسئلہ پر اختلاف رائے کرنا نہایت بور قسم کی بحث میں الجھنا تھا۔ جب تک اسے یہ احساس نہ ہو جاتا کہ اس کے مدِمقابل نے شکست تسلیم کر لی ہے وہ بحث کئے جاتی۔ بیچ میں اٹھ کر جانے والوں سے اُسے خدا واسطے کا بیر ہو جاتا تھا۔ بحث کے دوران وہ سنجیدگی اور منطق کی شدت سے قائل رہتی۔ اگر اسے ذرا سا بھی احساس ہو جاتا کہ مدِمقابل اسے ٹالنے یا خوش کرنے کے لئے ظاہرا طور پر اس کے دلائل کا قائل ہو گیا ہے تو وہ اس میں اپنی توہین سمجھتی اور لڑنے پر آمادہ ہو جاتی اُس کی ان عادات نے اسے لوگوں سے دور کر دیا تھا۔

جن دنوں وہ ایم اے کا امتحان دے رہی تھی اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ وہ آخری سنسکار تک نہیں پہنچ سکی۔ ہم سب حیران تھے۔ چوتھے کی رسم کے بعد وہ آخری پیپر دے کر آئی۔ میں تعزیت کے لئے گیا وہ اپنی مخصوص کرسی پر، آنکھیں موندے، بیٹھی تھی۔ آہٹ پر اس نے آنکھیں کھولیں۔

"آؤ سرینڈار"

میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا کہہ کر اظہار افسوس کروں

آخر میں نے کہا:۔

"تم انتم سنسکار کے سمے نہیں پہنچیں۔ لوگ ـــ"

"باتیں بنا رہے تھے۔ مجھے بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ یہی نا!" وہ متوازن لہجے میں کہنے لگی۔ "میں ارتھی کے ساتھ جا کر پتا جی کی زندگی واپس نہیں لا سکتی تھی۔ لڑکی ہونے کے ناطے مجھے ان کی چتا کو اگنی دکھانے کی اجازت بھی نہ دی جاتی اور میرا ایک سال بھی ضائع ہو جاتا۔ پتا جی کی موت کا دکھ مجھ سے زیادہ کسے ہو گا۔ وہی تو تھے جو میری پڑھائی کے حق میں تھے، تمام خرچ برداشت کر رہے تھے۔ میں بتا نہیں سکتی کہ ان کی موت میں میں نے کیا کھو دیا ہے کیا ٹوٹ گیا ہے میرے اندر۔ شاید بیٹے کو باپ کی موت پر اتنا غم نہیں ہوتا ہو گا۔ لیکن میں دکھ کی نمائش کرنے میں یقین نہیں رکھتی۔"

تھوڑی دیر بعد میں اٹھ کر چلا آیا۔

ایم اے۔ فرسٹ ڈویژن میں پاس کرتے ہی اسے ایک گرلز کالج میں ملازمت مل گئی اور وہ ماں کو لے کر امرتسر سے چلی گئی۔ کبھی کبھی اس کا مختصر اور کاروباری ساخط آ جاتا جس سے ہمیں اس کی اور چاچی (اس کی والدہ) کی خیر و عافیت سے آگاہی ہو جاتی۔ دھیرے دھیرے خطوط کا درمیانی وقفہ طویل ہوتا گیا۔ اب ایسا ہوتا کہ کبھی چھ سات ماہ بعد اس کا خط آ جاتا اور ہم رسمی سا جواب دے دیتے۔ ماں اکثر شکایتی لہجے میں کہتی۔

"کلپنا نے تو بالکل ہی ناطہ توڑ لیا۔"

"دُور جا کر ایسا ہی ہوتا ہے۔" پتا جی سمجھانے کے انداز میں کہتے۔ "ہماری، اُن کی کون سی رشتہ داری تھی۔"

"اس نے رشتہ داروں سے کون سی بنا کر رکھی ہے۔ سب ہی تو شکایت کرتے ہیں۔ ہر ایک سے تو جھگڑا کرتی ہے۔ اپنے سامنے اسے سب ہی گنوار

نظر آتے ہیں۔" ماں کے لہجے میں غصہ اور ناراضگی تھی ــــ "تبھی تو کہیں رشتہ نہیں ہوتا۔ آدمی کو اتنا گھمنڈ ٹھیک نہیں ــــ"

پھر کوئی اور موضوع شروع ہو جاتا اور ہم اسے بھول جاتے۔

میں جب ان کے مکان کے سامنے سے گزرتا تو میری نگاہیں خود بخود اس کھڑکی کی طرف اٹھ جاتیں، جہاں وہ بیٹھ کر پڑھا کرتی تھی۔ اب وہاں چق لگی رہتی مکان میں ایک پنڈت جی رہ رہے تھے اور دروازے پر ایک مرکھئی گائے بندھی ڈکراتی رہتی تھی۔

کوئی دو سال بعد کلپنا کا خط آیا جس میں اس نے چاچی کی اچانک موت کا ذکر کیا تھا۔ ماں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ "ارے مجھے اس کے پاس لے چلو، اکیلی رہ گئی بیچاری، میں نے گودی کھلایا ہے اُسے۔" پتاجی بھی دیر تک اُداس رہے۔ دھیرے دھیرے یہ دکھ کے سائے بھی نہیں رہے ماں کو اس بات کا غصہ تھا کہ کمبخت نے شادی کیوں نہیں کر لی۔ اب کیا کرے گی اتنی بڑی دنیا میں کسی سے بنا کر بھی تو نہیں رکھنی۔ ہم نے ماں کو سمجھایا کہ وہ تعلیم یافتہ ہے، کمار ہی ہے۔ عقل مند ہے۔ لیکن ماں، جو پرانے وچاروں کی ہے، کلپنا کو اس کے لئے معاف نہیں کر پا رہی تھی کہ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ شاید یہ بھی ہمدردی اور چاہت کا ایک رنگ تھا۔

میں نے گھر والوں کی طرف سے تعزیت کا تار دے دیا اور بات ختم ہو گئی۔

کچھ عرصہ ادھر اُدھر بھٹکنے کے بعد مجھے بھی دہلی کے ایک کالج میں ملازمت مل گئی اور میں دہلی چلا گیا۔ ایک شام میں کچھ تکان سی محسوس کر رہا تھا۔ میں سستانے کے خیال سے وینگرز میں جا بیٹھا۔ اچانک میری نظر کونے والی میز پر پڑی، وہاں نیم اُجالے میں ایک عورت اکیلی بیٹھی کوفی پی رہی تھی۔

اس نے جب چہرہ اٹھایا تو شناسا معلوم ہوا، لیکن اس کے بال باب کئے ہوئے تھے۔ باب ہیئر کی کسی لڑکی کو میں نہیں جانتا تھا اس لئے ادھر سے نظریں ہٹالیں۔ تھوڑی دیر بعد بیرا کوفی کے ساتھ ایک پرچہ بھی دے گیا۔ لکھا تھا۔ کلپنا۔۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ میں اپنی پیالی لئے اس کی میز پر چلا گیا۔

"ہیلو۔" وہ خوش نظر آ رہی تھی۔ "یہاں کیسے؟"

"نوکری مل گئی ہے ایک کالج میں۔"

"بہت اچھا ہوا۔ ملتے رہنا۔"

"اب تو تم خاصی فیشن ایبل اور ماڈرن ہو گئی ہو۔" میں نے اس کے بالوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔" وہ کھل کر ہنسی۔ "کویتا ئن۔ آئی مین پوئمز۔ لو پوئمز۔۔ میرے ایک کولیگ کی گھٹیا، عشقیہ شاعری سے اکتا کر۔۔ کچھ شاید اس لئے بھی کہ بڑے بالوں کا جنجال سنبھالا نہیں جاتا۔ دھونا، سکھانا، تیل ڈالنا، صاف رکھنا، اس بزی لائف میں یہ سب نہیں چلتا۔ اس طرح آسانی رہتی ہے۔ تم مرد بھی تو کٹواتے ہو۔"

میں گھبرا گیا کہ وہ بحث کے موڈ میں آ رہی ہے۔ اسی لئے جھٹ اس سے متفق ہو گیا۔

"یہ تو ہے۔ تم عشقیہ شاعری کی بات کر رہی تھیں۔"

"ارے ہاں۔۔" اس نے کوفی ختم کر کے، پھر سے آرڈر دے دیا۔ "ہندی کا ایک لیکچرار میرے بالوں پر عاشق ہو گیا تھا۔" اس نے اس طرح کہا، جیسے بتا رہی ہو۔۔ کار سروس کے لئے دی ہے۔ اس نے میرے بالوں پر کویتائیں لکھنا شروع کر دیں۔ ایک دن تو، اس نے حد کر دی۔ اپنی موٹی سی کاپی لے کر میرے فلیٹ پر آ دھمکا۔ پہلے تو ادھر ادھر کی باتیں کرتا۔ میرے

اکیلے پن پر ترس کھاتا رہا۔ میری اکیڈیمک کوالی فی کیشنز اور اینٹلی جنس کی تعریف کرتا رہا۔ آئی۔کیوٗ گنواتا رہا پھر کاپی کھول لی۔ ہر کوتیا بالوں کی تعریف میں لکھی گئی تھی۔ میں نے چپ چاپ ساڑھے چھ کوتیائیں سن لیں جو پوئٹری کم اور ہیئر آئل بنانے والی کمپنی کا اشتہار زیادہ تھیں۔ میں نے اُسے چائے پلائی اور ساتھ لے کر ایک بیوٹی پارلر میں گئی اور کٹنگ کرا کے بال اس کے حوالے کر دیئے اب وہ مجھ سے ناراض ہے۔ میرے خلاف من گھڑت، واہیات اور بے ہودہ کہانیاں پھیلا رہا ہے۔ خیر یہ سب تو ایسے معاملوں میں چلتا ہی ہے۔ تم سناؤ کیا حال ہے۔

میں کلپنا کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس شام ہم دیر تک وینگرز میں بیٹھے رہے میں نے محسوس کیا کہ ماں کی موت نے اسے ایک دم تنہائی میں دھکیل دیا تھا۔ وہ خوش رہنے کی کوشش میں رنجیدہ ہو ہو جاتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے تمام تر دکھوں کا ذمہ دار وہ ماحول تھا جس میں رہنے پر وہ مجبور تھی۔

"اگر اس طرح سوچا جائے تو ہر شخص قیدی اور مجبور ہے اور وہ ہر وقت حالات کو بہتر بنانے کے لئے ایک جنگ لڑ رہا ہے اور یہ لڑائی ہی اصل میں زندگی ہے، جو حوصلہ ہار دیتے ہیں، پسپا ہو کر بیٹھ رہتے ہیں جلدی ہی زندوں کی فہرست سے نکل جاتے ہیں۔ یوں بھی زندگی کوئی چیز نہیں، بنیادی چیز وہ حوصلہ ہے جو زندگی میں ہم پیدا کرتے ہیں۔"

"تم پیچوُر ہو رہے ہو" وہ مسکرائی۔

مجھے غصہ آگیا۔ یہ لڑکی خود کو سمجھتی کیا ہے۔ لیکن میں نے خود کو سنبھالے رکھا۔

اگر تم اپنی یہ نکتہ چینی، عیب جوئی اور طنز کرنے کی عادت ترک کر دو یا کم از کم اسے بے لگام نہ ہونے دو تو تمہیں ماحول، زندگی اور حالات سے اس

قدر شکایت نہ رہے۔ خود کو پہچاننے کی کوشش کرو، جو خامیاں اور برائیاں تمھیں دنیا والوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ انھیں خود میں دور کرنے کی کوشش کرو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تمھارا مطلب ہے، میں ہی بری ہوں۔" وہ تلخی سے بولی۔ "میں کسی سے کیا کہتی ہوں۔ میں نے اس پروفیسر کی بھینگی آنکھ، لمبی ناک یا کھردرے بالوں پر کویتا نہیں لکھی۔ میرے پاس اِن فضولیات کے لئے وقت بھی نہیں ہے، پھر اس نے ایسی بے ہودہ حرکت کیوں کی۔ کیا سمجھتا ہے وہ مجھے۔ کیا سوچ کر اپنی بکواس سنانے چلا آیا تھا۔" اس کا چہرہ غصہ سے تمتمانے لگا تھا۔ سانس تیز ہو گیا تھا۔ ذرا رک کر وہ کہنے لگی۔ "مجھے ان باتوں سے سخت نفرت ہے اور ایسے آدمیوں سے بھی جو بیکار میں دوسروں کے آنگنوں میں اپنے کچے جذبات کا کچرا پھینکتے رہتے ہیں۔ اس لئے میں نے کالج کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا ہے میں ایسے کمینے مردوں کے ساتھ کام کرنا اپنی توہین سمجھتی ہوں۔"

"استعفیٰ۔ یعنی تم نے نوکری چھوڑ دی۔!"

"ہاں وہ مینیجر کا بچہ سمجھتا تھا کہ میں اس کی ہر جائز و ناجائز مانوں گی۔ اس کا کوئی رشتہ دار ایم پی ہے اس لئے وہ ہر من مانی کر سکتا ہے دس جماعتیں پڑھ کر پیسے کے بل بوتے کالج چلا رہے ہیں۔ دوکانیں، کمینے جانور اور یہ حکومت لعنت ہے اس پر، کیا بھوشیہ ہے اس دیش کا، اس قوم کا۔ تم دیکھنا یہ ملک جلدی ہی تباہ ہو جائے گا۔ بیس ہزار کا غبن کیا ہے اس الو کے پٹھے نے اور چاہتا ہے میں اس کا ساتھ دوں۔ میں نے منسٹری آف ایجوکیشن میں اطلاع دی۔ الٹا مجھ سے EXPLANATION لنگا گیا۔ میں کہتی ہوں اچھا ہوا مہاتما گاندھی آزادی کے فوراً بعد ہی سورگباش ہو گئے، ورنہ آج اس حکومت کی کالی کرتوتیں دیکھ کر خود کشی کر لیتے۔ بھوک ہڑتال کر کے مر جاتے اور یہ کانگرس والے ایسے ڈھیٹ ہیں کہ اس مہاپرش کے نام کو EXPLOIT کر رہے ہیں، بیچ رہے ہیں

لعنت ہے۔"

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ بہت غصہ میں تھی۔ ہر بات، ہر شخص سے ناراض تھی۔ شاید کسی حد تک اس کی یہ ناراضگی حق بجانب ہی تھی۔ عام، شریف، پڑھے لکھے ہندوستانی کے ذہن میں آزادی کا کیا تصور تھا اور کرسی، طاقت اور دولت کے بھوکے ان نیتاؤں نے اُسے کیا دیا تھا بے پناہ مجبوری اور لاچاری کا احساس، بے ایمان اور کرپٹ حکومت، کمزور نظم وضبط اور ہر لحظہ غیر محفوظ ہونے کا شدید احساس۔

"یہ سب تو ہے۔" میں نے ماحول کی گھٹن اور تناؤ کم کرنے کے لئے کہا۔ اب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔؟

"آئی۔ اے۔ ایس۔ کی تیاری کر رہی ہوں۔" وہ ایک لمحہ چپ رہ کر بولی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس گھٹیا سرکار کی نوکری کرنا ہوگی، لیکن تب شاید پوزیشن تھوڑی مختلف ہو۔"

"چلو ہم بھی کہیں گے کہ ہماری ایک واقف آئی اے ایس ہے۔"

وہ مسکرادی۔

"شیخ چلی کی طرح محل کھڑا کرلیا۔

"تم ڈپٹی کمشنر بن لو پھر دیکھنا ہم کیا کرتے ہیں۔"

دیر تک ہم ڈپٹی کمشنروں، سکریٹریوں وغیرہ کا ذکر کرتے رہے جنھیں ضلع کی سطح تک کچھ میلوں ٹھیلوں کی رسم افتتاح کرنے کے سوا کچھ کام نہیں ہو تا زیادہ سے زیادہ بارسوخ سیاست دانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی تگ ودو میں لگے رہتے ہیں، رشوتیں، ترقیاں، جائداد، نوکریاں اور فائیو سٹار ہوٹلوں میں مفت کی دعوتیں، ولایتی شراب اور لڑکیاں۔

جب ہم کوفی پی کر، نیچے کناٹ پلیس کے برآمدے میں اترے تو کلپنا بضد ہوگئی کہ میں اس کے ساتھ چل کر اس کا فلیٹ دیکھوں۔ میں اس موڈ میں

نہیں تھا۔ وہ گھر پر بھی چار کے ساتھ شکایتیں کرتی رہے گی۔ جو دوست ہونے کے باوجود ہمارے دائرۂ اختیار سے باہر تھیں۔ میرے دو تین مرتبہ انکار کرنے پر وہ ناراضگی سے بولی:

"نہ جانے کیوں تم سے دو تین بار کہہ دیا کوئی اور ہوتا تو پاس تک نہ پھٹکنے دیتی۔"

"تم اتنی جلدی ناراض نہ ہو جایا کرو — بہت — SENSITIVE ہوتی جا رہی ہو۔"

"تم بات ہی ایسی کر رہے ہو۔"

"اچھا — چلو۔"

دو بسیں بدل کر ہم کلپنا کے فلیٹ پر پہنچے۔ وہ ایک صاف ستھری کھلی کالونی میں تھا اور نئی طرز کا بھی۔ اندر جا کر میں ایزی چیئر پر گر سا پڑا۔

"بہت تھک گئے ہو —؟"

"صبح کا نکلا ہوں۔"

"شام کو بھی گھر پہنچ گئے تو برا نہیں۔" وہ ہنس دی اور میرے سامنے بستر پر نیم دراز ہو گئی۔

کئی منٹ تک ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ مجھے ایک دم عجیب سا احساس ہوا کہ میں بیکار، ضائع ہو رہا ہوں۔ میں نے کرسی میں پہلو بدلا۔ کلپنا نے آنکھیں کھولیں میری طرف غور سے دیکھا۔ خود کو بستر پر بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا۔ پھر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایک میگزین اٹھا کر دیکھا، اٹھ کر کھڑکیوں کے پردے ہٹائے باہر شہر پر اترتی شام کو کھڑکی سے دیکھا اور وہیں سے بولی:۔

"روز ایسے ہی ہوتا ہے — ماں تھی تو — چائے بناؤں۔"

"نہیں رہنے دو — مجھے وہاں بیٹھے رہنے میں کوئی تک نظر نہیں آ رہی تھی۔

"چائے بنانے میں مجھے بھی کوئی آرام نہیں ملے گا اور میں بار بار پوچھنی بھی نہیں، ضرورت ہو تو بنائے دیتی ہوں۔" وہ کھڑکی سے ہٹ کر میرے قریب آگئی۔

اس کے تیور بگڑتے دیکھ کر میں نے چائے پینے کی حامی بھر لی۔ وہ کچن میں چلی گئی، چند لمحے چیزیں ادھر اُدھر رکھنے کی آوازیں آتی رہیں، پھر وہ خالی ہاتھ لوٹ آئی وہ شاید کچھ تلاش کر رہی تھی۔

"ماچس نہ جانے کہاں رکھ کر بھول گئی۔ میری میموری خراب ہونے لگی ہے۔ مجھے کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیئے۔ ماچس کہاں رکھی ہے۔"

"اس کمرے میں ماچس۔ ٹھہرو، میں بازار سے لے آتا ہوں۔"

"بیٹھو یاد آگیا، تکیے کے نیچے ہوگی، رات کان کھجانے کے لئے لائی تھی۔"

میں نے میز پر ٹانگیں پھیلا دیں اور آنکھیں موند کر سستانے لگا۔ پھر کلپنا کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ پچھواڑے کسی سے دودھ مانگ رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک پیالی چائے کے لئے وہ اس قدر پریشان ہو۔ میں کچن میں چلا گیا۔

"تم تو سو رہے تھے۔"

"چائے رہنے دو، پھر کبھی سہی۔"

"تو تم نے سن لیا۔ میں گھر میں دودھ کا ڈبہ رکھتی ہوں۔ سوچا شائد تم کنڈیشڈ ملک کی چار پینا پسند نہ کرو۔ مجھے تو عادت ہوگئی ہے۔ آج تو تمھیں بھی ڈبہ کے دودھ کی چار پینی پڑے گی۔ مسز رنگاناتھن کے ہاں بھی تازہ دودھ نہیں ہے۔"

میں خاموش ہوگیا وہ چار بنانے لگی اور میں اپنی جگہ پر آبیٹھا۔ میرا دماغ ادھر اُدھر بھٹک رہا تھا۔ مجھے بار بار یہ خیال ستا رہا تھا کہ میں کیوں۔ کلپنا کے ساتھ آگیا تھا۔ آخر یہ سب کیا تھا، کیوں تھا۔ وہ بھی شائد پریشان تھی اور میں بھی اکھڑا

اکھڑا سا۔ وہاں کرسی میں بیکار سا پڑا دیواروں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک کوارٹز وال کلاک، ایک کلنڈر، ایک پینٹنگ، بڑے شوخ رنگ، کسی بڑے مشہور فنکار کی نہیں کسی کمرشیل قسم کے آرٹسٹ کی بنائی ہوئی۔ پہاڑوں کا سلسلہ اونچے درختوں کا جنگل اور ایک کچا راستہ، میں اس پینٹنگ کو کلپنا کی شخصیت کے کسی نمایاں پہلو سے جوڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اس کے بیڈ روم میں ہوں شائد وہ مجھے غیر نہیں سمجھتی۔ غیر سمجھتی تو اس طرح ضد کر کے ساتھ لاتی ہی کیوں۔ میں نے اب اور بھی غور سے کمرے کو دیکھنا شروع کیا۔ پلنگ کے ساتھ سائڈ ٹیبل پر شرلک ہومز کے کارناموں کی موٹی سی جلد رکھی تھی۔ کپڑوں کی الماری کے اوپر لکڑی کے دو بیل آپس میں سینگ بھڑائے کھڑے تھے۔ لکھنے پڑھنے کی میز پر مختصر مگر ضروری سامان کے ساتھ ہی نیند آور دوا کی شیشی رکھی تھی۔ فرش پر ایک قیمتی سوٹ کیس رکھا تھا، لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے مالک کو اس کی قیمت یا ضرورت کا قطعی احساس نہیں ہے تھوڑا سا کھلا ہوا، کپڑوں کے کونے باہر لٹکے ہوئے، اوپر میلے کپڑوں کا ڈھیر۔۔۔ کلنڈر پر کیکٹس کی تصویر۔ سامان کی کمی کے سبب کمرہ بڑا بڑا سا لگ رہا تھا۔۔۔ ڈرائنگ روم کا بھی تقریباً یہی حال تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کلپنا ترتیب وصفائی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتی تھی۔۔۔ وہ تو ڈسپلن اور تنظیم کی قائل تھی۔ پھر۔۔۔! تین کمروں والے اس فلیٹ میں تنہا رہتے ہوئے کلپنا کو گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ بولائی پھرتی ہو گی کمروں میں۔

کلپنا دونوں ہاتھوں میں چائے کی پیالیاں لئے آئی اور مجھے پیالی تھماتے ہوئے بولی۔

"اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔!"

"تمہارا گھر"

"میرا گھر" وہ مسکرائی، اس مسکراہٹ میں گہرے دکھ کا رنگ شامل تھا

"گھر کہاں ہے، بس دن بھر کی تھکان لئے یہاں رات گزارنے آجاتی ہوں۔"

"سوچ رہا ہوں، اس تین کمروں والے فلیٹ میں تم اکیلی کیسے رہ لیتی ہو۔۔۔!"

"کیا کرسکتی ہوں۔"

"اپنی کسی کولیگ یا دوست کو ساتھ رکھ لیا ہوتا۔"

"تم ہی کرلو۔"

"میں۔۔۔!"

"ہاں تم۔ کیوں، کیا سوچنے لگے۔"

"کچھ نہیں۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

ہم چپ چاپ چائے سپ کرنے لگے۔ میں سوچ رہا تھا، کلپنا نے کیا سوچ کر مجھے یہ پیش کش کی تھی۔ کیا ہمارا سماج یہ سب برداشت کرے گا۔ اس نے بڑی آسانی سے کہہ دیا تھا۔ نتائج کے بارے میں شائد نہیں سوچا تھا۔ یہ کون جانتا ہے، یا جاننے کی کوشش کرے گا کہ وہ کبھی ہمارے محلے میں رہتی تھی، میری ٹیچر تھی اور ہمارے خاندانی مراسم بہت گہرے اور نزدیکی رہے ہیں شائد وہ لمحاتی جوش میں کہہ گئی تھی۔

"کھانا وغیرہ خود ہی پکاتی ہو یا نوکر۔۔۔"

"اکیلی جان، اتنا کھلجگن کون کرے۔ ماں تھی تو سب دیکھ بھال لیتی تھی۔ ماں کو یہ سب شوق تھے، وہ نہیں رہی تو۔۔۔" وہ اداس ہونے لگی تھی۔ "دوپہر کو کالج کی کینٹین سے تھوڑا بہت کھا پی لیتی تھی۔ رات کو واپسی پر ڈبل روٹی، مکھن انڈے لے آئی، جیم وغیرہ۔ پیٹ ہی تو بھرنا ہوتا ہے۔" وہ اس طرح یہ سب کہہ رہی تھی جیسے کسی اور کے بارے میں بتا رہی ہو، جیسے زندگی میں اُسے کوئی دلچسپی نہ ہو زندہ رہنا بوجھ ہو اُس پر۔

"یہ تم اچھا نہیں کر رہیں" میں نے ہمدردی سے کہا۔ "اور کچھ نہیں تو آدمی کو

اپنی صحت کا خیال تو رکھنا ہی چاہیئے، تم تو ان باتوں کے لئے بہت پرٹی کولر ہوا کرتی تھیں۔ اس طرح تو نہیں چلے گا۔ زندگی جینے کے لئے ہے کہ بوجھ سمجھ کر ڈھونے کے لئے۔ امرت سر میں تم ایسی نہیں تھیں، یہاں آکر کیا ہو گیا ہے۔ !"

"کبھی کبھی تو میں بھی ایسے ہی سوچتی ہوں" وہ سنجیدہ تھی۔ "سچ مچ مجھے کچھ ہو گیا ہے۔ کیا۔۔؟ یہی سمجھ میں نہیں آتا، بس کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کسی کام کے لئے گھر سے، میرا مطلب ہے فلیٹ سے نکلتی ہوں تو راستے میں ہی ارادہ بدل دیتی ہوں، فلم دیکھنے نکلی تو یونہی ہسٹاریکل مانیومنٹس میں وقت گزار آئی۔ کسی سے ملنے کا پروگرام بنا کر چلی تو کئی گھنٹے کسی ریستوراں میں کوفی پی پی کر گزار دیئے۔ آئی تھنک آئی ایم کِلنگ ٹائم۔ پچھلے دنوں میرے سر پر ایک بھوت سوار ہو گیا تھا۔ بنارس یا ہری دوار چلی جاؤں۔۔۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔"

"گئیں نہیں۔"

"نہیں گئی۔ یہ سوچ کر کہ وہ بھی تم مردوں کی دنیا ہے۔ تم نے عورت کے لئے کوئی محفوظ جگہ چھوڑی ہی نہیں۔ دراصل تم مرد لوگ بہت ظالم، خود غرض اور کمینے ہو۔ میری بات کا بُرا مت ماننا۔ میں جنرل بات کر رہی ہوں۔ تمہیں الزام نہیں دے رہی۔ کہیں کہیں کچھ مرد اچھے بھی ہیں۔"

"شکریہ یہیں ہنسا۔" سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جانے کی بات کر رہی تھیں، ابھی، میرے لہجے میں ہلکی سی کڑواہٹ آچلی تھی، شائد میرے اندر کا مرد کلپنا کے وار سے زخمی ہوا تھا۔ "ہے کیا جو چھوڑو گی ۔۔۔" زخمی مرد نے خطرناک وار کیا تھا پتہ چل گیا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ زیادتی ہو گئی۔

"ٹھیک کہتے ہو تم شائد" وہ گہرے دکھ اور اداسی سے بولی۔ "میرے پاس چھوڑنے یا رکھنے کو ہے ہی کیا۔ ماتا پتا تھے، سو کب کے مر چکے، بہن بھائی کوئی ہے نہیں سگا سمبندھی بھی نہیں، ایک اپنی جان ہے سو گھسیٹے پھرتی ہوں۔

اسی کو چھوڑ سکتی ہوں ـــ میرا اختیار تو آتم ہتیا تک ہے۔ کر لوں گی ایک دن۔" اس کی آواز بھیگنے لگی تھی۔ "مجھے تو کوئی رونے والا بھی نہیں، چھوڑ دیں بھی کتنی بیوقوف ہوں۔ تم تو ہمدردی جتا رہے تھے، سمجھا رہے تھے مجھے اور میں فضول بے معنی باتیں لے بیٹھی۔ ماں کے مرنے کے بعد ـــ" وہ خالی پیالیاں لے کر اندر چلی گئی۔

میں کمرے میں بیٹھا اس کے بارے میں سوچتا رہا مجھے اس کی زندگی اور کلنڈر والے کیکٹس کے پودے میں بہت حد تک مشابہت محسوس ہوئی۔ اپنی اپنی جگہ وہ تنہا تھے۔ کئی منٹ گزر گئے تو مجھے احساس ہوا کہ کلپنا کچن سے لوٹی نہیں تھی۔ میں گھبرا کر کچن کی طرف لپکا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی چند ثانئے میں اُسے دیکھتا رہا۔ عجیب سا دکھ میری آتما پر گرد کی طرح چھایا چلا جا رہا تھا میں نے اسے پکارا۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور رخساروں پر آنسوؤں نے لکیریں بنا دی تھیں۔

"کیا ہوا ـــ رونے کیوں لگیں۔"

"نہیں تو" وہ بہت اُداس تھی

"میری کسی بات سے دکھ پہنچا ہو تو شما کر دینا۔ میں تمھیں۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ـــ" اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی ـــ یونہی ماں باپ یاد آ گئے۔ تم چل کر بیٹھو، میں ابھی آئی۔"

میں پھر کمرے میں آ بیٹھا۔ چند منٹ بعد وہ منھ دھو کر آئی اور چپ چاپ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ باہر اندھیرا پھیل رہا تھا۔ سڑک کی بتیاں جل چکی تھیں کسی فلیٹ میں ریڈیو پر سہگل کا گیت گونج رہا تھا۔ دو نیتاں متوارے ـــ میں نے سوچا میں اس لڑکی کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ اس کی طرف دیکھا، وہ اندھیرے میں آنکھیں موندے، نہ جانے کس سوچ میں تھی۔ مجھے ایک دم احساس ہوا کہ اس پل میرا وجود وہاں بیکار تھا۔

"اچھا۔ میں چلتا ہوں اب۔"

"اچھا۔ ملتے رہنا۔"

"ہاں آؤں گا۔"

وہ آنکھیں موندے بیٹھی رہی۔ میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے فلیٹ سے نکلا، سیڑھیاں اترا۔ سڑک پر آیا تو لگا کندھوں سے بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔ کھلی فضا میں اپنے بارے میں سوچنے کے قابل ہوا تو میرے اندر سے کسی نے کہا۔ کس لئے جاؤ گے اس سے ملنے۔

میں نے خود کو مصروف کر لیا۔ ایک مدت تک اس سے نہیں ملا۔

اس اثنا میں اس نے آئی۔ اے۔ ایس کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ انٹرویو میں بھی کامیاب ہو گئی۔ ٹریننگ کے لئے مسوری چلی گئی اور پھر دہلی ہی میں ایک اچھے عہدے پر مامور ہو گئی۔

بہت دنوں کے بعد اس نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔ نہ ملنے کی شکایتیں کیں۔ میں نے کہا میں اس کے امتحان اور کیریئر میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس کا فون آجاتا اگر میرا پیریڈ خالی ہوتا تو وہ دیر تک فون پر باتیں کرتی رہتی چھٹی والے دن وہ خود آجاتی اور وہ سارا دن مجھے اس کے ساتھ گزارنا پڑتا۔ اسے اپنے لئے ٹوتھ برش یا تولیہ بھی لینا ہوتا تو مجھے ساتھ لے جاتی۔ اگر میں انکار کرتا یا بہانا بناتا تو منہ پھلا لیتی۔ بازار یا ریستوراں جہاں ہوتی لڑنے پر تیار ہو جاتی۔ میں اس کی جذباتی طبیعت سے ڈرتا تھا۔ ایک شام کھانے کے بل پر تکرار ہوئی۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر میں نے اسے بل ادا نہ کرنے دیا تو وہ اپنا سو کا نوٹ پھاڑ دے گی اور اس نے سچ مچ ایسا ہی کیا۔ اس روز سے میں سچ مچ اس سے ڈرنے لگا تھا۔

ایک سہ پہر ہم کناٹ پلیس میں مل گئے اور ٹہلتے ہوئے جنتر منتر کی گراؤنڈ میں جا بیٹھے۔ میں نے بات چلانے کی غرض سے کہا۔

"کلپنا، اپنی ٹریننگ اور کیریئر کے دوران تمھیں کسی نے متاثر تو کیا ہوگا؟"
میں نے اپنی بات کو جان بوجھ کر گول کر دیا تھا۔ زیادہ وضاحت سے پوچھنے پر وہ ناراض ہو سکتی تھی چاہتا میں یہ سننا تھا کہ اسے کوئی آئی۔اے۔ایس۔کیڈر کا نوجوان مل گیا ہے اور وہ جلدی ہی شادی کر لیں گے۔ میں دل سے بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ اپنی پسند کے کسی نوجوان سے شادی کر کے گھر بسا لے۔ اس کا اکیلا پن مجھے بھی اُداس کر دیتا تھا۔

"کیا مطلب؟" وہ تلخی سے بولی۔ "میں نے یہ راستہ کسی افسر سے متاثر ہونے کے لئے نہیں چنا۔ تم مجھے اتنا گرا ہوا سمجھتے ہو۔ تمھیں ساتھ لے آتی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں"

"ایک تو تم بات کو سمجھے بغیر بھڑک اٹھتی ہو — میں تمھاری عزت کرتا ہوں تم میری ٹیچر رہی ہو، میں تمھارے بارے میں کوئی غلط بات سوچ ہی نہیں سکتا۔"

"یہ تم مجھے کتنی بار کہو گے۔ میں نے کچھ دن تمھیں پڑھایا تو کیا ہو گیا، پھر کبھی مجھے ٹیچر مت کہنا — اور"

وہ اپنی بات بھول کر سامنے دیکھنے لگی جہاں ایک نوجوان جوڑا اپنے میں مگن بیٹھا مونگ پھلی چبا رہا تھا۔ لڑکے نے شاید گدگدی کی تھی کہ لڑکی کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"تم کچھ کہہ رہی تھیں۔"

"یہ لڑکی میرے دفتر میں سٹینو ہے اور یہ لڑکا اسے وہاں بھی ملنے آتا ہے۔ میں اسے پہلے بھی سمجھا چکی ہوں۔ اس کے Parents کو بلا کر —"

"کیوں — کیا یہ بھی تمھارے فرائضِ منصبی میں شامل ہے — ارے بھائی یہ کاسموپالیٹن شہر ہے۔ اس کی تہذیب تیزی سے بدل رہی ہے۔ پھر یہ لوگ بالغ ہیں، تم یا میں ان کے ذاتی معاملات میں دخل دینے والے

کون ہوتے ہیں۔ اپنا برا بھلا یہ خوب سمجھتے ہیں۔ پھر ہم پازیٹیو (Positive) ہو کر کیوں نہ سوچیں۔ یہ دونوں شادی کریں گے۔ ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے اس لئے خوش بھی رہیں گے۔ پھر وہ جہیز والی سمسیا بھی نہیں ہو گی۔ ہو سکتا ہے ان کے Parents ان سے متفق ہوں۔"

"دہلی آکر تمہاری سوچ بہت بدل گئی ہے۔"

ظاہر ہے، امرتسر اور دہلی کی زندگی، حالات اور ماحول میں فرق ہے۔ اگر تم کناٹ پلیس میں رہ کر، امرتسر کی گلیوں سے چمٹی ہوئی ہو تو بہت بڑی غلطی کر رہی ہو، بدلنا سیکھو۔"

"ایسا تو نہیں کہ تم دوہری زندگی جی رہے ہو۔ دہلی امرتسر۔ میرا خیال ہے کہ تم باتوں میں دلّی اور دل میں امرتسر کے ہو، نہیں تو۔"

"نہیں تو۔" میں اس گانٹھ کے کھلنے کا منتظر تھا لیکن وہ چپ رہی۔

وہ جوڑا چلا گیا تو جیسے کلپنا کو اور بھی جھنجھوڑ گیا۔

"مجھے تو یہ نوجوان بھلا نہیں معلوم ہوتا، یہ لڑکی بھولی بھالی ہے اور"

"تم بغیر کسی سے ملے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کیسے کر سکتی ہو۔ تم خواہ مخواہ خود کو ہلکان کر رہی ہو۔"

"تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ وہ میرے ماتحت کام کرتی ہے، اس طرح کسی حد تک نہیں بھی اس کی گارجیئن ہوں۔ اگر وہ غلط راہ پر جا رہی ہے تو اسے سمجھانا میرا فرض ہے۔ ماں کہا کرتی تھی۔"

"چلو کوفی پئیں۔" میں اس فضول موضوع کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔

کوفی پیتے ہوئے بھی وہ مردوں کی گندی ذہنیت، بھرشٹاچار اور عورت کی کمزوری اور وفا سے فائدہ اٹھانے پر لیکچر دیتی رہی۔ میں خاموشی سے سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ اب سنکی ہوتی جا رہی ہے۔

دس بارہ دن بعد اس کا فون آیا۔ وہ بھی پرنسپل نے سنا۔ کلپنا نے مجھے شام

کو اس کے فلیٹ پر پہنچنے کی تاکید کی تھی۔ بہت ضروری کام تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے اُٹھ رہے تھے۔ اچھے بُرے خیال آرہے تھے، ڈر لگ رہا تھا۔ اس شام وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی اس کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔

بیل کی تو اس نے دروازہ کھولا۔ چہرے سے بیمار تو نہیں، مگر سنجیدہ اور پژمردہ سی ضرور لگ رہی تھی۔ فلیٹ میں مکمل خاموشی تھی۔ میں چاہ کر بھی نہیں پوچھ پا رہا تھا کہ اس نے مجھے کیوں بلایا تھا۔ وہ تو بس حق سمجھ کر حکم دے دیا کرتی تھی۔ پوچھنے پر وہ کہہ سکتی تھی۔

"کیوں۔ بلا نہیں سکتی ہے — کیا ہو گیا اگر بلا لیا۔ یا، جی کیا بلا لیا۔ تمہیں کوئی تکلیف ہوئی ہو تو چلے جاؤ۔" پتہ نہیں میرے دل میں اُس کے لئے ایسا کون سا نرم کونہ تھا اور کیوں تھا، کہ میں اس کی بات ٹالتا نہیں تھا۔ شاید یہ کمپلکس کہ وہ میری ٹیچر تھی۔

اُس نے دروازہ بند کیا اور کرسی پر جا بیٹھی۔ گھٹنے پر گھٹنہ، اس پہ کہنی اور ہاتھ کے پیالے میں چہرہ — شام کے وقت کا سورج مکھی — وہ بھی خاموش تھی۔

پھر بیل ہوئی۔ کلپنا دروازہ کھولنے گئی۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی لڑکی کچھ پریشان سی تھی۔ چند منٹ ہم خاموش رہے۔ کلپنا نے لڑکی سے چائے کے لئے پوچھا۔ اس نے نرمی سے انکار کر دیا۔ میں اس تصویر کو، جو ہم تینوں سے اس کمرے میں بن گئی تھی معنی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم اس لڑکی کو پہچانتے ہو" کلپنا نے نپے تُلے انداز میں مجھ سے پوچھا۔ میرے نہیں کہنے سے پہلے ہی اس نے بتایا۔ "یہ ہیں مس مالتی بھٹناگر۔ میرے دفتر میں سٹینو۔ اُس روز پارک میں —"

میں کسی خطرہ کے اندیشہ سے، کرسی میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میرا پہلا اور فوری ردِ عمل یہ تھا کہ کلپنا نے اس لڑکی کو فلیٹ میں بلا کر غلطی ہی نہیں، بے وقوفی کی ہے

اب میں سوچ رہا تھا کہ اُس نے مجھے وہاں کیوں بلایا ہے۔ کیا اس لڑکی کے والدین کے سامنے مجھے بطور گواہ پیش کرے گی۔ کیا یہ محض پاگل پن نہیں ہے۔ وہ لڑکی بار بار کرسی میں پہلو بدل رہی تھی۔ شائد چاہ رہی تھی کہ بات جلد ختم ہو اور وہ وہاں سے نکلے۔ میں خود اس ڈرامہ سے پردہ اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔

"مالتی نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں تم سے عشق کر رہی ہوں۔"

میں نے چونک کر مالتی کی طرف دیکھا۔ میرے اندر ایک کھلنڈرا قہقہہ باہر آنے کو مچل اٹھا۔ میں نے دیکھ لیا کہ مالتی مسکراہٹ چھپانے کی بے سود کوشش کر رہی تھی۔ ادھر سے نظریں ہٹا کر میں نے کلپنا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر پتھریلا پن آچلا تھا، آنکھوں میں ٹھنڈے لوہے کی سی کیفیت تھی۔

"اس بے وقوف لڑکی کو بتاؤ کہ میرا تمھارا کیا رشتہ ہے" کلپنا نے انگریزی میں کہا۔

میں خود آج تک نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس رشتہ کو کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔ میرے ذہن میں کلپنا سے عشق کا خیال کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ میں لفظ نہیں ڈھونڈ پا رہا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر کلپنا تقریباً چیخ پڑی۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں عشق پر۔ اس جاہل لڑکی نے یہ سوچ کیسے لیا۔ ایسا گندہ اور نیچ خیال اس کے ذہن میں آیا کیسے۔ شرم نہیں آئی یہ الزام لگاتے ہوئے تم کیوں چپ ہو ۔۔۔ بولتے کیوں نہیں۔ میں تم سے عشق کر رہی ہوں۔ تمھارے ساتھ اگر جرابیں خریدنے چلی گئی ٹوتھ پیسٹ لے آئی تو یہ عشق ہو گیا۔ جوتے خریدے لئے تو محبت ہو گئی ۔۔۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم لوگ اتنے نیچ ہو، تمھاری سوچ اس قدر بیمار ہے۔ بتاؤ اسے کیا رشتہ ہے میرا تمھارا ۔۔۔ اور سن لو آج کے بعد مجھ سے ملنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ میں نے ہمیشہ سب کے جذبات کی عزت کی ہے اور لوگوں نے ہمیشہ مجھے دکھ پہنچایا ہے۔ کیا لگاڑا ہے میں نے تم سب کا۔

مجھے آرام سے جینے کیوں نہیں دیتے، میں کسی سے کچھ مانگتی تو نہیں — پھر وہ رو دی۔

"میڈم — آئی فیل سوری" مالتی نے نرمی سے کہا۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا میں نے تو اچھا سمجھ کر کہا تھا۔ آپ نے بھی تو مجھ پر یہی الزام لگایا تھا جب کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہماری منگنی ہو چکی ہے، کیا آپ نے مجھے اپنی غلط بات سے دکھ نہیں پہنچایا تھا۔ آپ میری افسر ہیں اس لئے — پھر بھی مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنی بات سے آپ کو تکلیف پہنچائی جبکہ میرا یہ مطلب بالکل نہیں تھا میں چاہتی تھی آپ سچائی کو سمجھیں فیل (FEEL) کریں۔"

کلپنا، دیکھو یہ معافی مانگ رہی ہے۔ اس کا مطلب تمھیں دکھ پہنچانا نہیں تھا۔"

"جاؤ، تم لوگ چلے جاؤ یہاں سے، میں برداشت نہیں کر پا رہی ہوں۔"

میں اور مالتی اسے دیکھے جا رہے تھے۔

"گیٹ لاسٹ" وہ چیخی

میں، مالتی کو لے کر باہر آ گیا۔ مالتی نے پھر کہا۔

"سر، میں نے تو یونہی — شائد مجھے میڈم کی بات بری لگی تھی، لیکن شائد مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیئے تھا۔"

"تم پریشان نہ ہو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ وہ وقتی طور پر ہل گئی ہے — ہمارے تعلقات صرف اور صرف دوستی کے ہیں۔ وہ میرے شہر، میرے محلے کی ہے، مجھے پڑھاتی بھی رہی ہے۔ دل کی بری نہیں، بس کبھی کبھی بہت زیادہ جذباتی ہو جاتی ہے۔"

"آپ کہیں تو میں دفتر سے کچھ دن کی چھٹی لے لوں۔ میرا مطلب ہے مجھے دیکھ کر وہ پھر بھڑک سکتی ہیں"

"ارے نہیں —" میں ہنسا۔ "دیکھنا وہ سب کچھ بھول جائے گی۔ تمھیں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچائے گی۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ دراصل وہ کسی کا برا کرنا تو کیا، سوچ بھی

نہیں سکتی۔ تم دفتر جاؤ۔"

باتیں کرتے ہم بس سٹاپ تک آ گئے تھے۔ مالتی کی بس آ گئی۔ اسے الوداع کہہ کر میں لوٹ آیا۔

کلپنا اسی طرح بیٹھی رو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ مجھے ایک بے سہارا، معصوم، پیاری سی بچی لگ رہی تھی۔

"اب اُٹھ کر ہاتھ منہ دھو لو۔"

"تم جاؤ کل کو پڑوسی بھی باتیں بنانے لگیں گے۔"

"اتنی ڈرپوک کب سے ہو گئیں تم۔ چلو ہاتھ منہ دھو کر چاۓ پلاؤ۔ ڈبے کے دودھ والی۔ پھر میں چلا جاؤں گا۔"

"تم چاہتے ہو میں بدنام ہو جاؤں۔"

"بے وجہ ڈر رہی ہو تم۔"

"تم مرد ہو۔ اور یہ مردوں کی دنیا ہے۔ مجھے مالتی کی بات سننے کے بعد ڈر لگنے لگا ہے۔ تمھیں کیا معلوم، میں نے آج تک دنیا سے کیسے مقابلہ کیا ہے۔ کیا کیا باتیں نہیں سنی ہیں۔ اب مجھ میں طاقت نہیں رہی۔ میں یہاں سے بھی چلی جاؤں گی کسی پہاڑی گاؤں میں جا رہوں گی۔"

"وہاں تو صرف چڑیاں، کبوتر ہی ہوں گے۔ شکست قبول کر لینا سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس کے بعد تم خود سے بھی بھاگنے لگو گی اور وہ بہت خطرناک سٹیج ہو گی۔"

"کیا کروں میں ___" وہ پھپھک کر رو دی۔ "میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا ___"

میں نے اسے بازو سے اٹھایا اور باتھ روم میں لے گیا۔ وہ واش بیسن کے سامنے اڑیل بچے کی طرح کھڑی ہو کر بولی۔

"چھوڑ دو مجھے، دھولوں گی جب جی چاہے گا۔"

"چلو دھوؤ جلدی سے، بچی نہ بنو، میں خود ۔"

اس نے پلکیں جھپکا کر میری طرف دیکھا اور چپ چاپ منہ دھونے لگی۔ جب وہ تولیے سے چہرہ خشک کر چکی تو میں نے کہا

"اب میں چلتا ہوں۔"

"چلتا ہوں! ابھی تو چائے کے لئے کہہ رہے تھے۔"

"نہیں۔"

"نہیں کیا۔ پینی پڑے گی۔ مذاق ہے کیا۔ میرا ہاتھ منہ کیوں دھلوایا زبردستی۔" وہ معصومیت سے بولی۔ "کمرے میں بیٹھو، میں لاتی ہوں بنا کر۔" پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "باہر سے تم کھسک جاؤ گے، کچن میں میرے پاس بیٹھو۔"

میں اس کے ساتھ کچن میں جا بیٹھا۔

"چائے کے ساتھ کھانے کو کچھ نہیں ہوگا۔ آج تو گزارا کر لو۔ پھر کسی دن چل کر بازار سے سودا سلف لے آئیں گے کبھی پکوڑے، کبھی بسکٹ۔ دالیں، مرچ مسالے اور دوسرا سامان بھی لے آئیں گے۔ تمھاری بات ٹھیک ہی ہے۔ گھر پر ہی کھانا بنایا کروں گی۔" وہ الماری سے دودھ کا ڈبہ نکال لائی۔ کل سے تازہ دودھ لے لیا کروں گی، پارک کے سرے پر تو ملک بوتھ ہے۔"

"تم نے سب سیٹ کر دیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"تم یہاں آجاؤ تو سب ٹھیک ہو جائے۔ اکیلی رہ کر میں بڑی آلسن ہو گئی ہوں۔ بس ہر کام کل پر ٹال جاتی ہوں اور وہ کل کبھی نہیں آتی۔ مجھ سے تو کوئی زبردستی کام لے۔"

"ابھی تو تم مجھے نکال رہی تھیں۔"

"کبھی کبھی مجھے لوگوں کی بے ہودہ باتوں پر غصہ آجاتا ہے۔ تم میری باتوں کا برا مت مانا کرو۔"

میں ہنستا رہا۔
اس دن میں رات دیر گئے وہاں سے آیا۔ چلنے لگتا تو وہ زبردستی روک لیتی اور گھر کے سامان کا چرچا لے بیٹھتی، دیسی صابن، سرسوں کا تیل، ویجی ٹیبل گھی، پتہ نہیں ان چیزوں میں ایک دم اُسے اتنی دلچسپی کیوں ہو گئی تھی۔ وہ ان چیزوں سے گھر بھر لینا چاہتی تھی۔
میں نے پنجاب یونیورسٹی میں لیکچرر شپ کے لئے درخواست دے رکھی تھی۔ مجھے انٹرویو کے لئے بلایا گیا اور میں چن لیا گیا۔ ایک ہفتہ کے اندر مجھے اپنا عہدہ سنبھالنے کے لئے چنڈی گڑھ پہنچنا تھا جس وقت میں کلپنا کو یہ خوشخبری سنانے گیا، وہ بستر پر نیم دراز ان تمام اشیاء کی فہرست تیار کر رہی تھی۔ جو ہمیں اکٹھے خریدنا تھیں۔
"فہرست تیار ہو گئی" ۔ میں نے پوچھا۔
"ہو تو گئی۔ تم بھی سن لو، کوئی چیز رہ گئی ہو تو بتا دینا" وہ فہرست پڑھ کر سنانے لگی ۔
"یہ تو ٹھیک ہے لیکن تم سامان جلدی خرید لو"
"کیوں"
"سنیچر تک مجھے چنڈی گڑھ پہنچنا ہے، یونیورسٹی میں سروس مل گئی ہے"
وہ ایک دم بجھ سی گئی، جیسے اسے میری کامیابی سے خوشی نہ ہوئی ہو۔ فہرست والا کاغذ، میز پر ٹائم پیس کے نیچے رکھ کر چت لیٹ گئی اور چھت کو دیکھنے لگی۔
"مبارک باد نہیں دو گی"
"اوہ — سوری، بہت بہت مبارک ہو"
"آؤ، بازار چلیں۔ تمھیں مٹھائی کھلاؤں گا۔ نیرولا، آئس کریم"
"اس وقت تو میں بہت تھکی ہوئی ہوں، پھر کبھی سہی"
"تم تو آج چلنے کے لئے کہہ رہی تھیں، یہ تو اتفاق ہے"
"اب مجھے کیا معلوم تھا کہ مبہ ے سرمہ [illegible] رنے لگے گا" اس کے لہجے میں

روکھاپن تھا۔

میں نے اُسے مجبور کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس شام اس نے چائے کے لئے بھی نہیں پوچھا۔ میں کوئی بات کرتا تو ہوں ہاں، کر کے ٹال دیتی۔ میں بور ہوکر آگیا۔

دہلی سے آنے سے پہلے میں اُسے ملنے اس کے دفتر گیا۔ وہ اس وقت ایک کلرک کو ڈانٹ رہی تھی۔ جب وہ فائل لے کر چلا گیا تو میں نے کہا۔

"میں رات کی گاڑی سے جارہا ہوں۔"

"اچھا ہیپی جرنی۔"

اس لفظ ہیپی، میں ذرا سی بھی خوشی نہیں تھی بس ایک لفظ میری طرف اُچھال دیا تھا۔ میرا خیال تھا وہ گاڑی کا وقت دریافت کرے گی۔ میرے ساتھ اسٹیشن تک آئے گی۔ رات کا کھانا ہم اکھٹے کھائیں گے۔ میں اس سے چنڈی گڑھ اور وہ مجھے دلی آتے رہنے کے لئے کہے گی، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔

"میرے پاس کچھ پینٹنگز، کچھ فرنیچر ہے کہو تو تمھارے ہاں۔"

"نہیں۔ میں کیا کروں گی۔" وہ انٹرکوم پر کسی سے گفتگو کرنے لگی۔

اٹھ کر آتے ہوئے میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور ایک بات جو میں نے اتنے عرصے محسوس نہیں کی تھی، ایک دم میری نظروں کے سامنے آگئی۔ اس نے بال بڑھانے شروع کر دیئے تھے مجھے یاد آیا میں نے ایک شام کہا تھا۔ "یہ کٹے بال تمھیں اچھے نہیں لگتے۔"

چنڈی گڑھ پہنچ کر میں نے اسے خط لکھا۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ کچھ ماہ بعد میں نے پھر لکھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر میں نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

اور آج پانچ سال بعد وہ اچانک سینی ٹوریم میں مل گئی تھی۔ مجھے اس کی بیماری کا جان کر بہت دکھ ہوا تھا اور جو کچھ، میرے دوست نے، اس کے اور اس مصور کے بارے میں، بتایا تھا، سن کر حیرت ہوئی تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ

کلپنا خود کو اس نچلی سطح تک بھی لا سکتی تھی وہ مغرور، سنجیدہ، سنکی کم گو قسم کی لڑکی تھی۔ سمجھوتہ کرنا یا جھکنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

چاند مغرب کی طرف جھک گیا تھا اور چیل کے جنگل میں چڑیاں چہکنے لگی تھیں، پہاڑی کوئے بستی کی طرف جا رہے تھے۔ میری پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں بستر پر جا لیٹا اور دوپہر تک سویا رہا۔ سہ پہر کو نہا کر سینی ٹوریم کی طرف چل دیا۔ میں کلپنا سے مل کر اس مصور کے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔

وہ مجھے چیل کے جنگل کو جاتے ہوئے راستے پر مل گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی جو وہ اسپتال کے ایک ملازم کو دکھا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف آئی اور تصویر دکھا کر بولی:۔

"یہ دیکھو وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ وہ سچ مچ مجھ سے پیار کرتا تھا۔"

میں نے حیرت سے اُسے دیکھتے ہوئے، تصویر اس کے ہاتھ سے لے لی۔ وہ اسی کا پورٹریٹ تھا۔ آئل کلر میں۔ تصویر میں وہ سولہ سترہ برس کی ــــ خوبصورت شوخ لڑکی تھی اور اس کے لبوں پر مونا لزا والی مسکراہٹ تھی۔ میں نے دوبارہ کلپنا کی طرف دیکھا۔ خوشی سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک مرطوب چمک تھی۔

"میں جانتی تھی وہ مجھ سے محبت کرتا ہے" اس نے کہا اور میرے ہاتھ سے تصویر لے کر اسپتال کے کوارٹرز کی طرف چلی گئی۔

میں نے دیکھا سامنے سے ایک ڈاکٹر چلا آ رہا تھا۔

"Doctor. He loved me - See! He loved me"

ڈاکٹر کو تصویر دکھا کر وہ نرس کی طرف گئی، پھر وارڈ میں چلی گئی۔

میں ڈاکٹر کی طرف چلا گیا۔ میرا دوست بھی آ گیا تھا۔

کل رات احمد آرٹسٹ مر گیا" ڈاکٹر نے بتایا" اس کے ایزل پر یہ تصویر تھی اور ایک خط جس میں لکھا تھا کہ وہ تصویر مس کلپنا شرما

کو دے دی جائے ۔"
اندر سے کلپنا کی آواز سنائی دے رہی تھی۔
" ہی لوڈ می۔ ہی لوڈ می ــ"

شرون کمار ورما

شیخ صبوری باہرا کی حج کعبے جائے
جا کا من ثابت نہیں وا کو کہاں خدائے

शेख़ सबूरी बाहिरा की हज काबे जाए,
जा का मन साबत नहीं वा को कहां ख़ुदाए।

गोपाल मित्तल

निकले हैं शेख़-ो-ब्रह्मण ढूंढने अल्हा को,
एक हज को, यात्रा को दूसरा तैयार है,
एक को आठों पहर रहता है काबे का ख़याल,
दूसरे पर हर घड़ी काशी की धुन असवार है,
उस का येः दावा फ़क़त काबे में है नूरे-ख़ुदा,
इस का येः कहना कि वोः काशी में जलवा बार है,
आह, येः नादान इनसां किस क़दर गुम-राह है
और इसी बाईस से इनमें बाहमी तकरार है,
इनके सीनों में नहीं सिदक़-ो-सफ़ा का कुछ गुज़र
एक है गिरगट सिफ़त इक मिसले बूती-मार है।
इनकी आंखें नूरे-हक़ को देख सकती ही नहीं
इनके दिल में लोभ कोप और कपट का अंधकार है।
जब तक इन तारीकियों से क़ल्बे-इनसां हो नः पाक
देखना उस पाक हस्ती का बहुत दुशवार है।
काश आ जाए मयस्सर इनको चशमे-हक़-निगर
काश येः समझें कि दिल ही मम्बा-ए-अनवार है।
हां यही दिल है जो मसकन है ख़ुदा की ज़ात का
है यही काबः यही काशी यही हरिद्वार है।
आदमी का फ़र्ज़ है इस घर को रक्खे पाक साफ़
वरनः हज बेसूद है और यात्रा बेकार है।

निंदा करे सो हमरा मीत
निंदक मानीये हमरा चीत।
निंदा हमरी प्रेम-प्यार
निंदा हमरा करे उद्धार।

نندا کرے سو ہمرا میت
نندک مانیے ہمارا چیت
نندا ہمری پریم پیار
نندا ہمرا کرے اُودّھار

मेरे ऐब-जू तेरा मशकूर हूं मैं
मुझे तुझ से कोई भी शिकवः नहीं है।
नुक़ायस पः मेरे नज़र है जो तेरी
तो मोहसिन मेरा कोई तुझ सा नहीं है।
तेरी नुक्ता-चीनी का ममनून हूं मैं
शिकायत मुझे तुझ से असला नहीं है
मैं झूठी ख़ुशामद का साइल नहीं हूं
मैं हरगिज़ बनावट का क़ाइल नहीं हूं

बशर अपने ऐबों से आगाह हो, गर
तो पैदा है इसलाह का इस की इमका

वगरना ख़ुदी घेर लेती है दिल को
येः आज़ार वोः है नहीं जिस का दरमां
इस आज़ार से तू बचाता है मुझ को
मेरे ऐब को मुझ पः कर के नुमायां
इनायत है मुझ पर बहुत तेरी ऐ दोस्त
तू दरपै है इसलाह की मेरी ऐ दोस्त

ظفر پیامی

کم، دی، گل

نئے روم میں پرانی عمارتوں کو دکھانے والا گائیڈ کہہ رہا تھا ـــــ

"یہ کولیسیم ہے۔ چاروں طرف جو بے شمار سیڑھیاں آپ دیکھ رہے ہیں وہاں پرانے روم کے آزاد شہری بیٹھتے تھے۔ بیچ میں سیزر کا باکس تھا اور اس پاس امیروں اور وزیروں کے۔ عین بیچ میں جو میدان ہے، وہاں کھیل ہوتے تھے۔ جانوروں کے جانوروں سے مقابلے، بھوکے شیروں کی شرابی ہاتھیوں سے لڑائیاں۔ ایمپھی تھیٹر بیلوں سے مقابلے، پھر جانوروں اور انسانوں کے مقابلے، انسان جنگلی بیلوں کے ساتھ ٹکراتے۔ انعام میں موت، یا من چاہی سندری پاتے۔

"یہاں سب سے بڑا کھیل ہوتا تھا گلیڈیئیٹرز کا۔ گلیڈیئیٹر جانور نہیں، انسان ہوتے تھے۔ افریقہ اور ایشیا سے لائے ہوئے غلام۔ مضبوط ترین جسم اور لمبے سے لمبے قد والے غلاموں کو ہی گلیڈیئیٹرز بنایا جاتا تھا۔ انہیں انتہائی طاقتور بنانے پر خاص معالج اور نگراں مامور ہوتے۔ انہیں ہر طرح کے ہتھیاروں کے استعمال کے ہنر سکھائے جاتے۔

"پھر ایک دن بہترین شراب پلا کر اور من پسند خوراک کھلا کر انہیں مقابلہ میں اتارا جاتا۔ کسی جانور کے سامنے نہیں بلکہ اپنے ہی ایسے گلیڈیئیٹر کے مقابلے میں۔ بعض مرتبہ تو بھائیوں کے درمیان ہی مقابلہ ہو جاتا اور خوب ڈٹ کر ہوتا۔

"آپ کیا پوچھ رہی ہیں مائی سویٹ میموزل؟ وہ کیوں لڑتے تھے؟ ـــــ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ وہ لڑتے تھے کہ لڑنا ہی ان کی تقدیر تھی۔ وہ غلام تھے۔

"کوئی بھی گلیڈیئیٹر اپنے حریف کے سامنے نہ رحم کی التجا کر سکتا تھا اور نہ بزدلی کا مظاہرہ۔ سب سے بڑی سزا اس گلیڈیئیٹر کے لیے ہوتی جو اپنے مخالف کو مارے بغیر چھوڑ دیتا

اسے بھوکے شیروں کے سامنے ڈال دیا جاتا۔ تماشائیوں کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ہڈیاں اور بوٹیاں غائب ہو جاتیں۔ کوئی بھی گلیڈی ایٹر دوسرے گلیڈی ایٹر کو نہیں بخشتا تھا خواہ وہ اس کا ماں جایا ہی کیوں نہ ہو۔ کوشش ہوتی تھی کہ مقابلے میں نئے سے نئے ہتھیار استعمال کئے جائیں۔ جیسے ہی کوئی نیا ہتھیار ایجاد ہوتا۔ گلیڈی ایٹروں کا بہت بڑا مقابلہ منعقد ہو جاتا۔ عظیم سلطنتِ روم کے فوجی جرنیل اسی طرح نئے ہتھیاروں کی کارکردگی آزماتے تھے۔ مقابلے ہوتے برچھوں سے، بھالوں سے، تیروں سے، تلواروں سے، خنجروں سے، گرزوں سے، کلہاڑوں سے، لوہے کے تاروں والے جال سے، جن میں ایک نہ ایک گلیڈی ایٹر پھنس جاتا اور دوسرا اسے ہتھوڑے سے مار کر ختم کر دیتا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا، مرنے والا جس قدر شور مچاتا، ہاؤ ہو کرتا۔ دیکھنے والے اتنی ہی داد دیتے کہ یہی دستور تھا پرانے وقتوں کا۔ سچ پوچھو تو وہ لوگ نیم وحشی تھے۔"

دیو مالائی ہیبت کے برف کے تودے کے قریب ایک کیمپ بیڈ میں لیٹے لیٹے وہاں تعینات ٹولی کے کمانڈر نے ایک بار پھر سونے کی کوشش کی۔ مگر کوشش کے باوجود نہ تو وہ سو سکتا تھا اور نہ ان کے بارے میں سوچ سکتا تھا جن کے پاؤں ان کے بوٹوں سمیت برف کی دل دل کی نذر ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے ماتحت افسر کے چہرے کی طرف سے بھی گویا نظریں پھیر لیں۔ جس کی آنکھوں کی روشنی برف کے پُل پر اترتی ہوئی سورج کی کرنوں میں تحلیل ہو کر رہ گئی تھیں۔ بینائی کے بغیر آنکھیں۔ پنجوں کے بغیر ٹانگیں، انگلیوں کے بغیر ہاتھ اور سوچ سے خالی ذہن۔ انسان خواہ فوجی کمانڈر ہی کیوں نہ ہو کس کس کے بارے میں سوچے کہ یہ سب روز کا معمول تھا۔

کمانڈر کو ابھی چند سال پہلے کے وہ دن بھی یاد تھے جب یہاں سے بہت نیچے دھرتی کو لہو سے سیراب کر کے لڑائی کے دیوتا نے سروں کی فصل بوئی تھی۔ پھر جب سورج ہزاروں بار اندھیری رات کی گود میں سو چکا اور ہزاروں بار دھرتی کی کوکھ سے طلوع ہو چکا اور جب چاند ان گنت اماوسوں سے ان گنت پورنیماؤں کا روپ دھار چکا، تب آسمان کے رنگ کے ساتھ زمین کا رنگ بھی بدلنے لگا۔ شاخوں پر پھر پھل دکھائی دینے لگے۔ پھولوں کی پتیاں ایک ایک کر کے گر چکی تھیں۔ پھول اور پھل کے درمیان کی

منزل گذر چکی تھی۔ ننھے ننھے پھل پودوں کی شاخوں پر آ رہے تھے۔

کئی سال تک کھیتوں اور باغوں میں بھرپور فصل ہوئی۔ جو کھیت کبھی گدھوں کی آرام گاہیں بن گئے تھے۔ وہاں چڑیاں پھر چہچہانے لگیں، فصلیں پھر مسکرانے لگیں۔ لہو بھری جھیلیں مگر مچھوں سے اب پاک وصاف ہو چکی تھیں۔ صاف وشفاف جھیلوں کے کناروں پر راج ہنسوں کے جھنڈ کلیلیں کرنے لگے۔

گڑیاں کھیلتی ہوئی جن بچیوں کے پاپا ان کے لیے نئی گڑیاں لانے گئے اور کبھی نہ لوٹے، اب اُن گڑیوں کی گود میں جیتے جاگتے گڈے گڑیاں کھیل رہے تھے۔

کل کے بچے اب اس وردی کو پہننے کے قابل ہو رہے تھے جسے برسوں تک اماں ہر سال بڑے چاؤ اور پیار کے ساتھ ڈرائی کلین کراتی۔ تصویر کے نیچے لٹکاتی، تصویر پر پھول چڑھاتی اور پھر رو دھو کر فنائل کی گولیاں ڈال کر، اسٹیل کے کالے صندوق میں بڑی احتیاط اور احترام کے ساتھ رکھ دیتی تھی۔

ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی ممی پاپا کی شادی کی تصویریں مدھم پڑتی جارہی تھیں۔ اب وہاں نوجوان اور من چاہے منگیتروں کی تصویریں لگی تھیں۔ اور دیواروں کے درمیان گونجتی آوازیں جواں ہو رہی تھیں۔ وہ مائیں جو کبھی اسکول جاتے بچوں کی ماں اور باپ دونوں بننے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ اب پھر مائیں بن رہی تھیں، صرف مائیں —— نیک، ہونہار، ہنرمند اور خوب رو بیٹوں کے لیے دلہنیں ڈھونڈنے والی مائیں۔ سفید ساڑیوں، سفید شلوار قمیضوں میں ملبوس مائیں اپنے ان سرخ عنابی جوڑوں کو بڑے پیار سے دیکھ رہی تھیں۔ جو برسوں پہلے انہوں نے پہنے تھے صرف ایک بار۔ اب یہ جوڑے کوئی اور پہنے گی ان کی بیٹی یا ان کی بہو۔

بریفلے تو دے پر تعینات کانڈر نہیں کہہ پایا کہ کیوں کچھ دنوں سے پھر آسمان کا رنگ بدلنے لگا تھا۔ دن کے وقت بھی آسمان گدلا۔ کالا اور مٹیالا سا ہوتا جا رہا تھا۔ شاید گدھ آسمانوں پر پھر منڈلا رہے ہیں۔ گدھوں کے سائے نے سورج کی روشنی کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ گدھوں کو برسوں کی بھوک ستا رہی ہے۔ شاید ایک بار پھر۔

شاید اب سروں کی فصل پھر پک چکی تھی۔ سروں کی فصل کاٹنے کا موسم شاید پھر آگیا تھا۔ سوال صرف یہ تھا کہ سروں کی فصل کاٹنے کا آغاز کہاں سے ہو۔

کھیت کھلیان اور کھیل کے میدان کئی بار قبرستان بن چکے تھے۔ نئے تماشے کے لیے کوئی نیا تھیٹر، کوئی نیا میدان، کوئی نیا لوکیل درکار تھا۔

وہ لوکیل تھا برف کا ایک بہت بڑا اچھوتا تودا جس پر خیمہ زن کمانڈر نے اپنی آنکھیں بند کرلیں کر دیکھنا دشوار ہو رہا تھا۔

جسموں کی آگ کے الاؤ جب روشن ہوئے تو اس الاؤ کی تپش سیکڑوں میل نیچے بھی محسوس ہونے لگی۔ آگ کی ننھی ننھی ندیاں دھیرے دھیرے دریا بن کر نیچے کی طرف آ رہی تھیں۔

برف پر آگ کا کھیل کھیلنے کے کھلونے بیچنے والے بے حد خوش تھے۔ ایسے خطرناک کھیلوں کو پہلی آزمائش کے لیے کوئی مناسب میدان ملا تھا۔ پہلی بار برف کے بے جان تودوں کی خاطر انسانوں نے نیل کے بجائے لہو ڈال کر آگ کا دریا روشن کیا تھا۔ اس دور کے گلیڈ یٹر اپنے آقاؤں کے حکم پر ایک انوکھے کو لیسیم میں مرنے مارنے کا کھیل کھیلنے پر کمر بستہ تھے۔

کمانڈر کو اس بات کا بہر حال اطمینان تھا کہ دنیا کے سب سے اونچے برف کے پل کے اوپر انسانی سروں سے خون کی ہاکی کھیلنے والی ٹیمیں کھیل کے دستور اور قاعدوں سے پوری طرح واقف تھیں۔ کچھ وقفہ کے بعد کھیل بند ہو جاتا تھا دونوں جانب مہذب انسان مقابلے پر تھے۔ وہ سلطنتِ روم کے تماشائیوں کی طرح نیم وحشی نہیں تھے۔

جب کھیلتے کھیلتے کھلاڑی تھک جاتے، ان کے کھلونے ٹوٹ جاتے یا آتش بازی کا سامان ختم ہو جاتا تو کھیل رک جاتا۔ ایک فریق جھنڈی بلند کرتا، دوسرا فریق اپنی جھنڈی بلند کر کے جواب دیتا۔ اس طرح کھیل میں وقفے کا اعلان ہو جاتا۔ دونوں فریق قاعدے اور دستور کے مطابق کھیل کھیلتے تھے وقفے کے دوران دونوں کمانڈر آپس میں ملتے جنہیں "فلیگ میٹنگس" کہا جاتا ہے۔

ان ملاقاتوں میں دونوں فریق بڑے تپاک سے ہاتھ ملاتے۔ اپنی خیریت بتاتے اور دوسرے کی خیریت دریافت کرتے۔ وہ سب کے سب مہذب لوگ تھے مہذب لوگ قتل بھی کرتے ہیں تو "معاف کیجیے" کہہ کر!

رٹے رٹائے، گھسے پٹے مکالموں میں جو باتیں دہرائی جاتیں وہ کچھ اس طرح ہوتیں۔

"آپ کے آدمی کل پھر ہمارے علاقے کے آس پاس دیکھے گئے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ آپ کو آگاہ کر دوں کہ ہم اپنی سرحدوں کی یہ خلاف ورزی کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ آئندہ اگر آپ کے آدمی اس طرف آئے تو ہم سخت ترین کاروائی کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھیں گے۔ نتائج کی تمام تر ذمہ داری آپ پر ہو گی۔"

اس کا جواب بھی فوراً موجود ہوتا:

"یہ شکایت بالکل بے جا ہے۔ ہمارے جوانوں نے کبھی کسی سرحد کی خلاف ورزی نہیں کی۔ انہیں سخت حکم ہے کہ سرحدوں کی خلاف ورزی کبھی نہ کریں۔ آپ ہی کے لوگ اندھیرے کی آڑ میں ہماری لائینوں کے اندر آکر ہمارے چند آدمیوں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ مجبوراً میرے جوانوں نے دراندازوں کا سامنا کیا۔ ان میں سے دو درانداز مقابلے میں مارے گئے ان کی لاشیں مناسب کاروائی کے بعد آپ کے حوالے کر دی جائیں گی۔ آپ پر بھی لازم ہے کہ ہمارے جن جوانوں کو اغوا کیا گیا تھا۔ انہیں ہمارے حوالے کر دیں۔"

ایک ایک، دو دو اور کبھی کبھی تو دس دس بارہ بارہ لاشوں کے تبادلوں کی تفصیلیں طے کر کے مقامی کمانڈروں کی فلیگ میٹنگس بخوبی ختم ہوجاتیں۔ دونوں "اوکے۔ اولڈ بوائے" "سولونگ اولڈ چیپ" ایک دوسرے سے کہتے ——— "گڈ بائی" کا تبادلہ کرتے اور ان کی جھنڈیاں اٹھانے والے جوان واپس اپنے اپنے کیمپوں کو گھوم جاتے۔

رفتہ رفتہ یہ میٹینگیں روز کا دستور بن گئیں کہ ٹکراؤ بھی اب ہر روز ہوتا تھا میٹنگوں میں اب صرف لاشوں اور زخمیوں کے تبادلوں پر بات چیت ہوتی۔ اب کمانڈر لوگ ذاتی دلچسپی کی کوئی بات نہ کرتے۔ اب میٹنگوں کے بعد پہلی میٹنگوں کی طرح یہ فرمائش نہ کی جاتی کہ "یار، وائرلیس پر ذرا اپنے سسٹم پر کسی بھولی بسری فلم کا کوئی ریکارڈ لگوا دینا" یا "میرے پاس آج ہی کے بیگ میں فلاں فلمی رسالہ آیا ہے۔ کہو تو بھجوا دوں۔"

اب تو خیر لاشوں کا ہی تبادلہ ہوتا تھا مگر کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے کہ فلیگ میٹنگوں کے بہانے دواؤں، بوتلوں، مرچ مسالوں، فلمی رسالوں، میووں اور اچاروں کا تبادلہ بھی ہوجاتا کہ ایسی آدم خور بلندی پر سامنے کے دشمن بھی ہمدم و آشنا تھے۔

جب لاشیں بڑھتی گئیں اور قبروں کی قلت شدید ہو گئی تب شاہوں نے فیصلہ کیا کہ کھیل کے نئے دستور، نئی سطح پر ہونے چاہئیں۔

تب ایک ملک کے بڑے سکریٹری نے دوسرے ملک کے اتنے ہی بڑے سکریٹری کو ٹیلی فون کیا۔ ان ملکوں کے حاکموں کے درمیان ٹیلی فون کے تاروں کا رابطہ ہمیشہ قائم رہا۔ حد تو یہ ہے کہ جنگ کے دوران میں بھی وہ جب چاہتے ایک دوسرے سے بات کر کے خیر خبر دریافت کر لیتے۔ پچھلی لڑائی کے دوران لگی ہوئی "ہاٹ لائین" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک اعلیٰ سکریٹری نے دوسرے اعلیٰ سکریٹری سے "ہیلو" کہا اور حاکم کے حکم سے آگاہ کر دیا۔

نتیجے کے طور پر اعلیٰ حکام کے درمیان بات چیت کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ بات چیت ایک ملک کی راجدھانی میں دو اعلیٰ افسروں کے درمیان آمنے سامنے ہوئی۔

بات چیت کے شروع میں ایک ملک کا سب سے بڑا افسر دوسرے ملک کے سب سے بڑے افسر سے کچھ اس طرح مخاطب ہوا۔

"یور ایکسی لینسی، مجھے بے حد مسرت ہے کہ آپ اپنی تمام تر مصروفیتوں کے باوجود ہماری دعوت پر یہاں تشریف لائے۔ مجھے امید ہے کہ یور ایکسی لینسی کا قیام یہاں آرام دہ اور پر سکون ثابت ہوگا۔"

"آپ جانتے ہیں ہماری گفتگو انتہائی سنگین ماحول میں ہو رہی ہے۔ تناؤ خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔ میری حکومت اس تناؤ کے لیے آپ کی حکومت کو پوری طرح ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔"

"پچھلے کئی مہینوں سے آپ کے ہتھیار بند فوجی سپاہی ہمارے علاقہ میں غیر قانونی دراندازی کرتے رہے ہیں۔ ایسی اشتعال انگیز کاروائیوں کے ذریعہ تنازعہ کی شدت خطرناک حد تک بڑھ رہی ہے۔ اس کی تمام تر ذمہ داری آپ کے فوجی ہائی کمان پر ہے۔

"یہ بھی واضح کیا جاتا ہے کہ اپنی علاقائی سالمیت اور قومی اقتدار اعلیٰ کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے قومی حقوق کے تحفظ کی خاطر ہم جو بھی کاروائی مناسب سمجھیں گے، کریں گے۔ مجبوراً کئے ہوئے ایسے اقدامات کے خطرناک نتائج سے میری حکومت اپنے آپ کو پوری طرح بری الذمہ قرار دیتی ہے۔ میری حکومت ایک بار پھر عزت مآب مہمانِ محترم کو تسلیمات پیش کرتی ہے اس ملک میں یور ایکسی لینسی کا ایک بار پھر خیر مقدم۔"

دوسرے ملک کے اعلیٰ افسر نے اس تنبیہہ کو عین اسی طرح سنا جیسے اس کے میزبان

نے اسے سنایا تھا۔ چہرے پر کسی ردِعمل کے بغیر، سر اٹھائے بغیر، آنکھیں سامنے کی تصویر پر جمائے ہوئے، معزز میزبان کی طرح غیر جذباتی اور آہستہ آواز کے ساتھ عزت مآب مہمان یوں مخاطب ہوا:

"اپنی جانب سے اور اپنی حکومت کی جانب سے میں آپ کا اور آپ کی حکومت کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ہمیں یہاں آنے کی دعوت دی گئی۔ ہماری بات چیت انتہائی سنگین حالات میں ہو رہی ہے تناؤ خطرناک صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس کے لیے ہم آپ کی حکومت کو کلیۃً ذمہ دار ٹھہرانے پر مجبور ہیں۔

"یہ امر بھی آپ پر واضح ہونا چاہیے کہ پچھلے کئی سال سے آپ کی مسلح افواج کے افراد مذکورہ علاقے پر غیر قانونی قبضہ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ یہ سارا علاقہ ہمیشہ سے ہمارے ملک کے قبضہ میں رہا ہے۔ آپ کی فوجیں اپنی غیر قانونی کاروائیوں سے اس کی قانونی حیثیت میں تبدیلی کرنے کی خطرناک کوشش کر رہی ہیں۔ یقیناً دونوں طرف جانی نقصان ہوا ہے جس کی تمام تر ذمہ داری آپ کی حکومت پر ہے۔

آپ کی غیر قانونی کاروائیوں سے ہونے والے نقصان کی تلافی اور اپنے قانونی اور علاقائی حقوق کے تحفظ کے لیے جو کاروائی بھی فوجی اعتبار سے میری حکومت مناسب سمجھے گی کرے گی، آپ کی حکومت کو مناسب وارننگ دی جا رہی ہے۔ ایک بار پھر میں شکریہ ادا کرتا ہوں، آپ کا اور آپ کی حکومت کا کہ آپ نے مجھے یہاں آکر اپنی پوزیشن واضح کرنے کا موقع دیا۔ میرا وفد تسلیمات پیش کرتے ہوئے اس یقین دہانی کا اعادہ کرتا ہے کہ ہم ہر ممکن تعاون اور خدمت کے لیے ہر وقت حاضر ہیں۔"

مہمان نے خطاب کے آخری جملے جلدی جلدی ادا کر دیئے کہ یہ الفاظ بیسیوں بار ایسی ہی میٹنگوں میں اور احتجاجی مراسلوں میں دہرائے جا چکے تھے۔

دونوں جانب ایک پل کے لیے خاموشی رہی۔ آمنے سامنے دیواروں پر آویزاں نئے اور پرانے حاکموں کی تصویروں پر مہمان اور میزبان کی نظریں اور زیادہ گہرائی سے مرکوز ہو گئیں۔ سرکاری ملاقات ختم ہو چکی تھی۔ جونیئر افسر اور اسٹینو گرافر سر جھکا کر باہر جا چکے تھے۔ کہنے کے لیے اب کچھ نہیں تھا۔

سفارتی رپورٹ کے مطابق "بات چیت صاف گوئی کے آزادانہ ماحول میں ہوئی جس سے

دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کا زاویۂ نظر سمجھنے میں مزید مدد ملی۔ بات چیت کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اگلا دور دوسرے ملک کے دارالحکومت میں ہوگا۔"

کچھ کہے سنے بغیر میزبان بھی جانتا تھا اور مہمان بھی کہ اعلامیہ کے الفاظ کیا ہوں، شاید یہ اعلامیہ کمرے سے باہر کھڑے ہوئے اخباری نمائندوں میں تقسیم کرنے کے لیے پہلے سے ہی تیار تھا۔

دونوں نے اچانک ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ پہلی بار ان کی آنکھیں چار ہوئیں۔ پھر ایک نے دوسرے سے کہا ——"چل بھالو" ختم کر یہ بکواس اور بتا کہ حال چال کیسا ہے "، حال خراب اور چال بے ڈھنگی"

تب بھالو نے کہا: "ہاں کالو، یہ اپنی زندگی ہی بکواس ہے۔ صرف بکواس، خیر چھوڑو اس بکواس کو، سناؤ، کیسی ہیں ہماری اولڈ فلیم؟ فٹ اینڈ فائن؟ اور وہ تمہارے جیک اینڈ جل۔ میں ایک ایک کراؤن لایا ہوں دونوں کے لیے۔ جیک کے لیے مفلر، جل کے لیے نٹیڈ وول کیپ۔"

"شکریہ۔ سب ٹھیک ہیں، سب ٹھیک ہیں، بالکل ٹھیک۔ ویسے جیک اینڈ جل تو اب پنے اپنے جیک اینڈ جل جھیلنے کی عمریں ہو رہے ہیں۔ تم بتاؤ کیسی ہے ہماری گولڈی لاک اور اس کی ممی۔ ٹین ایجرز بیوٹی کوئین کا مقابلہ جیتنے کے لیے اب بھی تیار۔ آئی ایم شیور"

"بھالو یار، تم ویسے کے ویسے ہی بھالو لگتے ہو۔"

"کالو تم بھی ویسے کے ویسے کالو ہی لگتے ہو۔ پکے دس نمبری۔"

تب ایک نے دوسرے سے کہا: "باہر رپورٹر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہمیں بتانا ہے کہ ہماری بات چیت کامیاب تو نہیں ہوئی مگر سودمند ضرور رہی۔"

"کامیابی، ناکامی چھوڑو۔ صرف سودمند کافی ہوگا۔"

"جو تم مناسب سمجھو کہ یہ بدمعاش جرنلسٹ خود ہی سمجھ جائیں گے کہ آزادی اور صاف گوئی کے ماحول میں ہوئی بات چیت کا مطلب کیا ہے۔ اِس کا مطلب ہے تمہاری بکواس میں نے سنی اور میری بکواس تم نے۔ معاملہ وہیں کا وہیں۔"

"کیا کیا جائے۔ نوکری کا معاملہ ہے۔"

"ہاں، کیا کیا جائے۔ نوکری کا معاملہ ہے۔"

"یار، آرام سے گھر آؤ۔ کچھ گپ شپ ہو۔ کچھ دارو وارو پی جائے، کوئی گال منداکیا جائے۔ اور ہاں کھانے کے لیے کوئی خاص فرمائش؟"

"بس مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ، یہی تھا اولڈ فلیم کا فیورٹ لباس۔ گہری بسنتی شلوار اور گرین شرٹ۔ تم بڑے لکی ہو یار، کیا گاجر کے حلوے کی رنگت والی لڑکی اٹھا لائے ہو ہمارے دیس سے۔"

"تمہارا دیس کیسے ہوا؟ تم جو دریا کے اُس پار کے بھگوڑے ہو۔"

"پھر وہی بیکار کی باتیں۔"

"تو کام کی باتیں؟"

"گھر پر ہوں گی کام کی باتیں، وہسکی کی بوتل، مکئی کی روٹی، سرسوں کا ساگ جیک اینڈ جل کے ساتھ"

"تو طے؟"

"ہاں طے۔"

"صرف گھر کے لوگ؟"

"آف کورس۔ اسی لیے میں نہیں بلا رہا ہوں تمہاری ایمبیسی والوں کو۔"

"گولی مارو بے ایمانوں کو۔"

"میں نے اپنے بھی کسی افسر کو نہیں بلایا۔ گولی مارو اِن بدمعاشوں کو۔"

اپنے اپنے بدمعاشوں اور بے ایمانوں کو اپنی اپنی گولی مارنے کے اس اعلان کے بعد وہ دونوں باہر آ گئے۔ ہاتھوں میں اپنے اپنے بریف کیس پکڑے۔ جو بات چیت کے دوران ایک بار بھی کھولے نہیں گئے۔

دونوں نے دُور خلا میں جھانکتے ہوئے تصویریں کھنچوائیں۔ نوجوان نامہ نگاروں نے کچھ سوال کیے۔ ہر سوال کا جواب ابوالہول ایسی پُراسرار مسکراہٹ سے دیا گیا۔ پرانے نامہ نگاروں نے کچھ نہیں پوچھا۔ نہ سوال پوچھو، نہ جھوٹ سنو۔ بس اعلامیہ پڑھو اور سرخیاں گھڑو۔

مہمان اور میزبان دونوں اب تک ایک دوسرے کی سیاسی صلاحیتوں کا لوہا مان چکے تھے کالج چھوڑ کر اپنی اپنی سرکار کی نوکریاں کرتے کرتے دونوں کو جھوٹ سچ بنا کر بیچنے کے پیشے میں لاثانی مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ ثبوت کے طور پر دونوں اپنے اپنے ملک کے اعلیٰ

ترین سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ تقسیم کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہوا۔ تقسیم اگر نہ ہوتی تو ان میں سے ایک ہی ـــــ صرف ایک ہی ـــــ اعلیٰ ترین عہدے پر پہنچ پاتا۔ اور ایک نہ ایک دوسرے کو "سر" کہنے پر مجبور ہوتا۔ اب دونوں ایک دوسرے کو سرِ عام اتنی آسانی کے ساتھ یور ایکسی لینسی کہتے جیسے گھر میں بیٹھے بے ایمان اور بدمعاش کہہ رہے ہوں۔

کالو اور بھالو دونوں بڑے سے گھر کی چھوٹی سی اسٹڈی میں بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں وہسکی کے گلاس اور زبان پر بھولی بسری، برسوں بیتی کہانیاں اور اسکینڈلز۔ اسکینڈلز اُن دونوں کے پہلے کی باتیں، پھر بیویاں اور پھر قبریں۔

کہانیاں نہیں۔ بے ربط اور بے معنی جملے۔ وہ جملے جن کا مطلب یا بولنے والا جانتا ہے یا سننے والا۔ ایسے ٹوٹے سے، ایسے بکھرے بکھرے سے الفاظ جو باہر والا سنے تو شیشے کی کرچیاں سمجھ کر دور پھینک دے اور گھر والا سنے تو اچانک ٹھوکر کھاکر ٹوٹ جانے والی نایاب مورت کے ٹکڑے سمجھ کر جوڑنے کی کوشش میں جٹ جائے۔

وہ دونوں مل کر کانچ کے ان ہی ٹکڑوں کو دوبارہ وہی حسین و دلکش صورت دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر جیک کا کراون ٹوٹ چکا تھا اور جل کی بالٹی بھی پانی سے خالی ہو چکی تھی۔ کالو کی جل اب کالج میں پڑھا رہی تھی۔ بھالو کی گولڈی لاک دور بہت دور اپنے پیا کے گھر بیٹھی ایک ننھی سی بچی کو گود میں لیے اسے سنہرے بالوں والی گولڈی لاک اور کالے بالوں والے تین بھالوؤں کی کہانی سنا رہی تھی:

"ممی بھالو، پپا بھالو اور بچہ بھالو"

"ارے کالو، وہ اپنا جیک کس حال میں ہے؟"

"سنا نہیں جیک آف آل ٹریڈز، ماسٹر آف نن!"

"کیا کسی چرچ کی نن سے عشق کر بیٹھا ہے؟"

"بھالو۔ تو ویسے کا ویسا بدمعاش رہا۔ ہر بات کو پھونک مار کر مذاق میں اڑا دینے والا"

سرسوں کا ساگ، مکئی کی روٹی، بھالو کے ابا کی برسوں پرانی بیوک۔ لڑکے اس بیوک کو بیل گاڑی کی طرح استعمال کرتے کہ بیل گاڑی کو بیل آگے سے کھینچتے ہیں۔ بیوک کو پیچھے سے آگے دھکیلا جاتا۔ ٹین ایج بیوٹی کوئین کا مقابلہ، جس کے پاس حاصل کرنے کے لیے دونوں نے نہ جانے کتنے پاپڑ بیلے۔

پتنگوں کی باتیں، بڑی چھوٹی، لمبی چوڑی، پتنگیں جو ایک بسنت کے روز ختم ہوتیں اور بسنت کے دوسرے روز شروع ہوجاتیں۔ نئی بسنت تک کے لیے کہ والدین کا خیال تھا کہ پتنگیں اڑانا خطرناک مشغلہ ہے۔ لڑکیاں جو تین تین، چار چار کی ٹولیوں میں کالج کے باغوں میں تتلیوں کی مانند اٹھلاتی پھرتیں، باغوں کا مالی جو ایک ایک پھول کے لیے ایسے نخرے کرتا جیسے کوئی فلمی دوا فروش کسی نردھن کنواری کو اس کی مرتی ہوئی ماں کو بچانے کے لیے دوا بیچ رہا ہو۔

ہاکی میچ، انٹر یونیورسٹی مباحثے، بیڈمنٹن مقابلے۔ منز سنگھنہ اور مکسڈ ڈبلز، کتنے ہیر پھیر کیے جاتے کھیل کا پارٹنر چننے کے لیے۔ لائبریری کے رومانس۔ جو کتاب کے تبادلے سے شروع ہوتے، مونگ پھلی پر پروان چڑھتے اور فلم ساتھ دیکھنے کی پیش کش پر ختم ہوجاتے۔ سلیپنگ بیوٹی جو ہسٹری کے ہر لیکچر کے دوران سوجاتی اور گھنٹی بجتے ہی اٹھ کھڑی ہوتی۔

یہ سب جیک اینڈ جل کے آنے سے پہلے کی باتیں رہیں۔ یہ سب اس سمے کی باتیں ہیں جب گولڈی لاک کی ممی خود گولڈی لاک کہلاتی تھی۔

اور پھر سرسوں کے ساگ اور مکئی کی روٹی کے لباس میں ملبوس خانون خانہ نے پوچھا!
"کھانا لگواؤں؟"

تب کسی نے کسی سے کہا۔" اس کا مطلب سمجھتے ہو؟ نہیں سمجھتے تو میں بتاتا ہوں۔ پرانے لڑکو، پینا بند کرو اور کھانا شروع کردو۔"

"ہاں یاد ہے نا۔ رات گئے تک رجو بھابی بھی چلاتی رہتی تھیں۔ مگر نہ بھیا بوتل بند کرتے اور نہ ان کے دوست اپنی بکواس۔ آفیسرز میس۔ جم خانہ۔ وینٹی بار ____ کیا دن تھے! ہم نے تو خیر دیکھے ہی نہیں۔"

"یاد ہے اماں جی کس طرح پھٹکارتی تھیں تمہیں، کہ انہیں ڈر تھا کہ ان کا لال چوری کے سگریٹ پیتے پیتے کوئلہ نہ ہوجائے۔"

"سگریٹ اور وہ بھی چوری کے؟"

"یار۔ پپا بڑے وضع دار تھے۔ خود ہی تکیے کے نیچے کریون۔ اے "کی ڈبیا رکھتے تھے کہ بیٹے کو اگر بری لت لگی ہے تو گھٹیا سگریٹ پی کر جگر خراب نہ کرے۔"

"شاید ان کے پاپا بھی یہی سوچتے ہوں گے۔"

"مگر ہم اپنے بیٹوں کے لیے ایسا نہیں کر سکتے۔"
"کہ اب ہم ان کے سگریٹ چھپا کر پیتے ہیں۔"
"تو تم پر بھی پابندی لگ گئی؟"
"اور تم پر بھی؟"
"ہاں مجھ پر بھی۔ ایک دو اور بس۔ تمام بیوٹی فل لڑکیاں، بیویاں بن کر ایسا ہی کرتی ہیں۔"
"ٹیلی ویژن پر یہ خوبصورت سی لڑکی کیا کہہ رہی ہے؟"
"شکل پسند ہے تو آواز بھی سن لو۔"
"ٹیلی ویژن کی آواز جو اب تک بند تھی، اونچی کردی گئی۔ خبروں کا بلٹن ختم ہو رہا تھا سرخیاں دوبارہ پڑھی جا رہی تھیں:
"دونوں ملکوں کے اعلیٰ حکام کی بات چیت صاف گوئی کے ماحول میں کسی نتیجے پر پہنچے بغیر آج شام ختم ہو گئی۔ واقف حال مبصروں کا کہنا ہے کہ بات چیت کی ناکامی کی ذمہ داری . . . ."
"پتہ ہے۔ پتہ ہے۔ بند کرواسے!"
اور ٹیلی ویژن کی آواز پھر بند کردی گئی۔
"پوور گرل! بے چاری لڑکی!"
"کیا کرے اس کی نوکری کا معاملہ ہے۔"
"مصیبت یہ ہے کہ ہم سب کی نوکری کا معاملہ ہے۔"

"کم آن بوائز۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"
"یار۔ یہ بیویاں!"
"بڑی بور ہوتی ہیں۔"
"یار۔ بور بیویوں کے چارمنگ شوہر کیوں ہوتے ہیں۔ ہم جیسے؟"
"بیویوں کو السر عطا کرنے کے لیے۔"
"تو کیا تمہارے ہاں بھی پیٹ کے پھوڑے موجود ہیں؟"

"ہاں۔ ہر پرکشش شوہر کی بیوی پیٹ کے السر کا شکار ہوتی ہے۔"
"یہی ہمارا مقدر ہے۔ خود دل کے بیمار۔ بیویاں السر کا شکار۔"
"مگر سنو بھالو۔ یار۔ برف کا یہ پل ہے کہاں؟"
"ویسے مجھے بھی پتہ نہیں کہ اصل میں یہ ہے کہاں۔"
"آؤ، نقشہ دیکھیں۔ میرے بریف کیس میں ہے۔"
"چھوڑ یار۔ اس بکواس کو۔ کل اخباروں میں پڑھ ہی لیں گے۔"
"ہاں چھوڑ اس بکواس کو۔ کوئی کم دی گل کر، یار۔"
"ہاں۔ کوئی کم دی گل۔"
اور وہ کم دی گل کرنے کھانے کی میز کی جانب بڑھے۔ وہاں رکھا ہوا کھانا البتہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی
مدیر اعلیٰ پریس ایشیا انٹرنیشنل نئی دہلی ۱۱۰۰۴۹

ہماری مطبوعات

تین خط تین زندگیاں۔ افسانوی انتخاب، مرتب راج پال سہگل، ۲۰۸ صفحات ۵۰/- روپے
شعاع جاوید (کالیداس گپتا رضا کی رباعیات) انتخاب اور مقدمہ گوپی چند نارنگ ۳۰/- روپے
الیوژن اور کابوس (بلراج ورما کے افسانے) قیمت ۳۵/- ، اور ۴۰ روپے

تناظر ۱	عصری ادب کی انیتھالوجی	ضخامت ۵۹۲ صفحات		۴۴/- روپے
تناظر ۲	عصری اردو شاعری کی انیتھالوجی	″ ۴۹۶	″	۴۰/- روپے
تناظر ۳		″ ۱۷۶	″	۱۲/- روپے
تناظر ۴		″ ۱۶۰	″	۱۲/- روپے
تناظر ۵ اور ۶		″ ۲۸۸	″	۳۰/- روپے
تناظر ۷ تا ۱۳	(کالیداس گپتا رضا نمبر)	″ ۷۰۰	″	۱۰۰/- روپے
تناظر ۱۴ اور ۱۵	ترقی پسند تحریک نمبر	″ ۲۴۰	″	۳۰/- روپے
تناظر ۱۶		″ ۳۸۰	″	۴۰/- روپے

نوٹ: ساری مطبوعات ایک ساتھ خریدنے کی صورت میں
پچاس فیصد رعایت دی جائے گی۔
(ڈاک خرچ علاحدہ)

زیرِ طبع: (۱) تناظر کے چار یک موضوع شمارے۔ (۱) امرتا پریتم نمبر
(۲) گوپی چند نارنگ نمبر (۳) کالیداس گپتا رضا نمبر ۲
(۴) افسانہ نمبر (چار جلدوں میں)
(۵) فکر تونسوی نمبر
(ب) 'شیش ناگ' (ناول) مصنف بلراج ورما (پ) 'اٹا' (ناول) مصنف بلراج ورما اور (ت) 'معمولی آدمی' (افسانے) مصنف بلراج ورما

تناظر پبلی کیشنز، ۲۴ ڈی، پاکٹ ۳ میور وہار دہلی ۱۱۰۰۹۱

کلام حیدری

دائرے میں گھِرا آدمی

آیا تھا نمائش دیکھنے، دیکھی بھی، مگر یہ نمائش تھی؟

مجھے لگا میں خود نمائش کے لیے ایک نمائش تھا!

ہوا یہ تھا.........

کہاں کچھ ہوا تھا.......

کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا!

یا کچھ ہوا تھا ـــ؟

جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ مجھے ہوا تھا، ذہن پر بے خبر دگی کی گہری سی پرت پڑ گئی تھی یا یہ کوئی اور چیز تھی؟۔ آنکھیں دیکھ سکتی تھیں، مگر نہیں دیکھ پا رہی تھیں، دل پہلے بھی دھڑکتا تھا مگر اب زیادہ دھڑک رہا تھا اور پھر بھی لگتا تھا، بیٹھا جا رہا ہے، مجھے پلکوں کو جلدی جلدی جھپکنے کی عادت نہیں، مگر کسی عادی پلک جھپکنے والے کی طرح جلدی جلدی پلک جھپک رہا تھا۔

لگتا تھا ہر بار پلک جھپکنے کے بعد آنکھیں کھلتیں تو کوئی نیا منظر سامنے تھا ـــ مگر کہاں تھا؟۔

منظر تھا، لیکن پلک جلدی سے جھپک جاتی اور پھر دوسرا منظر ـــ

مگر میں یقین کر پاتا کہ یہ دوسرا منظر تھا اس سے پہلے ہی پلکیں جھپک جاتیں یہ منظر کے جلدی جلدی بدلنے کا سماں تھا یا میرے ذہن پر جو گہری دھند پڑ گئی تھی اور دل بیٹھا جا رہا تھا، اس کا اثر تھا، ورنہ منظر اتنی جلدی جلدی تو نہیں بدلتا، "سپر فاسٹ" ٹرین میں کھڑکی کے پاس بیٹھے مسافر کی طرح ـــ مگر وہاں تو نمائش تھی اور میں جلدی جلدی پلکیں جھپک رہا تھا۔ ورنہ کہیں اس طرح منظر بدلتا ہے، سکنڈ کے بھی ٹکڑے ہو گئے؟۔

ہو گئے؟۔

(وقت کو کاٹ کاٹ کر سکنڈ کے اعشاریوں میں کام ہو رہے ہیں)

منظر اتنی جلدی جلدی نہیں بدلتا!

بدلتا ہے کیا؟

اتنی جلدی جلدی نہیں بدلتا........ پھر دل اتنی جلدی جلدی کیسے دھڑکتا ہے، کیوں دھڑکتا ہے؟۔

(اور اسکرین پر گراف کتنی جلدی جلدی بنتا ہے اور پھر فوراً دوسرا، پھر فوراً تیسرا۔ یہ Intensive Cardiac Unit کا کمرہ تو نہیں)

جو کچھ بدلتا ہے اپنے اندر بدلتا ہے!

جو بنتا ہے اپنے اندر بنتا ہے!

جتنا کچھ ٹوٹتا ہے، اپنے اندر ٹوٹتا ہے

جتنی بار ٹوٹتا ہے، اپنے اندر ٹوٹتا ہے۔

مگر یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس کا کچھ تو پتہ چلے، مجھے تو کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا

میں سن سکتا ہوں؟۔

ہاں سن رہا ہوں؟

کیوں کہ بہت سارے لوگ بول رہے ہیں۔ ان کی زبان بھی اجنبی نہیں ہے۔

مگر مجھے ہوا کیا ہے؟

شبدوں کے جیسے سائے ہوں کہ گزرے جا رہے ہوں، لیکن میں پہچان نہیں پاتا شبد آواز ہیں — آواز تو ہیں، مگر کچھ بتاتے نہیں، نہیں — بتاتے ہیں — مگر مجھے تو یہ سائے لگ رہے ہیں —

معنی کی تجسیم کیوں نہیں ہو رہی ہے؟۔

لفظ ہی کان میں پڑتے ہیں، مگر وہاں تو — آواز اور سائے — اور شبد!

شبدوں کو یوں تو کبھی نہیں پایا ہے!

بہت سارے لوگ بول رہے ہیں، تمائش کی بھیڑ بول رہی ہے۔

اور تمائش کی بھیڑ کافی فاصلے پر ہے مگر میرے ارد گرد جمع ہوتی جا رہی ہے، بھیڑ بول رہی ہے، ان سبھوں کے ہونٹ ہل رہے ہیں اور ہلنے کے فوراً بعد — تقریباً ساتھ ساتھ آوازیں میرے کانوں میں یوں آ رہی ہیں کہ جیسے وہ صرف آوازیں ہوں — سائے ہوں، آوازوں کے سائے، شبد ہیں؟۔

رکو رکو — سائے رکو —

میں تمہیں پہچاننا چاہتا ہوں۔

کوئی سایہ صورت نہیں بن پاتا، کوئی سایہ جواب نہیں دیتا۔

اور بھیڑ میری طرف بڑھی چلی آ رہی ہے۔

مگر عجیب بات ہے، عجیب بات ہے۔

میں جلدی جلدی پلکیں جھپک رہا ہوں......... منظر جلدی جلدی.....

مگر منظر تو ایک ہی ہے؟

بھیڑ کے گھیرے میں آ گیا ہوں اور سب ساکت نظریں مجھ پر گڑی ہیں،

کوئی ہنس نہیں رہا ہے، کوئی رو بھی نہیں رہا ہے۔

مگر عجیب بات ہے!

کتنی عجیب بات ہے!

یا اس میں عجیب ہونے کی بات نہیں ہے؟ یہ کون سی عجیب بات ہے؟۔

یا جو مجھے عجیب لگ رہی ہے وہ بات بذات خود عجیب ہی ہو، یا نہ ہو —

کیا ضروری ہے کہ.........

میں عجیب عجیب کہہ کر بات کو عجیب بنانے کی کوشش کر رہا ہوں، کتنا بیکار

کام کر —

.... یہ بھیڑ

اس بھیڑ کا ہر آدمی.......

ہے نا عجیب بات — اس بھیڑ کا ہر آدمی اپنے سر کے بل کھڑا ہے اور دونوں ہاتھوں پر چل رہا ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے اپنا سر ٹٹولتا ہوں — وہ تو ہے اور وہ آسمان کی طرف ہے۔

میں جھک کر دیکھتا ہوں، میرے پاؤں؟

مگر یہ تمہارے......

تمہارے پاؤں آسمان کی طرف کیوں ہیں؟ تمہیں پتہ نہیں، تم آدمی ہو اور آدمی کا سر اوپر — آسمان کی طرف ہوتا ہے، پاؤں زمین کی طرف ہوتے ہیں'

ہاں بھائی لوگو! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں —

پاؤں زمین پر نہیں ہوتے تو.........

میرے پاؤں زمین پر ہیں — بالکل ہیں!

اس بھیڑ کے لوگوں کو کیا ہوا ہے؟

یہ سب کے سب سر کے بل کیوں ہیں؟ اور چلنے کے لیے پاؤں کی بجائے ہاتھوں کو استعمال

میں کیوں لا رہے ہیں۔

بھائیو!

یہ آپ لوگ سر کے بل کیوں ہیں؟ اور ہاتھوں سے کیوں چل رہے ہیں؟

کوئی جواب نہیں دیتا، ہر چند کہ ان کے ہونٹ ہلے ہیں اور آوازیں بھی نکلی ہیں مگر میں شبدوں کے انتظار میں ہوں کہ شبدوں ہی میں تو معنی ہوتے ہیں ـــــــ

آوازوں میں معنی کیسے پاؤں؟

بھیڑ کا دائرہ بہت وسیع ہے، لوگ مجھ سے دور ہیں مگر یہ دائرہ بہت آہستہ آہستہ چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔

میرے بھائی لوگو!

تم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے کیوں دیکھ رہے ہو؟

میں تو بالکل نارمل آدمی کی طرح پاؤں پر کھڑا ہوں جو زمین پر ٹکے ہیں ـــــ

مگر میں کہنا کیا چاہتا ہوں؟ بھیڑ کا دائرہ دھیرے دھیرے تنگ ہوتا جا رہا ہے!

عجیب بات ہے، عجیب بات ہے!

میں کروں تو کیا کروں؟

اچانک مجھے لگا میرے ذہن پر دبیز پرت جو پڑی ہوئی لگ رہی ہے وہ اور دبیز ہو گئی ہے اور ذہن کے سبھی دریچے بغیر کسی باہری دباؤ کے پھٹ پھٹ بند ہو گئے ہیں اور دل بہت تیز تیز چل رہا ہے ـــ بہت تیز تیز ـــ

اور ......

اور بھائیو!

تم آ رہے ہو، شبدوں کا استعمال کرو اور شبدوں کے ذریعہ مجھ تک اپنی بات پہنچاؤ، کیوں کہ مجھے لگتا ہے .... تم آوازوں سے ترسیل کا کام نہیں لے سکتے، ہاں میرے بھائیو! شبدوں کا استعمال کرو!

اور یہ سمجھو کہ تم اشرف المخلوقات ہو اور خالق نے نطق آوازوں کے لیے ہی عطا نہیں کیا، شبدوں کو ادا کرنے لیے یہ صلاحیت دی ہے،

اور بھائی لوگو!

پنجوں کے بل مت چلو کیونکہ خالق نے پاؤں دیے ہیں، سر آسمان کی طرف کرو، پاؤں دھرتی پر رکھو، دھول اور چھالے تلووں میں

اچھے لگتے ہیں، مبارک ہیں، ہتھیلیوں میں دھول نہیں ہونی چاہیئے، ان میں

ہنر ہونا چاہیئے، مستقبل ہونا چاہیئے!

اور تب مجھے لگا میں اپنے آپ کو کہہ رہا ہوں ——

"ہر آسمان کی طرف ہونے اور رکھنے کی وجہ سے ہی تو آسمان تم پر ستم ڈھاتا ہے"

سر کے سب دریچے اچانک بند ہو گئے تو یہ کون بولنے لگا —— ؟

کون بولنے لگا؟

ایسے شبد جو معنی دیتے ہیں اور آواز نہیں ان میں نہیں!

—— تو شبد آواز نہ ہوں تو معنی دیتے ہیں؟

تو میں؟

تو میں کسی منزل میں ہوں؟

اور یہ سر کے بل اور پنجوں سے چلتی ہوئی بھیڑ کس منزل میں ہے؟

یا منزلوں کی باتیں بے معنی ہیں؟

پھر میں اپنے آپ کو کیا کہہ رہا ہوں؟

سوچنے، دیکھنے، سننے —— کسی کے کوئی معنی نہیں!

پیروں سے چلو چاہے پنجوں پر چلو ——

چاہے دھرتی سے پاؤں ٹکے رہیں یا سر —— کوئی فرق نہیں!

میں اپنے آپ کو کہہ رہا ہوں! یا کوئی اور مجھے کہہ رہا ہے؟ یا کوئی مجھے نہیں کہہ رہا ہے،

وہ بس کہہ رہا ہے، شبدوں کے ذریعے سچائیوں کو معنی پہنا رہا ہے؟

یہ سچائیاں کہی جاتی ہیں؟

یا بھگتی جاتی ہیں؟

جھیلی جاتی ہیں!

سچائیوں سے معنی پھوٹتے ہیں یا ....

سچائیوں کو جھیلنے والے!

بے چارے!

بُدھ دیو!

عیسیٰؑ!

حسینؓ!

نردان سچائی ہے!

صلیب سچائی ہے!
فرات سچائی ہے !
تشنگی سچائی ہے!
سچائیاں کہیں نہیں جاتیں!
سچائیاں بولتی ہیں — !
تیاگ بولتا ہے !

صلیب بولتی ہے !
فرات پوری تیزی کے ساتھ بہہ رہی ہے
اور بہتر —
آج بھی......
سچائیاں بولتی ہیں ——
اور بولتے تھک جاتی ہیں تو —
— تاریخ کی کتابوں میں کہانیاں بن کر دُبک جاتی ہیں !
یا دفن کر دی جاتی ہیں —
اور بھیڑ سر کے بل کھڑی ہو جاتی ہے
اور پنجوں سے چلنے لگتی ہے!
اور آفاتِ سماوی کو اپنے سر پر ڈھونے کے لیے میں پاؤں پر کھڑا رہتا ہوں، چلتا رہتا ہوں، دھول اور آبلے اور دھرتی اور پاؤں........
میں!
ہر میں ایسا نہیں کرتا کیوں وہ عقلمند ہوتا ہے! ہوش مند ہوتا ہے!
بھیڑ کا میرے گرد دائرہ تنگ ہوتا چلا جا رہا ہے......!

م.ق.خان

غم سے نجات

وہ عجیب کرب سے گذر رہا تھا۔ غم و اندوہ نے اُسے اندھے کنویں میں دھکیل دیا تھا۔ آخرش اسے اپنی قسمت پر بھروسہ کرنے کا سودا کرنا پڑا تھا اور دوسرا چارہ کار ہی کیا تھا؟

لطیف کا اکلوتا بیٹا جاوید ایک عرصہ سے بیمار تھا۔ صحتیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ جاوید کی آنکھیں غار نما حلقوں میں دھنسی جارہی تھیں۔ ستوان ناک اور رخسار کی ہڈیاں اونچی اور نمایاں ہو گئی تھیں۔ حالات آخری منزل کی جانب بڑھتے قدم کے غماز تھے۔ غم و یاس کی وجہ یہ تھی کہ امید کی آخری کرن بھی مصلوب ہوتی نظر آرہی تھی۔ قسمت بھی اس کے لیے عجیب متلون ثابت ہوئی تھی۔ جیسے وہ بھی خوشحالی اور دولت کی زرخرید لونڈی ہو؛ سچائی اور ایمانداری پر اس کا یقین متزلزل ہو چکا تھا۔ یقین کا سارا سرمایہ بے یقینی کی گود میں ابدی نیند سو چکا تھا قسمت، مشیت ایزدی۔ یہ ساری باتیں سفید جھوٹ ہیں۔ محض بہلاوا ہیں —— فریب مسلسل ہیں۔ وہ بہت دنوں تک ان پُر فریب کھلونوں سے اپنے دل کو بہلاتا رہا تھا کہ ایک دن اس کے یقین، اس کی قسمت کا انصاف اس کے حق میں ہوگا لیکن یہ سارے رشتے منقطع ہو چکے تھے اور ساتھ ہی اس کے عزم و استقلال کا شیرازہ تنکا تنکا بکھر گیا تھا۔

لطیف اس حویلی میں گماشتہ یا منیجر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس کے ذمہ کوئی خاص کام نہیں تھا لیکن وقت ضرورت وہ ہر کام کو انجام دیا کرتا تھا۔ اسے یہ کام اپنے باپ سے ورثہ میں ملا تھا۔ کیونکہ اس کے آبا و اجداد ایک زمانہ سے اس زمیندار خاندان کی خدمت کر رہے تھے۔ اسی زمیندار خاندان کا وارث علی اکبر خاں تھا جس نے زمینداری کے خاتمہ کے بعد تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ اپنے مالک کے ساتھ لطیف بھی گاؤں سے اٹھ کر شہر آگیا تھا۔ لطیف کا مالک نہایت مہربان اور رحمدل تھا اس نے مکان کے باہری حصوں

میں بنے کمروں میں سے ایک کمرہ لطیف کو دے رکھا تھا، جس میں لطیف اپنی بیوی اور بیٹا جاوید کے ساتھ نہایت اطمینان اور آرام سے گذر بسر کر رہا تھا۔ لطیف کی آخری اور دلی خواہش تھی کہ وہ جاوید کو تعلیم دلا کر کم از کم کسی سرکاری دفتر میں کلرک کے عہدہ پر تقرری کروادے۔ اسی مقصد کے تحت وہ اپنی روزمرہ کی ضرورتوں کو محدود کر کے اپنے آرام و آسائش کا خیال ترک کر کے جاوید کو تعلیم دلوا رہا تھا۔ جاوید دسویں جماعت میں پڑھتا تھا جو ہائی اسکول کا آخری سال ہوتا ہے۔ جولائی کے ماہ میں لطیف کی بیوی کے پیٹ میں درد اٹھا اور اس سے قبل کے وہ کچھ علاج کر پاتا اس کی بیوی نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اس حادثہ نے اس کی زندگی کو ایک نیا موڑ دیا۔ اب اس کی نگہداشت کا سارا مرکز اس کا اکلوتا بیٹا رہ گیا تھا۔ اس کے بیٹے کو نومبر ماہ میں ٹیسٹ امتحان میں شریک ہو کر آئندہ فروری یا مارچ میں ہونے والے فائنل امتحان کے لیے ہونا تھا۔ وہ بورڈ کے امتحان کی فیس کے لیے اور جاوید کے ٹیوشن پڑھنے کے لیے رقم اکٹھی کر چکا تھا۔

لطیف کا مالک اس کی بیوی کے انتقال کے بعد کچھ زیادہ ہی مہربان نظر آتا اور اکثر و بیشتر لطیف کی ہمت افزائی کرتا۔ وہ لطیف کو تعلیم کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا احساس بھی دلاتا۔ اس نے یہ بھی یقین دلایا تھا کہ جاوید میٹرک پاس کر جائے گا تو وہ جاوید کو اپنے اثر و رسوخ سے کسی دفتر میں نوکری دلوا دے گا۔

مالک کا لڑکا راشد بھی جاوید کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس نے جاوید کو کئی جوڑے کپڑے دے رکھے تھے۔ گاہے گاہے سینما یا پکنک جاتا تو جاوید کو ضرور ساتھ لے جاتا دونوں ہم عمر تھے اور دونوں بلا کسی تفریق کے ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ جاوید بھی راشد کو بہت مانتا تھا۔ مالکن جاوید کو بہت پیار کرتی تھیں۔ تیوہار یا کسی دوسرے موقع پر اُسے لذیذ کھانے اور مٹھائیاں دیتی تھیں۔

ایک شام جب لطیف دن بھر کی کارگذاریوں کا حال سنانے حویلی گیا تو حیران ہو گیا۔ ڈاکٹر بتہ جی راشد کا معائنہ کر تا تھا۔ مالک اور ان کی بیگم پر فکر و رنج کے گہرے نقوش تھے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ یہ موسمی بخار ہے۔ جلد اتر جائے گا۔ بخار بہت تیز تھا اور راشد بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔

اپنے کمرہ میں آتے ہی لطیف نے جاوید سے راشد کی اچانک علالت کا ذکر کیا۔ جاوید

فوراً راشد کو دیکھنے کے لیے روانہ ہوگیا۔ اپنے دوست کو تکلیف میں دیکھ کر جاوید کو بڑا رنج ہوا۔ رات گئے راشد کا بخار اتر گیا اور وہ پرسکون ہوگیا لیکن صبح جیسے جیسے دن چڑھتا گیا راشد کا بخار تیز ہوتا گیا۔ شہر کے جتنے مشہور ڈاکٹر تھے مشورہ کے لیے بلائے گئے۔ ان کی دواؤں سے راشد کا بخار کبھی اتر جاتا لیکن پھر وہ اسی طرح بخار سے پھنکنے لگتا۔

دوسرے دن شام کے وقت لطیف گھر آیا تو اس نے دیکھا کہ جاوید بخار میں مبتلا ہے۔ وہ فوراً ڈاکٹر کے پاس گیا اور دوا لے آیا۔ صبح ہوتے ہوتے جاوید کا بخار اتر گیا لیکن وہ نہایت تھکا تھکا سا اور پژمردہ نظر آرہا تھا۔

ادھر راشد کا بخار اترتا اور پھر تیز ہو جاتا اس طرح دو ہفتے گذر گئے اس بات سے اس کے والدین بہت متفکر تھے۔ جاوید کی صحت بھی تشفی بخش نہیں تھی۔ مالک اور مالکن نے لطیف اور جاوید کی اچھی طرح علاج کروانے کا مشورہ دیا اور یہ بھی یقین دلایا کہ وہ لطیف کی ہر طرح سے مدد کریں گے۔

جب راشد کی حالت میں خاطر خواہ افاقہ نہیں ہوا تو علی اکبر خاں راشد کو پٹنہ لے گئے ایک ہفتہ کے اندر ہی وہ پٹنہ سے لوٹ آئے۔ علی اکبر خاں نہایت پریشان نظر آرہے تھے اب ان کی گفتگو میں پہلی سی خوش مزاجی اور خوش دلی کا کہیں شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ زیادہ تر سوچ میں ڈوبے نظر آتے۔ راشد کا بخار اور درد بدستور چلتا رہا۔ راشد بھی اب فکرمند نظر آتا۔

ایک شام جب لطیف نہایت مایوس حویلی کی سائبان کے ایک کونے میں کھڑا مشرقی اُفق کی جانب خلا میں یونہی دیکھ رہا تھا کہ علی اکبر خاں وہاں آ گئے۔ انہوں نے لطیف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جاوید کی خیریت دریافت کی۔ لطیف سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ اس کی آنکھوں میں بے تحاشا آنسو چلے آئے۔ انہوں نے لطیف کو خاموش پاکر اس کا کندھا تھپتھپایا۔ لطیف نے محسوس کیا کہ خود مالک کا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔ آنسوؤں کے قطرے ان کی آنکھوں میں جھلملا رہے تھے۔ ان کے ہونٹ ایک دوسرے سے بھینچے ہوئے تھے۔ وہ کسی طرح ضبط کر رہے تھے لیکن ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ لطیف نے اپنی ساری قوت گویائی یکجا کر کے دریافت کیا "حضور! چھوٹے صاحب کیسے ہیں؟

اکبر علی خاں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ لطیف کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کن الفاظ

سے انہیں تسلی و تشفی دے ۔ کیسے ڈھارس بندھائے ۔ مالک نے لطیف کو سینے سے لگاتے ہوئے سرگوشی میں کہا "راشد خون کی سرطان میں مبتلا ہے ۔ اس بات کو کسی سے ہرگز نہ کہنا۔ میں نے یہ بات اس کی ماں سے بھی راز رکھا ہے ۔ میں اسے علاج کے لیے بمبئی لے جا رہا ہوں"

"خدا انہیں اپنے حبیبؐ کے صدقے میں صحت کلی عطا کرے"

لطیف نے کسی طرح یہ الفاظ ادا کئے ۔

لطیف کمرہ میں آیا تو جاوید نے تکیہ سے سر اٹھاتے ہوئے دریافت کیا "راشد کیسا ہے ؟ اس کے والد پٹنہ سے واپس آئے یا نہیں ؟

"راشد رو بصحت ہے" لطیف نے مصلحتاً جھوٹ کا سہارا لیا ۔

جاوید کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا ۔ اس کے جسم میں ایک نئی زندگی سی دوڑ گئی ۔ وہ بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا ۔ وہ راشد سے جا کر ملنا چاہتا تھا ۔ لطیف نے اسے سمجھایا " اب کافی رات بیت چکی ہے ۔ وہ لوگ سفر سے تھکے تھے اور اب تک سو چکے ہوں گے ۔ اس وقت ان سے ملنا ٹھیک نہیں ہے ۔

جاوید تجسس بھری نگاہوں سے اپنے باپ کا چہرہ دیکھنے لگا ۔ اس نے آخر مفاہمت کا راستہ اختیار کیا " ٹھیک ہے کل صبح مل لوں گا ۔"

دوسرے دن پو پھٹنے کے پہلے راشد اور راشد کے والد بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے ۔ جاوید وہاں سے مایوس لوٹا تو وہ خاموش رہ کر اپنے باپ کا چہرہ دیکھتا رہا ۔ اس کی نگاہیں سوال کر رہی تھیں ـــــ مجھ سے جھوٹ کیوں کہا گیا ؟ مجھے ملنے کیوں نہیں دیا ؟

اب لطیف خود اپنی نظر میں ذلیل ہو رہا تھا ۔ اس کے پاس بیٹے سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی جرأت نہیں تھی ۔ چونکہ لطیف کا مالک باہر گیا ہوا تھا اور مالکن بھی بیٹے اور شوہر کی آمد و رفت سے پریشان تھیں اس لیے وہ بھی عجیب کشمکش میں تھیں ۔ اسی حالت میں دوسرے کام کی کسے فکر تھی ؟ نتیجہ یہ تھا کہ لطیف کے پاس بھی کوئی کام نہیں تھا ۔ وہ دن رات بیٹھا سوچتا رہتا ۔

ادھر جاوید بھی اپنے کو بالکل تنہا محسوس کرتا ۔ وہ اپنے باپ سے پہلے کی طرح کھل کر دل کی باتیں نہیں کرتا ۔ وہ اپنی صحت کے لیے بہت کوشاں نظر نہیں آتا تھا ۔ باپ دوا لا کر دیتا تو وہ نہایت بے فکری کے ساتھ دوا کو ایک طرف رکھ دیتا ۔ لطیف کو اسے ڈاکٹر

کے پاس لے جانے کے لیے کافی خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ ڈاکٹر نے خون پیشاب وغیرہ کی جانچ کے بعد انکشاف کیا کہ جاوید کو کینسر ہے۔

لطیف کو محسوس ہوا جیسے سیال کھولتا ہوا شیشہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا گیا ہو۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔ پھر اسے ہوش آیا کہ اس کی یہی حالت رہی تو جاوید کو بھی شک ہو جائے گا۔ باپ بیٹے دونوں گھر لوٹے۔ لطیف ہر ممکن کوشش کر رہا تھا کہ اس کے چہرے، اس کی کسی حرکت سے جاوید کو اس کی ذہنی پریشانی اندرونی کرب کا پتہ نہ چلے۔ جاوید کو مرض کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا تھا لیکن وہ اتنا ضرور محسوس کر رہا تھا وہ لاعلاج مریض ہے۔

اب لطیف کے سامنے ایک ہی امید کی کرن تھی۔ اگر راشد صحتیاب ہو کر آگیا تو اس کا مالک جاوید کے لیے بھی کوئی صورت حال پیدا کرے گا کیونکہ مالک ہمیشہ اس پر مہربان رہا ہے۔

جاوید دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ لطیف نے ڈاکٹروں کے علاج کے ساتھ دعا، تعویذ اور جھاڑ پھونک کرنے والوں کی جانب بھی رجوع کیا۔ لیکن اسے سارے لوگ بھی فریب کے پتلے ہی ثابت ہوئے اور جاوید کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ لطیف نے جو رقم بچا کر رکھی تھی ساری ختم ہو گئی۔ وہ اب کنگال ہو چکا تھا۔ اب لطیف دن رات دعائیں کرتا اور قسمت پر قانع ہو گیا تھا۔ معذور اور مجبور کی آخری پناہ گاہ قسمت ہوتی ہے

قریب تین ہفتوں کے بعد راشد اور اس کے والد بمبئی سے لوٹ آئے۔ وہاں ڈاکٹروں نے انگلینڈ جا کر علاج کروانے کا مشورہ دیا۔ جب جاوید کو راشد کے بمبئی سے لوٹنے کی اطلاع ملی تو اس نے ایک بار پھر بڑی بے چینی سے دریافت کیا۔

"راشد کیسا ہے؟ کیا آپ اسے مجھ سے ملنے کو کہیں گے؟ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو مجھے ان کے پاس لے چلیے۔"

جاوید اب ایک مٹھی ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ راشد کی حالت بھی اس سے کچھ بہتر نہیں تھی۔ لطیف کے پاس اتنی ہمت کہاں تھی کہ وہ راشد کو آکر ملنے کی بات مالک سے کرتا یا یہ بھی اچھا نہیں تھا کہ وہ اپنے مریض بیٹے کو ان کے پاس لے جائے۔ بمبئی سے لوٹ کر لطیف کے مالک نے کبھی جاوید کے بارے میں دریافت نہیں کیا تھا۔ بات بھی

تھی کہ انہیں خود ہوش نہیں تھا وہ دوسروں کی کیا خبر لیتے؟

مالک نے کوئی ایک ہفتے کی بھاگ دوڑ کے بعد پاسپورٹ اور ویزا حاصل کیا اور انگلینڈ کے لیے روانہ ہو گئے۔

ادھر لطیف کے دل کے ننھا نخانے میں رشک وحسد کا بیج اُگنے لگا تھا کیونکہ اس کے مقدر بس محض ایک تماشائی بننا تحریر تھا۔ جاوید اکثر و بیشتر ضد کرتا کہ وہ راشد سے ملے گا۔ آخر تنگ آکر لطیف نے ایک دن سارا ماجرا اپنے بیٹے سے بیان کر دیا لطیف کے پاس جاوید کے شکوک کو اور بھی پروان چڑھانے کی ہمت نہیں تھی۔ جاوید نے سارا حال غور سے سنا۔ وہ ذرہ برابر پریشان نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان وسکون تھا۔ راشد کے والد کی تگ ودو اور ان کی ناکامیابی نے جاوید کو یاس وحرماں نصیبی کے گہرے غار میں دھکیل دیا تھا۔ نشاط وغم نے اپنا وجود کھو دیا تھا کیونکہ ـــــــ

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

جاوید میں ایک عجیب تبدیلی رونما ہو رہی تھی وہ اب ہر وقت خوش وخرم نظر آتا تھا۔ اپنی بیماری کا رونا رونے یا اپنی تکلیف کا شکوہ کرنے کے بدلے وہ اپنے باپ کو تسلی دیتا۔ "انسان کو حقیقت کا سامنا جوانمردی سے کرنا چاہیے۔ اب جو کچھ قسمت کا لکھا ہے اسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ آپ نے دیکھا کہ راشد کے والد نے اب تک ہر ممکن کوشش کی اور ناکامیاب رہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اس بار کامیاب ہو کر لوٹیں گے؟"

ٹھیک ایک مہینہ بعد راشد اور اس کے والد انگلینڈ سے بھی مایوس ہو کر لوٹ آئے لطیف کو یہ خبر جیسے ہی ملی اس نے فوراً اپنے بیٹے کو اطلاع دے دی۔ حقیقت یہ تھی کہ لطیف کو اپنے مالک کی ناکامیابی سے ایک تقویت سی مل رہی تھی۔ جاوید کا چہرہ بھی یہ خبر سن کر کھل اٹھا کیونکہ اس کا قیاس صحیح نکلا تھا۔

کئی دنوں تک لوگ راشد کو دیکھنے اور اس کے والد کو تسلی وتشفی دینے کے لیے آتے رہے۔ کچھ دنوں کے بعد اسے لوگوں کی تعداد گھٹنے لگی۔ اب لطیف دن میں کئی بار مالک کے پاس جاتا اور شام میں بیٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتا اور راشد کی صحت کی

دعا مانگتا۔ جب وہ اپنے کمرہ میں لوٹتا تو ساری روئیداد جاوید کو سناتا جاوید نہایت دلچسپی سے ان کی باتیں سنتا اور اپنا غم بھول سا جاتا۔

لطیف اپنے بیٹے کی حالت دیکھتا تو نہایت غمگین ہو جاتا۔ لیکن وہ فوراً راشد کی حالت یاد کرتا اور اپنی قسمت پر قانع ہو جاتا۔ جب وہ مالک کے گھر سے لوٹتا تو خود کو مضبوط اور مطمئن محسوس کرتا لطیف کبھی کبھی رات بھر جاگتا لیکن جیسے ہی وہ مالک کی رات کی پریشانیوں کا حال سنتا۔ اس کی مایوسی۔ اس کی خوشی میں بدل جاتی۔ لطیف اپنے مالک کو تسلی و تشفی کے کلمات کہتا لیکن وہ جانتا تھا یہ محض الفاظ ہوتے۔ اس میں خلوص و ہمدردی کا جذبہ نہیں ہوتا۔ جن دنوں مالک اپنے بیٹے کی علاج میں کوشاں تھا لطیف اپنے کو کوستا۔ کاش اس کے پاس بھی روپے ہوتے۔

لیکن ایک دن جب لطیف نے اپنے مالک اور راشد کو حویلی سے غائب پایا تو اسے عجیب سا غم ستانے لگا۔ وہ ہر طرح پتہ چلانے کی کوشش کرتا کہ آخر وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟ وہ مالکن سے سیدھے تو نہیں لیکن گھما پھرا کر ایسے سوال کرتا کہ مالکن راز فاش کر دے۔ مالکن لطیف کے کسی سوال کا جواب نہیں دیتی اور اس کے چہرے پر ناگواری ہوتی۔

کوئی ایک ہفتہ بعد لطیف نے جو کچھ دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ راشد بالکل بھلا چنگا ہو کر لوٹا تھا۔ اس کے رخسار دمک رہے تھے اور آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ پر سحر کن مسکراہٹ تھی۔ اس دن جب وہ مالک کے گھر سے اپنے کمرہ کی جانب آرہا تھا اس کے قدم بہکے تھے۔ جاوید کا خشک چہرہ آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا "میں جاوید کا باپ ہونے کا حقدار نہیں!"

رات میں مالک نے شاندار میلاد شریف کا اہتمام کیا۔ میلاد کے بعد مٹھائی تقسیم کی گئی۔ مالک نے مٹھائی کی ایک پاکٹ لطیف کی جانب بڑھانے کے بعد لطیف کے چہرے پر نظریں جما دیں جیسے وہ پوچھ رہا ہو کیا جاوید اب بھی زندہ ہے؟ لطیف ان سوالوں کی تاب نہ لاسکا۔ مالک کا ہاتھ اب بھی مٹھائی کے ٹرے میں تھا۔ شاید وہ کشمکش و پیچ میں تھا۔ لطیف وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے کمرہ کی جانب بڑھنے لگا۔ کمرہ جیسے نظروں کے سامنے آیا تھا کہ اس نے سوچا "میں جاوید کو کیا کہوں گا؟ مٹھائی کس خوشی کی۔ اس کے دل میں آیا وہ مٹھائی پھینک دے۔ ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اس نے دیکھا کہ اس کے کمرے کا دروازہ

کھلا۔ لالٹین بجھ گئی تھی۔ کمرے میں ہوا کا ایک تیز جھونکا در آیا تھا۔ وہ دوڑ کر کمرہ میں داخل ہوا۔
اور لالٹین جلائی۔ اس نے جاوید کی جانب دیکھا۔ جاوید کی آنکھیں کھلی تھیں، جیسے محوِ انتظار
ہوں۔ لیکن ہونٹ ایک دوسرے سے چسپاں تھے۔ اس کا جسم سرد تھا اس کی بے نور آنکھوں
میں سوال منڈلا رہے تھے لیکن ہونٹ ساکت وجامد تھے۔ لطیف نے غور سے
دیکھا اور اسے سکون محسوس ہوا ——— اب یہ ہونٹ مجھے اپنے سوالوں سے
پریشان نہیں کریں گے۔ مجھے ان کا جواب دینا نہیں پڑے گا۔ یہ آنکھیں مجھے مشکوک
نگاہوں سے نہیں دیکھیں گی۔ مجھے اپنا چہرہ چھپانا نہیں پڑے گا۔"

دلیپ سنگھ
۵۹ راجندر نگر نئی دلی

ہائی کو

جب سے اردو کے سنجیدہ شاعروں نے جاپان کی صنف شاعری "ہائی کو" سے آگاہی پائی ہے وہ اپنے خیالات کے دھاروں کو ہائی کو کے جامے میں لپیٹنے کی کوشش میں جُٹ گئے ہیں پتہ نہیں کیوں مزاح اور طنز نگاروں کا دھیان ابھی تک اِس طرف نہیں گیا۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ یہ طوقِ جاپانی مجھے ہی اپنے گلے میں ڈالنا ہوگا، میں ہائی کو، کے کچھ نمونے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

۱

ایک مصرعے کی لٹکتی تین ٹانگیں دیکھ کر
میں نے پوچھا کیا ہوا، کہنے لگا
ہائی کو

۲

چاہتا ہوں میرے کہنے پر چلے
کار چلتی ہے مگر
پٹرول سے

۳

دوستوں سے مل کے لوٹا
تو بہت حیران تھا
جیب میں بٹوا نہ تھا

۴

وہ رقم جو مجھ کو پہلی کو ملی
آج دسویں ہے
کدھر رخصت ہوئی ؟

۵

تیرے والد نے مجھے کوٹھی نہ دی
میں نے منگنی توڑ دی تو بول
دھوکہ کس کی جانب سے ہوا

۶

وہ میری ہر بات کو
اُلٹ کر کرتی ہے استعمال
میرے ہی خلاف

۷

تم سناؤ آٹھ غزلیں
ہم فقط اک ہائی کو ؟
کا ہی کو ؟

ادب کے سُراغ رساں

اُردو میں بھلے ہی پڑھنے والوں کی تعداد میں دن بدن کمی ہو رہی ہو۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اُردو ادب میں ریسرچ خوب ہو رہی ہے۔ مجھے کل ہی ایک پروفیسر بتا رہے تھے کہ ڈاکٹر اقبال نے شاید اتنے شعر نہیں لکھے جتنی ڈگریاں لوگوں نے ان پر ریسرچ کرکے لی ہیں۔ میں نے جب پوچھا کہ آپ نے لفظ "شاید" کیوں استعمال کیا تو کہنے لگے "ابھی میں اس موضوع پر ریسرچ کر رہا ہوں۔ اور جب تک میری ریسرچ مکمل نہ ہو جائے میں کوئی فیصلہ کُن رائے نہیں دے سکتا" انھوں نے مجھ سے یہ بھی گذارش کی کہ میری ریسرچ کے موضوع کو صیغۂ راز میں رکھیے گا۔ کیونکہ میں یہ نہیں چاہتا کہ کوئی میرا موضوع ہی لے اُڑے اور میں منہ دیکھتا رہ جاؤں۔

میرے خیال میں وہ خواہ مخواہ ڈر رہے تھے۔ اگر کوئی یہ موضوع لے بھی اڑا تو گھبرانے کی بات نہیں۔ اُردو میں ابھی ریسرچ کے سینکڑوں موضوع ریسرچرز کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ مثلاً ابھی تک یہ طے نہیں ہو پایا کہ اقبال کو رائتہ پسند تھا یا کھیر۔ غالب کے معاشقوں کے سلسلے میں صرف ایک ڈومنی پر ریسرچ کی گئی ہے باقی اور ڈومنیاں بھی تو ہوں گی جن کے ہاں ان کے پھیرے ہوتے تھے۔ اور جو ابھی تک زیر بحث یا زیر ریسرچ نہیں لائی گئیں۔

میرے خیال میں ریسرچ کے سلسلے میں اردو ادب ایک ایسا کنواں ہے جس کا مستقبل قریب میں سوکھنے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ خود ریسرچرز جب کسی موضوع پر ریسرچ کرتے ہیں تو اپنی تھیس کے آخر میں اس بات کا انتظام کر جاتے ہیں کہ ان کی اولاد بھی اسی موضوع پر کام کر کے ڈگریاں کماتی رہے۔ آپ نے ریسرچ کی کتابوں کے آخر میں یہ جملہ پڑھا ہوگا کہ "میری ریسرچ حرفِ آخر نہیں ہے۔ میں نے تو بس بحث کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ ایک طرح کی دعوت

ہے۔ یارانِ نقطہ داں کے لیے کہ وہ اب اِس پر کام کریں۔ گویا انھوں نے غالب کے معاشقوں کی ایک ڈومنی دکھادی ہے۔ باقی ڈومنیوں کو تلاش کرنا آنے والی نسلوں کے سراغ رسانوں کا کام ہے۔

ہمارے ریسرچرز یوں بھی بڑے کنجوس واقع ہوئے ہیں۔ جب بھی کوئی موضوع چُنتے ہیں تو عام طور پر اس کے ذرا سے حصے پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ ہمارے عرب دوستوں کی طرح نہیں کہ زمین میں تیل مل گیا تو دھڑا دھڑ نکال کر بیچنا شروع کردیا۔ اور اس طرح جو روپے ہاتھ لگے ان سے دھڑا دھڑ شادیاں کرنی شروع کردیں۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اِن شادیوں سے جو اولاد ہوگی وہ کیا نہ بیچ کر کھائے گی۔ ہمارے ریسرچرز اس معاملے میں بڑے سمجھدار واقع ہوئے ہیں۔ وہ اگر مزاح نگاروں پر تھیسِس لکھنا چاہتے ہیں۔ تو کبھی یہ موضوع نہیں چنیں گے کہ اردو ادب کے مزاح نگار" بلکہ موضوع کا انتخاب یوں ہوگا: "دلی میں جمنا پار کے اردو مزاح نگار" یعنی ایک بڑے دسترخواں سے کباب کا صرف ایک ٹکڑا اٹھالیا اور بس۔ اس طرح ہزاروں لاکھوں لوگوں کا پیٹ بھر سکتا ہے۔ گویا ہندوستان میں جتنے شہر ہیں وہاں کے مزاح نگاروں پر ایک ایک تھیسِس لکھا جاسکتا ہے۔ اور بالغرض کسی شہر میں کوئی مزاح نگار نہیں ہے تو تھیسِس میں یہ بھی تو ثابت کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کا یہ واحد ایک ایسا شہر ہے۔ جو مزاح نگاری کے نقطۂ نظر سے ویران ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ریسرچ کی بہت سی کتابوں کا موضوع کسی ادیب کا فن اور شخصیت ہوتی ہے۔ ہم نے ریسرچ کر کے یہ جاننے کی کوشش کی کہ ایسا کیوں ہے۔ تو پتہ چلا کہ ایسی ریسرچ کا موضوع عام طور پر ادیب کا فرزندِ ارجمند چُنتا ہے۔ اسے آسانی یہ رہتی ہے کہ اس نے اپنے والد کو کھاتے پیتے اٹھتے بیٹھتے دیکھا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ آسانی سے لکھ سکتا ہے کہ والد صاحب کو کھچڑی بہت پسند تھی۔ لکھتے وقت آلتی پالتی مار کر بیٹھتے تھے سوتے وقت سرہانے سے پرہیز کرتے تھے۔ والدہ سے بات کرتے وقت کبھی آواز اونچی نہیں کرتے تھے۔ وغیرہ۔ حال ہی میں ہمیں اس نوعیت کی ایک تھیسِس پڑھنے کو ملی۔ شاعر صاحب کے فرزندِ ارجمند نے اِن تمام باتوں پر خوب روشنی ڈالی تھی۔ جن کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ والد صاحب کو کھچڑی کیوں پسند تھی یا والدہ محترمہ سے باتیں کرتے وقت وہ آواز اونچی کیوں نہیں کرتے تھے۔ ہمیں ان کی ریسرچ

میں تشنگی کا احساس ہوا۔ اس لیے خود ہی ریسرچ کے اس میدان میں کود پڑے۔ شاعر مذکور کے پڑوسیوں اور رشتہ داروں سے بات چیت کرنے پر پتہ چلا کہ ادیب کو کھچڑی اس لیے پسند تھی کہ آمدنی اس قدر قلیل تھی کہ کھچڑی کے علاوہ کچھ اور کھانے کا مقدور ہی نہ تھا۔ لہٰذا کھچڑی ان کی پسندیدہ خوراک بن گئی۔ اور والدہ کے سامنے آواز اونچی اس لیے نہیں کرتے تھے کہ اس خاتون کے آگے کوئی بھی آواز اونچی نہیں کرتا تھا۔ کون ایسی عورت کے منہ آئے جس کی زبان کے ذخیرے میں ایسے بے شمار لفظ تھے جن پر نقطے نہیں ہوتے

ریسرچ عام طور پر مردہ ادیبوں پر کی جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ بتائی جاتی ہے کہ مردہ ادیب ریسرچر کی تردید کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ وہ ریسرچر پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ "تم نے دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ کس نے تم سے کہہ دیا کہ میں نے آزادی کی جنگ میں قومی نظمیں لکھی تھیں۔ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ وہ تو میری اولاد نے مجاہد آزادی کی اولاد ہونے کے ناطے پنشن لینے کے لیے درخواست میں لکھ دیا تھا۔ اور درخواست کے ساتھ جو نظمیں منسلک تھیں وہ میرے بیٹے نے دس روپے فی نظم کے حساب سے ایک زندہ شاعر سے لکھوائیں تھیں۔

جس ادیب پر ریسرچ کی جا رہی ہے اس کی تاریخ پیدائش کے متعلق ایک باب آسانی سے لکھا جا سکتا ہے۔ ہمارے اس ملک میں جہاں لوگوں کی اتنی اولاد ہوتی ہے کہ ان کی گنتی مشکل ہو جاتی ہے۔ ہر بچے کی تاریخ پیدائش یاد رکھنا کہاں ممکن ہے۔ تاریخ پیدائش معلوم نہ ہونے کی وجہ سے قیاس آرائیوں میں دس بارہ صفحے تو آسانی سے نکل جاتے ہیں۔ میں نے خود ایک دفعہ اپنی والدہ سے اپنی صحیح تاریخ پیدائش جاننے کی کوشش کی تھی۔ کہنے لگیں "تاریخ تو مجھے یاد نہیں ہاں اتنا یاد ہے کہ اس دن بہت بارش ہوئی تھی اور گلیوں میں گھٹنے گھٹنے پانی تھا۔ دائی ہمارے گھر میں تمہارے پیدا ہونے کے بعد پہنچی تھی۔ پھر کہنے لگیں۔ تمہاری موسی کو شاید معلوم ہو کہ وہ ان دنوں میرے ہاں آئی ہوئی تھی۔ اگر تم چاہو تو موسی کو خط لکھ کر پوچھ لو"۔ میں نے کہا رہنے دو ماں۔ کیوں کسی ریسرچر کے پیٹ پر لات ماری ؟۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ زندہ ادیبوں پر ریسرچ کرنے سے ریسرچر عام طور پر گھبراتے ہیں۔ میں اس غلط بیانی کی معافی چاہتا ہوں۔ مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ بہت سے زندہ

ادیبوں پر نہ صرف ریسرچ کی جارہی ہے بلکہ ہوچکی ہے اور وہ ادیب اپنی بغل میں اپنا دیوان یا افسانوں کے مجموعے لے کر پھرنے کی بجائے اپنے ریسرچر کی تھیسس لے کر پھرتے ہیں۔ اور کہتے ہوئے سُنے گئے ہیں کہ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ہماری زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کی چھان بین کرتے ہوئے لوگ ڈاکٹر بن گئے ہیں۔ اور ہمیں اپنے علاج کے لیے ڈاکٹر کی فیس تک میسر نہیں۔

مضمون کو ختم کرنے سے پہلے میں ریسرچ کرنے والے طالب علموں کو ایک وارننگ دینا چاہتا ہوں۔ ہمارے شاعر حضرات کہتے ضرور ہیں کہ میری زندگی کی مکمل تصویر میرے اشعار میں ہے۔ لیکن یہ بات ان کی تاریخ پیدائش کی طرح قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ غالبؔ نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے کہ

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

ہو سکتا ہے یہ شعر پڑھنے کے بعد کوئی ریسرچر ان تصاویر اور ان خطوط کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ اس لیے میں یہ بات صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ ایسا کوئی سامان ان کے گھر سے نہیں نکلا تھا۔ اپنی بات کے ثبوت میں میں دو باتیں کہنا چاہوں گا۔ ایک تو یہ کہ کوئی بھی ذمہ دار ہندوستانی شوہر، شاعر یا غیر شاعر ایسی چیزیں اپنے گھر میں رکھتے ہی نہیں کیونکہ بیوی کے ہتھے چڑھ جائیں تو سب شاعری وائری بھلا دے گی اور دوسری بات یہ ہے کہ غالبؔ کے مرنے کے بعد غالبؔ کے گھر سے اس کا صرف جنازہ نکلا تھا اور کچھ نہیں۔

حرف و حکایت

لاس اینجلز میں ایک شب کو کسی تقریب میں ہزاروں افراد جمع تھے۔ یہ اجتماع ایک وسیع ہال میں ہو رہا تھا۔ ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اچانک اسٹیج سے اعلان ہوا ــ" بھائیو! تھوڑی دیر کے لئے روشنی گُل کی جا رہی ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں"

اعلان ہونے کے فوراً بعد روشنیاں گُل ہوگئیں۔ سارا ہال اندھیرے میں ڈوب گیا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ پھر اسٹیج پر ایک دیا سلائی جلی کسی نے کہا:۔

"جو لوگ اس روشنی کو دیکھ رہے ہوں، وہ پکار کر کہیں کہ ہاں ہم اس روشنی کو دیکھ رہے ہیں تــ ہال اس جملے کی گونج سے بھر گیا۔

جب ہی لاؤڈ اسپیکر پر آواز آئی:ــ" برائی کی اس دنیا میں نیکی کا کوئی کام کتنا ہی چھوٹا ہو، اسی طرح چمکتا ہے"

اب آپ اپنی اپنی دیا سلائیوں سے ایک ایک تیلی روشن کریں۔

ہال میں سیکڑوں آدمی بیٹھے تھے۔ جن میں ایک کثیر تعداد نے دیا سلائی کی تیلیاں روشن کیں سارا ہال روشن ہوگیا۔ اندھیرا چھٹ گیا اور ہال میں روشنی کا سیلاب آگیا۔

اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ اگر ہر آدمی اپنی جگہ نیکی کی ایک چھوٹی سی تیلی روشن کر دے تو نیکی کا سیلاب آسکتا ہے۔ شاید یہی بات ہے جو ایک چینی محاورے میں کہی گئی ہے کہ" تاریکی کو کوسنے سے بہتر ہے کہ آپ اپنا دیا جلا لیں"

بشکریہ ماہنامہ دارالسلام، مالیر کوٹلہ

فکر تونسوی

بلا عنوان

میرے ایک دوست ہیں بلراج ورما. سرکاری افسر ہونے کے باوجود مہذب آدمی ہیں، یہ ان کی ٹریجڈی ہے۔ مگر ان کی ایک ٹریجڈی اور بھی ہے کہ وہ بیک وقت ذہین بھی ہیں اور بیوقوف بھی. ان کی ذہانت سرکار کو اور بے وقوفی مجھے پسند آ گئی اس لیے انہیں ہم جنس سمجھ کر میں نے دوست بنا لیا۔

پرسوں سپر بازار کی لفٹ پر جاتے ہوئے ان کے ڈیڑھ سو روپے گم ہو گئے. سپر بازار چونکہ سرکاری ادارہ ہے اس لیے وہاں سستی چیزیں اور جیب کترے دونوں ملتے ہیں. اس بازار کا اصول یہ ہے کہ آپ سستی چیزیں لے کر جتنی رقم بچائیں گے، اتنی جیب کترے لے جائیں گے. اسی لیے سپر بازار میں سستا بار بار روتا ہے۔

جیب کتروں کو معلوم ہے کہ صرف وہی آدمی سپر بازار کی لفٹ میں سوار ہوگا جس کی جیب میں پیسے ہوں گے۔ جیب کتروں کو شکایت ہے کہ فکر تونسوی کو سپر بازار میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ سالا پھوکٹ آدمی ہے. ایک بار جیب میں کھوٹی اٹھنی لے کر سپر بازار کی کینٹین میں چلا گیا تھا۔ وہاں اسے سستی چائے پینے کا لالچ تھا۔ نتیجہ یہ کہ نہ کینٹین والے کو خوش کر سکا اور نہ جیب کتروں کو ۔ سالم کھوٹی اٹھنی بچا کر واپس لے گیا۔

لیکن بلراج ورما کے پاس کوئی کھوٹی اٹھنی نہیں تھی بلکہ کھرا ڈیڑھ سو روپیہ تھا، جو گم ہو گیا. جیب کترے نے اسے سستی چیزیں خریدنے کی مہلت بھی نہ دی، شاید اسے جلدی تھی، کچھ اور جیبیں کاٹنا تھیں۔ میں نے قریب قریب ماتم پرسی کے لہجے میں کہا: "یار! بڑا افسوس ہے اور یہ افسوس اس لیے بھی جینوئن ہے کہ تمہارے افسر ہونے کے باوجود وہ رشوت کے پیسے نہیں تھے۔

وہ بولا: "مگر میں تو انتہائی خوش ہوں"

"یعنی اگر گم نہ ہوتے تو تمہیں ذہنی تکلیف ہوتی؟"
"تم اُلّو ہو۔"
"ہاں، ورنہ تمہارا دوست کیسے بنتا؟"
"سمجھے نہیں! مجھے خوشی یہ ہے کہ ڈھائی سو روپے گم نہیں ہوئے، صرف ڈیڑھ سو روپے گم ہوئے، ایک سو روپیہ سالم بچ گیا۔ جب میں گھر سے چلنے لگا تو سو روپے میری جیب میں تھے، اتنے میں ایک رشتے دار آ گئے اور ایک سو روپیہ مانگ کر لے گئے، ورنہ ڈھائی سو کے ڈھائی سو چلے جاتے۔ چلو، ایک سو روپیہ بچ جانے کی خوشی میں تمہیں کافی پلادوں۔"

کافی پینے کے دوران باتوں باتوں میں انکشاف ہوا کہ وہ رشتے دار قرضہ واپس کرنے کو رشتے داری نہیں سمجھتا، اور ورما صاحب رشتے داروں سے قرضہ واپس مانگنے کو رشتے داری نہیں سمجھتے۔ میں نے جی ہی جی میں کہا، تو پیارے! سمجھ لو، یہ ایک سو روپے بھی تمہاری جیب سے ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔ جیب کترے صرف بھرے بازار میں نہیں ملتے، رشتے داروں میں بھی مل جاتے ہیں۔

لیکن کافی پینے کے بعد ان کا ہاتھ ایک دم پتلون کی جیب پر چلا گیا۔ میں نے پوچھا یہ کیا حرکت ہے؟

وہ بولے: "مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ وہ ڈیڑھ سو روپے گم ہو گئے ہیں۔ سوچتا ہوں، شاید اب بھی وہ بٹوا جیب میں پڑا ہو، وہ میری ایمان کی کمائی تھی۔"

میں نے کہا۔ "ورما! اس لوٹ کھسوٹ کے نظام کا اصول یہ ہے کہ ایمان کی کمائی گھٹتی ہے بے ایمانی کی کمائی بڑھتی ہے۔"

لیکن ورما کی ٹریجڈی یہ تھی کہ وہ دنیا کے کسی آدمی کو بے ایمان نہیں سمجھتا۔ ہر پانچ منٹ بعد اس کا ہاتھ پھر جیب کی طرف چلا جاتا، ناکام لوٹ آتا تو پتلون کی دوسری جیبوں کی طرف چلا جاتا۔ میرا خیال ہے وہ ہفتہ بھر تک ان بے گناہ خالی جیبوں کو ٹٹولتا رہے گا۔ حتیٰ کہ ان پتلونوں کی جیبوں کی تلاشی بھی لے گا جو الماری میں پڑی ہوں گی۔ بیوی سے جا کر پوچھے گا، ڈارلنگ! وہ بٹوہ غلطی سے تمہیں تو نہیں دے گیا تھا؟ لگتا ہے، میں نے بٹوے کی بجائے ٹیلیفون نمبروں والی ڈائری جیب میں ڈال لی تھی۔ اوں ہوں! میرا مطلب ہے تم بھی تو کبھی کبھی مجھ سے مذاق کر لیتی ہو ذرا منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے۔ شاید کپڑے بدلتے وقت بٹوا

نکال کر یہاں میز پر رکھ دیا ہوگا تم ذرا میز کے نیچے نظر ڈالو کہیں گر نہ پڑا ہو ——— ہر دس منٹ بعد الماری کھول کر دیکھے گا اور ہر بار اسے انشورنس والی فائل ہی ملے گی. چارپائی سرہانے کے نیچے باتھ روم میں ——— گھر کے چوہوں کا کیا رول رہا ہے. کیا ہمارے گھر میں پڑوسی کے چوہے بھی آجاتے ہیں. پڑوسن سے تمہارے سوشل تعلقات کیسے ہیں؟ ان کی بلی کے ساتھ تو ہماری بہن فرینڈ شپ ہے. بڑوہ وہ تو نہیں لے گئے ہوں گے.

مگر نہیں، گم شدہ ڈیڑھ سو روپے کہیں بھی نہیں ملتے. پولس میں رپورٹ کی جائے. وہاں بھی نہیں ملتے. کیونکہ سنا ہے وہاں تھانیدار اور جیب کترے مل کر آپس میں بانٹ لیتے ہیں. تھانے میں تو صرف ضمنی رپورٹ کے چند الفاظ باقی رہ جاتے ہیں. پڑوسیوں اور دوستوں سے اس گم شدگی کا ذکر کیا تو ایک پڑوسی نے اظہار ہمدردی کی بجائے اپنا ایک قصہ ورما صاحب کے حلق میں انڈیل دیا کہ ایک بار میرے ساڑھے چار سو روپے گم ہو گئے تھے. دوسرے پڑوسی نے بتایا کہ میں نے تو جیب میں پیسے رکھنا ہی چھوڑ دیئے ہیں، جیب میں تو صرف ہاؤس ٹیکس کے نوٹس رکھتا ہوں یا بزاز کے بل۔"

"اور میں؟" تیسرے پڑوسی نے سنایا "میرا تو ایک مرتبہ سنہری پین گم ہو گیا تھا جو میں نے جاپان سے خریدا تھا، ساڑھے پانچ سو روپے میں خریدا تھا۔"

"ساڑھے پانچ سو؟" ورما صاحب نے سکھ کا سانس لیا. تو کیا وہ نہیں ملا تھا؟"

مل گیا مگر ڈیڑھ سال بعد. میرے اس کوٹ کی پھٹی ہوئی جیب کی دہری تہہ میں پھنسا ہوا تھا، جو پرانے کپڑوں کے بدلے نئے برتن خریدنے کے لیے میری بیوی نے اسٹور میں پھینک دیئے تھے. لیکن کیا فائدہ جی؟ میں نے اس گم شدگی کے بعد قسم کھالی کہ آئندہ صرف چالیس پیسے والا گھٹیا پین ہی استعمال کیا کروں گا.

اس پر مجھے یاد آگیا کہ ایک وکیل صاحب کا لڑکا گم ہو گیا تھا. بالکل سنہری پین ایسا لڑکا تھا. شاید سادھو بننے کے لیے نکل گیا تھا یا بمبئی میں فلم ہیرو بننے کے لیے. تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملا تو وکیل صاحب اپنے دوسرے بیٹے سے پیار کرنے لگے جو نالائق تھا اور بالکل چالیس پیسے والا گھٹیا پین لگتا تھا اور وہ گھٹیا پین پر گذارا کرنے لگے. لیکن ڈیڑھ سال بعد گم شدہ لڑکا گھر آگیا اور وکیل صاحب . . . ."

میں نے ورما صاحب سے کہا: "تم بھی ڈیڑھ سال تک انتظار کرو. گمشدہ ڈیڑھ سو روپے

اسٹور میں ہی کہیں پھنسے ہوں گے۔

لیکن وہ شاید ڈیڑھ سال تک انتظار نہیں کر سکے. بھاگے بھاگے گئے ۔اسٹور کی ایک ایک چیز ٹٹولی تو ایک پرانی بالٹی کے پیندے میں وہ طلائی انگوٹھی مل گئی جو ڈیڑھ سال پہلے باتھ روم میں گم ہو گئی تھی۔

بلراج ورما

کال چکر

(ٹی وی سٹار جوائے شری اروڑہ کی نذر)

رانی ۔ ہیلو راجو

راجو ۔ او ۔ ہیلو

رانی ۔ تم نے مجھے پہچانا نہیں ۔

راجو ۔ تم ــــ تم ــــ رانی ــــ تم رانی ــــ رانو ہی ہو نہ ؟

رانی ۔ مجھے ۔ یوں ۔ اس طرح زندہ دیکھ کر تمہیں حیرت ہو رہی ہے نا !

راجو ۔ حیرت تو ظاہر ہے کہ ہو ہی رہی ہے مگر زندہ دیکھ کر نہیں ۔ حیرت ہو رہی ہے تمہارے اس بھرے بھرے گدرائے بدن کو دیکھ کر ۔ اس نئے انوکھے رنگ روپ کو دیکھ کر ۔ اس قیمتی لباس اور اسے پہننے کے اس غیر معمولی سلیقہ کو دیکھ کر ــــ کہاں وہ غریب رانو ــــ

رانی ۔ اور کہاں یہ رانی ۔ تم اپنی رانو کو زندہ دفن کر کے بھاگ گئے تھے مگر رانی کو نہیں ۔ رانی ابھی زندہ ہے ــــ

راجو ۔ مجھے واقعی تعجب ہو رہا ہے ــــ یہ انقلاب ہے ــــ

رانی ۔ جسے تم زندہ باد نہ کہو گے ۔

راجو ۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ــــ پانچ سال کا وقفہ ــــ پانچ سال میں اس قسم کی تبدیلی انقلابی ضرور

ہے مگر اتنے لمبے عرصے میں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے ــــــ

رانی۔ جو ہو گیا ہے ــــــ

راجو۔ پھر بھی ۔ یہ زیورات ۔ یہ قیمتی پارجات ۔ اٹھنے بیٹھنے کے یہ تیور اور بات کرنے کا یہ حاکمانہ انداز ــــــ

رانی۔ مگر سیٹھ مایا داس کی چہیتی بیوی کے لیے یہ ٹھاٹھ باٹھ کوئی ایسا زیادہ تو نہیں ــــــ

راجو۔ تو تم نے ــــــ

رانی۔ تمیز سے بات کرو نوجوان یہ تو اور تم کسی اور کے لیے رکھ چھوڑو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔

راجو۔ تو اب مجھے اپنے ہی گھر کی ایک حقیر ملازمہ کی حرامی بیٹی سے آداب سیکھنے ہوں گے ــــــ

رانی۔ (طنزاً) تمہارا گھر یہ تمہارا نہیں، میرا گھر ہے میری ماں جس نے دنیا دیکھی تھی مرتے مرتے مجھے اپنی جگہ سنبھال گئی تھی اور وہ سارے گُر بھی ذہن نشین کرا گئی تھی جو مایا داس جیسے ہوس کے کیڑے کو آسانی سے منہ مانگے داموں بیچ جا سکتے ہیں ــــــ

راجو۔ تو تم نے میرے باپ کو ــــــ بیٹے کے بعد باپ کو ــــــ

رانی۔ تم نے مجھے جو سکھایا تھا میرے کام آیا اور جو ماں نے سکھایا تھا وہ بھی تم نے مجھے ورغلایا تھا میں نے تمہارے باپ کو پھانس لیا۔ اب میں تمہاری ماں بھی ہوں اور تمہارے بیٹے کی بھی جسے تمہارا باپ اپنا بیٹا سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ تمہاری دو بہنیں بھی ہیں۔ بدلے رشتوں کی یہ تصویر تمہارے کند ذہن میں بیٹھی ہے کہ اور تفصیل سے سمجھاؤں ــــــ

راجو۔ میری ماں ــــــ میری اپنی ماں کہاں ہے ــــــ

رانی۔ وہاں اوپر ــــــ اپنے بنانے والے کے پاس ــــــ تمہارے امریکہ چلے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد ــــــ جب اسے میرے اور تمہارے باپ کے نئے تعلقات کے بارے میں پتہ چلا تو بیچاری بڑھیا برداشت نہ کر پائی ــــــ

راجو۔ میری ماں نے خودکشی کر لی تھی۔

رانی۔ وہ خودکشی کر لیتی تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کر پاتی۔ ایک رات اس نے مجھے اپنے شوہر کے بستر میں دیکھا اسی وقت اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی۔ بڑی خوددار عورت تھی تمہاری ماں، مگر اس نے تم جیسے ذلیل پلّے کو جنم دیا۔ کیسے کیسے حادثات سے

بنتی ہے زندگی کی داستان ــــ تمہاری ماں کے مرنے کے بعد ایک ہی مہینے کے اندر اندر ہم نے شادی کر لی۔ پورے ریتی رواج سے ــــ ساری دنیا کے سامنے ــــ تمہارا سماج ــــ تمہاری ساری برادری میرا احترام کرتی ہے۔ تمہارے کارخانوں کے ورکر مجھے رانی ماں کہہ کر بلاتے ہیں ــــ

راجو۔ تم ــــ تم ــــ

رانی۔ پھر وہی تم۔ پورے آٹھ سال امریکہ میں رہ کر بھی تم نے بات کرنے کا سلیقہ نہیں سیکھا۔ تم نے اور بھی کچھ سیکھا ہے کہ نہیں میں نہیں جانتی مگر اس طویل عرصہ میں میں نے تمہارے جیسے درجنوں فارن ریٹرن ملازم رکھ کر جتنا سیکھا اور جان لیا ہے اتنا تم بھی غالباً نہیں جانتے ــــ میری ماں بدقماش تھی، مگر تھی خاصی سمجھدار اس نے رو دھو کر کسی طرح مجھے بارہ جماعتیں پڑھا دی تھیں جو میرے جیسی ذہین لڑکی کے لئے کافی تھیں۔ تمہارا باپ تو چھٹی تک بھی نہیں پڑھا ــــ

راجو۔ جوان بدن کی گندھ میں جو جادو، جو طلسم ہوتا ہے میں اس سے واقف ہوں ــــ

رانی۔ بدن جوان ہو۔ تندرست اور توانا ہو، خوبصورت بھی ہو تو یہ جادو بلند آواز گونجتا ہے ایک خبیث بڈھے پر کیسے اثر انداز نہ ہوتا ــــ

راجو۔ میرا باپ وہ کیمیاگر جو مٹی سے سونا بنانے کے سارے فارمولے جانتا تھا۔

رانی۔ اب ساتھ والے کمرے میں مٹی کا مادھو بنا بیٹھا ہے۔ مفلسی کھانوں اور قیمتی شراب کے علاوہ بھی اب وہ کسی شئے کو جانتا پہچانتا ہے تو وہ میرا بدن ہے۔ میں نے اس کی حکومت سنبھال لی ہے۔ اور اسے ہر قسم کے تفکرات سے آزاد کرا دیا ہے۔ چھینا جھپٹی سے نہیں، اسی کے اصرار پر میں نے اسے جہانگیر بنا کر تخت طاؤس پر بٹھا دیا ہے، اور خود نور جہاں بن کر اس کی انڈسٹریل ایمپائر کو چلانے کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ اب تمہارا آبائی کاروبار وہ نہیں میں چلاتی ہوں۔ لاکھوں کا کاروبار اب کروڑوں کا ہو چلا ہے اور بدستور پھیلتا جا رہا ہے۔

راجو۔ تم بھولتی ہو رانی۔ میرا باپ مجھے کبھی نہیں بھولا۔ جس دریا دلی سے اس نے مجھے امریکہ میں سپورٹ کیا ہے تم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتی ہو۔

رانی۔ (قہقہہ لگا کر) تمہیں روپے باقاعدگی سے پہنچتے رہے مگر تمہارے باپ نے کبھی ایک

خط بھی لکھا تمہیں ؟ تم احمق ہو۔ تم وہاں مزے سے رہو اسی لیے میں تمہیں تمہاری مناسب ضروریات سے تگنے چوگنے روپے بھجواتی رہی۔ تمہیں تو تمہاری ماں کے مرنے کی خبر بھی نہ دی گئی تھی مبادا تم سب چھوڑ چھاڑ کر لوٹ آؤ اور کباب میں ہڈی بن جاؤ۔

راجو۔ حرام زادی!

رانی۔ (قہقہہ لگا کر) تم نے اپنے طور پر مجھے گالی دی ہے، مگر یہ گالی نہیں یہ حقیقت ہے کہ میں حرام کی اولاد ہوں۔ مجھے میری ماں نے میرے باپ کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔ شاید وہ خود بھی نہ جانتی ہو کہ میرا باپ کون تھا۔ مگر میرا حرامی ہونا میری کمزوری نہیں میری اصلی طاقت ہے۔ میرے کردار میں وہ حیا نہیں رہی جو شریف زادیوں کا زیور ہوا کرتی ہے۔ حرامیوں کا کوئی سماج نہیں ہوتا۔ کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ کسی قسم کی مان مریادہ نہیں ہوتی۔ شاید بھگوان بھی نہیں ہوتا۔ میری اپنی نظر میں میرا اپنا کوئی ہے تو وہ میری خبیث روح ہے جو بدشکل اور بدکردار ہوتے ہوئے بھی تندرست اور توانا ہے اور میری محافظ بھی ——

(موسیقی کی دھن۔ تلخی کو نرمی میں بدلنے کے لیے)

راجو۔ تم کتنی بدل گئی ہو۔ تمہارے اس کایا کلپ کا ذمہ دار میں ہوں۔ کبھی تم کتنی سیدھی سادھی، بھولی بھالی تھیں۔

رانی۔ ایک عمر تک ہر انسان سیدھا سادھا اور بھولا بھالا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے تعلقات کے اولین دور میں تم نے میری جانب جب قدم بڑھایا تھا تو اس میں خلوص کی کمی نہ تھی وہ ایک سچے عاشق معشوق کا رشتہ تھا اور میں تمہاری داشتہ نہ تھی تمہاری رانو تھی تمہاری اپنی رانو اس کا ثبوت ہمارا بیٹا ہے، جو جھوٹی واسنا کی نہیں، سچے پیار کی اولاد ہے۔ وہ شکل وصورت سے ہی نہیں سیرت سے بھی فرشتوں کی اولاد لگتا ہے۔

راجو۔ کیا نام رکھا ہے۔

رانی۔ نام تو تم نے ہی تجویز کیا تھا۔

راجو۔ ارے ہاں یاد آیا۔ میں نے تمہارے پیٹ کو سہلاتے ہوئے کہا تھا۔ تو غم نہ کھا رانو۔

میرا پیار سچا ہے۔ میں تجھے دھوکا نہ دوں گا۔ تیرے پیٹ میں جو پل رہا ہے وہ نگر سیٹھ مایا داس کا پوتا اور ان کے اکلوتے وارث راجندر کمار راٹھی کا فرزند ہے وہ کوئی معمولی شئے نہیں۔

رانی۔ (ہنس کر) اور میں نے کہا تھا اگر فرزندی ہوئی تو ؟

راجو۔ مجھے سب یاد آرہا ہے۔ میں نے کہا تھا تیرا مطلب لڑکی ہے نہ۔ تو بھی غم نہیں۔ لڑکی تو گھر کی لاج ہوتی ہے۔ اور تبھی میں نے دو نام تجویز کیے تھے۔ لڑکا ہوا تو وشال اور لڑکی ہوئی تو ویشالی۔

رانی۔ تمہیں یاد ہے وہ رات۔ برسات کی وہ کالی ڈراونی رات۔ کیسی موسلا دھار بارش ہوئی تھی۔ کیسے گھنے بادل چھائے تھے آسمان پر۔ اور کتنی خوفناک تھی بجلی کی وہ کڑک جس سے ڈر کر میں چھپکلی کی مانند تمہارے چوڑے اور مضبوط سینے سے چمٹ گئی تھی۔

راجو۔ اور میں نے تمہیں اپنے ساتھ اور بھی زور سے چمٹاتے ہوئے کہا تھا۔ ڈر نہیں رانو۔ یہ بادل جلد ہی چھٹ جائیں گے اور چاند کی مہربان کرنیں بادل کی اس اندھی اندھیری کالیما کو چیر پھاڑ کر رکھ دیں گی۔ اور رات پھر سے منور ہو جائے گی۔

رانی۔ میں جانتی کہ تم جھوٹ بول رہے تھے اور اماوس کی راتوں میں چاند نہیں نکلتا۔ مگر میں اپنی الھڑ مستی میں وہیں چمٹی بیٹھی تمہارے جوان بدن کا رس چوستی رہی تھی۔ پانی برستا رہا تھا اور ہم تم بھی برستے رہے تھے۔

راجو۔ اس رات میں خود تمہیں تمہاری ماں کے کمرے میں لوٹانے گیا تھا۔ تاکہ بڑھیا ہمارے تعلقات سے واقف ہو جائے۔ ہم دونوں بھیگے ہوئے تھے۔ اندر باہر سے پورے طور پر شرابور۔

رانی۔ اس روز ماں اپنے کمرے میں نہ تھی۔ ایسی راتوں کو اسے مالک کی خدمت کے لیے اکثر رک جانا پڑتا تھا۔ بےچاری ماں۔

راجو۔ میرا باپ لوہے کا سونا بنانے والا کیمیا گر۔ مٹی سے ہیرے جواہرات اور موتی اگانے والا جادوگر۔ ایک نظر دیکھ کر ہی سارے منظر کو بھانپ جانے والا جادوگر۔ وہ اپنے بیٹے کو جانتا تھا۔ اپنے خون کا رنگ پہچانتا تھا۔ تیری ماں کو تو جانتا ہی تھا۔

رانی۔ میری ماں اس کے لئے وہی تھی جو تمہارے لیے میں تھی۔

راجو۔ یہ گالی ہے رانو اور تم جانتی ہو کہ یہ جھوٹ ہے۔ تمہاری ماں میرے باپ کی داشتہ تھی جب کہ تم میری محبوبہ تھیں اور میں نے تمہیں اپنی پتنی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

رانی۔ جو ظاہر ہے کہ انہیں منظور نہ تھا۔

راجو۔ میرے والد بڑے سمجھدار اور سلجھے ہوئے ذہن کے مالک تھے وہ بھانپ گئے تھے کہ تم سے میرا لگاؤ ایسا نہیں، جسے ڈرا دھمکا کر ختم کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے مجھے چپکے سے بیچ سے سرکا دیا۔ کوئی گلہ شکوہ کیا نہ کوئی ایسی بات ہی کہی کہ جس سے مجھے شک ہوتا کہ میں کسی خاص مقصد سے باہر بھیجا جا رہا ہوں۔ مجھ سے جو کہا گیا ہر اعتبار سے معقول تھا۔ مجھ سے کہا گیا کہ چونکہ میں نے یہاں کی تعلیم مکمل کر لی ہے۔ مجھے اب امریکہ جانا ہوگا کیونکہ ان کے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے کاروبار کو اب پرانے حربوں سے سنبھالا نہیں جا سکتا۔ اتنی بڑی انڈسٹریل ایمپائر کو سنبھالنے اور مزید سجانے سنوارنے اور آگے بڑھانے کے لیے اب نئی جانکاری اور نئے تیکنیکوں کی ضرورت ہے اور یہ نئی ٹیکنالوجی صرف امریکی ادارے ہی سکھا سکتے ہیں۔

رانی۔ باپ کے مشورے میں تم نے نجات دیکھ لی اور چپ چاپ امریکہ چلے گئے۔

راجو۔ تم پھر جھوٹا الزام لگا رہی ہو۔ میں چپ چاپ چوری چھپے بھاگ جاتا تو تم اس قسم کا الزام لگانے میں حق بجانب ہوتیں۔ مگر میں نے تو ساری سکیم تمہارے سامنے کھول کر رکھ دی تھی۔ مجھے سب یاد ہے۔ حیرت ہے کہ تمہیں کچھ بھی یاد نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ میں تمہیں امریکہ منگوا لوں گا تاکہ ہمارا پہلا بچہ امریکہ کی سرزمین پر پیدا ہو۔ کیونکہ امریکہ ہی دنیا کی ایک ایسی واحد جمہوریت ہے جس کی آزاد فضا میں ہر ماں یہ خواب پالنے کا حق اور دم رکھتی ہے کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کر ملک کا پہلا شہری بنے گا۔

رانی۔ جانے سے پہلے تم نے مجھ سے گندھرو واہ کیا تھا۔ ہندو شاستروں میں ایسے وواہ کی مناہی نہیں۔ اور ہم نے پورے سات دن کھنڈالہ کے سرکٹ ہاؤس میں ہنی مون منایا تھا۔

راجو۔ سات نہیں پورے نو دن۔ تمہاری یادوں میں زنگ لگ گیا ہے۔ مگر مجھے سب یاد ہے۔ امریکہ پہنچتے ہی مجھے اطلاع ملی کہ تم اور تمہاری ماں نے خودکشی کر لی ہے۔ میرے پاس وہ تار آج بھی محفوظ ہے۔ ہندوستان میں تمہارے علاوہ کچھ نہ تھا جو مجھے تعلیم

ادھوری چھوڑ کر دٹ آنے کے لیے مجبور کرتا۔ میں کئی ہفتوں تک پاگلوں کی طرح سڑکوں پر بے مقصد گھومتا رہا پھر آہستہ آہستہ یہ دیوانگی کم ہونے لگی۔ کوئی بھی جذبہ ایک جیسی شدت سے ہمیشہ بنا نہیں رہتا۔ پھر امریکہ تو لاکھوں نئی انوکھی دلچسپیوں کا گھر ہے۔

رانی۔ تم نے میرے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ مبادا تمہارے ہاتھ کی تحریر کوئی نیا فساد کھڑا نہ کر دے۔

راجو۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔ ملتا بھی کیسے تم تو مر چکی تھیں۔

رانی۔ تم ٹھیک کہتے ہو میں واقعی مر چکی تھی۔ ایک پکے ہوئے پھل کی طرح میں تمہارے پیڑ سے گری اور تمہارے باپ کے دامن نے مجھے مٹی ہونے سے بچا لیا۔ میں ماں بننے والی تھی اور میرے بچے کو باپ کا نام درکار تھا۔ جو اسے آسانی سے مل گیا۔

راجو۔ تمہیں جو تکلیف اور پریشانی آج ہو رہی ہے میں اسے سمجھ سکتا ہوں۔

رانی۔ مجھے وہ دن کبھی نہیں بھولے گا جب تم نے اپنے گھر کی پرانی نوکرانی کی کمسن اور معصوم بچی کو اپنی وشال باہوں میں بھر کر کچھ ایسے چمٹا لیا تھا اپنے چوڑے چکلے سینے سے کہ بیچاری کنواری کے پاؤں تک سلگنے لگے تھے اور بدن کے بھیدوں سے ناواقف اس کا ناتجربہ کارِ دل تمہارے پہلے ہی بوسے سے ہزار ہزار بار دھڑک گیا تھا اور ایک عجیب انوکھی انجانی مستی بھری ترنگ میں بے سدھ ہو کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں تاکہ اس کے بھیتر کی کنواری وہ سب نہ دیکھے جو اس کے بعد ہونا تھا ــــــ اور ہوا تھا۔

راجو۔ کیا عجیب جادو تھا وہ۔

رانی۔ تم نے میری خالی جھولی بھر دی تھی۔ ایک مفلس کنواری کی لاج تم نے اپنے پیار سے ڈھک دی تھی۔ اور وہ اپنے آپ کو ایسے محفوظ سمجھنے لگی تھی جیسے تم نے اسے کیچڑ سے اٹھا کر پھولوں بھری سیج پر لٹا دیا ہو جیسے وہ تمہاری نگر سیٹھ مایا داس کے اکلوتے بیٹے کی بیاہتا ہو۔

راجو۔ تم کیوں بار بار وہ مناظر یاد کرتی ہو۔ میں نے اس کے بعد بھی کتنی ہی بار تمہیں اپنی گود میں بٹھا کر تمہارے بدن کو سہلایا تھا۔ اس سے جتنا سکھ مجھے ملتا تھا اُتنا، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ تمہیں ملتا تھا۔ مرد اور خاص طور پر پیار کرنے والے مرد کی گود میں جو نرمل آنند عورت کو ملتا ہے وہ اسے دوسری کسی جگہ نہیں ملتا۔

رانی۔ مجھے اعتراف ہے کہ تم ایک بھرپور مرد تھے۔ تمہارے بعد میں نے ایک دوسرے مرد کو بھی دیکھا ہے جو تمہارے مقابلے میں شاید آدھا مرد بھی نہیں۔ مگر اس نے مجھے پیار کے سکھ سے بھی بڑا تحفہ بخشا ہے۔ عزت، نام اور مان مریادہ کا تحفہ۔ اس نے مجھے میرا گھر دیا ہے۔ عورت کے نزدیک اس کے گھر کی کیا قیمت ہوتی ہے، یہ مرد نہیں سمجھ سکتے۔

راجو۔ تمہاری ماں کو جب ہمارے تعلق کی آگاہی ہوئی تو یاد ہے وہ کیسے چینخی چلائی تھی۔ وہ مکار بڑھیا۔

رانی۔ خوب یاد ہے۔ اس نے حقارت سے میرے منہ پر تھوک دیا تھا اور چینخ چینخ کر کہا تھا توسالی حرام کی اولاد ہے تو نے یہ سب کسی نہ کسی کے ساتھ کرنا ہی تھا۔ اب تو بھی اپنے جیسا ایک حرامی پلا جن اور میری طرح کسی اوباش سیٹھ کی داشتہ بن جا۔ یا باہر جا کر جسم کا بیوپار کر۔ بہت مل جائیں گے تجھے راجو جیسے۔ ہر مرد چمار ہوتا ہے۔ چمڑے کا بیوپاری۔ تو بھوکی نہ رہے گی۔ دو وقت پیٹ بھر کھانا اور راتوں کو کسی نہ کسی خبیث کے ساتھ سو کر اس کے اور اپنے بدن کی دوسری مانگیں پوری کرنا۔

راجو۔ یہ بددعا تھی، جو پوری نہیں ہوئی۔ کیونکہ بددعا دینے والی کوئی اچھی عورت نہ تھی۔

رانی۔ وہ اچھی تھی یا بری مگر میری جننی تھی۔ جب اس نے میرے مقدر، میرے مستقبل کا اتنا بھیانک تصور، میرے سامنے رکھا تھا۔ تو میں نے بھی سوچا تھا کہ میری مقدس محبت اس اس طرح ذلیل کرنے والی میری ماں نہیں ہو سکتی۔ مگر جب میں نے صورت حال پر دوبارہ سوچا تو مجھے اس کے بے بس غصے کی حقیقت سمجھ میں آ گئی۔ کبھی اس نے بھی کسی سے پیار کیا ہوگا اور دیکھ لیا ہوگا اس پیار کا نتیجہ۔

راجو۔ تو اپنی ماں سے اس طرح اس قدر کوسے جانے کے باوجود مجھ سے ملتی رہی تھی۔

رانی عورت بدن کے بھیدوں سے ایک بار آشنا ہو جائے تو مجبور ہو جاتی ہے۔ مگر میں جسے پیار سمجھتی تھی وہ پوجا کے لباس میں ملبوس میری واسنا تھی۔

راجو۔ واسنا کا بھی اپنا ایک دھرم ہوتا ہے۔ واسنا تخلیق کی ماں ہے۔ واسنا جب اپنے لیے کچھ سیمائیں کچھ حد بندیاں مقرر کر لیتی ہے کسی ایک کو چاہت کا مرکز بنا لیتی ہے تو خالق کا نر اور مادہ بنانے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

رانی۔ ان دنوں میں گھنٹوں سمندر کے کنارے بیٹھی اپنی تقدیر کی لہریں گنا کرتی تھی۔ سمندری

طوفانوں کو میں قدرت کے بے رحم عناصر کی فطری غضبناکی سے تعبیر کیا کرتی تھی۔ اور اکثر ڈر جایا کرتی تھی۔ کبھی میں اکیلی ہوئی اور کبھی تم کبھی میرے ساتھ ہوتے۔ تم مجھے تسلیاں دیتے۔ طرح طرح کے وعدے کرتے۔ مگر میرا خون بنا رہتا کیونکہ ماں نے میرے ذہن میں بیٹھا دیا تھا کہ میں منحوس ہوں اور میرے بدن پر جو خبیث روح قابض ہے اسے ڈر ہے کہ اگر اس نے میرے جسم کو تیاگ دیا تو بھگوان اسے دوسری کوئی پناہ گاہ نہیں دیں گے۔ یعنی کہ میں مرنا بھی چاہوں گی تو مر نہ سکوں گی۔ اب تو خیر میں نے جینا سیکھ لیا ہے، مگر ان دنوں۔

راجو۔ میں نے خود گھوڑے کی سواری کبھی نہیں کی ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا نہ مگر گھوڑوں کی روڑیں دیکھ کر میں بے حد مسرور ہوتا تھا۔ دوڑ زندگی کی علامت ہے۔ جوش کی علامت ہے۔ ایک ولولہ ہے۔ ایک پریرنا ہے۔

رانی۔ اب جب کہ میں وہ نہیں رہی جو کبھی تھی تو اب مجھے سمندر سے ڈر نہیں لگتا۔ اسی لیے میں نے تمہاری پرانی حویلی کو مسمار کر اکر اس پر یہ فلک شگاف عمارت تعمیر کرائی ہے اور ہر منزل پر ایک ایسی بالکنی بنوائی ہے۔ جس سے سمندر کی بے چین لہروں کے تڑپنے کا نظارہ کر سکوں۔ سمندر اب مجھے خوف نہیں حوصلہ بندھاتا ہے۔ ایک عجیب قسم کا سکون دیتا ہے۔ تم گھوڑوں کی دوڑیں دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ کچھ ویسی ہی راحت مجھے لہر در لہر دوڑتی ان آوارہ موجوں کے نظاروں سے ملتی ہے۔ تم نے گھوڑوں کی دوڑوں پر ہزاروں لگائے مگر کبھی کسی گھوڑے پر سوار نہیں ہوئے جبکہ میرے من نے اکثر چاہا کہ میں کسی بڑی ویل کے پیٹھ پر سوار ہو کر دور سمندر کی تہہ تک چلی جاؤں اور وہ سارے بھید جان لوں جو اس کے وشال سینے میں یگوں سے غرق ہیں۔

راجو۔ تم اپنا توازن کھو بیٹھی ہو۔ تم اپنے آپ کو جتنی تندرست اور توانا سمجھتی ہو اُتنی ہی بیمار ہو ــــ اور ــــ اور ــــ تم کوئی ایسی زیادہ سندر بھی نہیں ہو۔ امریکہ میں ہر تیسری عورت تم سے زیادہ خوبصورت اور طاقتور ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ وہ کیا ہے۔ کیا چاہتی ہے۔ اسے کہاں، کہاں تک اور کس رفتار سے جانا ہے۔ تمہاری زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔ اور جس زندگی کا مقصد نہ ہو وہ بیکار ہوتی ہے۔

رانی۔ تم میرے کرب کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ درد یہ تڑپ کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اس

درد وکرب کا منبع مجھے مل جاتا تو اسے اپنے اندر پل رہے ہزار سانپوں سے ڈسوا کر ڈھیر کر دیتی۔ مگر تم لوگ بڑے سیانے ہو۔ تم درد دیتے ہو، مگر درد کی شکل سے، اس کے خدوخال سے اپنے مظلوموں کو کبھی آگاہ نہیں کرتے۔ مبادا اسے پہچان کر اپنی حفاظت کا انتظام کر لیں۔ یا تمہارا تحفہ قبول کرنے سے ہی انکار کر دیں۔

راجو۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم بیمار ہو اور یہ کوئی معمولی بیماری نہیں۔ یہ بلڈ کینسر سے بھی خطرناک بیماری ہے۔ باہر سے تندرست اور توانا دکھائی دینے والی تم اندر سے ایکدم خالی اور کھوکھلی ہو۔ اور تمہارے اس نئے اقتدار میں کوئی بھی محفوظ نہیں۔ نہ میں نہ میرا باپ اور نہ ہمارا وشال اور نا تمہاری دونوں بیٹیاں —— تم نے ان کے نام ——

رانی۔ بڑی کا نام ویشالی ہے اور چھوٹی کا نام ابھی طے نہیں کیا۔ پہلے دو تم نے تجویز کئے تھے۔ یہ بھی تم ہی سجھا دونا۔

راجو۔ یہ ادھیکار تم مجھے دے سکتی ہو۔

رانی۔ میں نے تم سے تمہارا کوئی ادھیکار نہیں چھینا —— نہ ہی چھیننا چاہتی ہوں۔ مگر اپنے ادھیکاروں سے سبکدوش ہونے کا بھی میرا کوئی ارادہ نہیں۔

راجو۔ تم نے بیٹے سے اس کا باپ چھین لیا ہے۔

رانی۔ تمہارا باپ تمہیں ایک ہی شرط پر مل سکتا ہے۔

راجو۔ تمہاری کوئی شرط بھی ہے۔

رانی۔ تم اپنے باپ کی بیوی کو اپنی ماں کا رتبہ دو اور اپنے بیٹے کو اپنے چھوٹے بھائی کا۔

راجو۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

رانی۔ تو پھر تمہیں کچھ بھی نہیں مل سکتا۔ کیونکہ یہ گھر۔ تمہارے باپ کی ساری جائیداد۔ ساری ملیں۔ بینکوں میں پڑا سارا روپیہ میرے نام ہے۔

راجو۔ حیرت یہ سب کچھ حاصل کر کے بھی تم نے اس بڈھے کو ابھی تک زہر نہیں دیا۔

رانی۔ جسے تم بڈھا کہتے ہو۔ وہ تم جیسے سو جوانوں کا جوان ہے۔ وہ میرا اپنی پرمیشور ہے۔ میری طاقت ہے۔

راجو۔ تمہاری زبان سے نکلے یہ الفاظ بے معنی ہیں۔

رانی۔ تم میں اتنی عقل نہیں ہے کہ تم عورت اور مرد۔ یعنی پتی اور پتنی کا رشتہ سمجھ سکو۔ کسی اچھے آدمی کی پتنی کہلانا جس عورت کا سب سے بڑا آدرش رہا ہو وہی بتا سکتی ہے اس رشتے کے مفہوم۔ ایک بے گھر فرد ہی گھر کے معنی سمجھتا ہے۔

راجو۔ تم عورت نہیں ہو کوئی چڑیل ہو۔ کوئی جادوگرنی ہو۔ آفت کی پرکالہ۔ تم ٹھیک کہتی تھیں۔ تم واقعی کوئی خبیث روح ہو۔

رانی۔ تم پھر اپنے رنگ میں اپنے اصلی روپ میں لوٹ رہے ہو۔ میرے زخم بھرنے لگے تھے کہ تم نے پھر انہیں کرید کر تازہ کر دیا۔ تمہارا دیا ہوا درد سانپ کے زہر کی طرح میری رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ اور میں اب ایک ایسی وش کنیا ہوں جس کی ہر سانس اب وہی زہر اگلنے لگی ہے۔ جو اسے تم سے ملا تھا۔ ہاں راجو میں اب واقعی ایک وش کنیا ہوں۔ ایک نشہ۔ ایک جادو...... موت کا تانڈو۔

راجو۔ میں تمہاری حقیقت سمجھ گیا ہوں۔

رانی۔ اس پرانی حقیقت سے اس نئی حقیقت تک پہنچنے کے لیے مجھے کیا کچھ نہیں کرنا پڑا۔ کیا کچھ نہیں سہنا پڑا۔ کن کن پر پیچ مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔ زندگی کی ان اوبڑ کھابڑ راہوں میں کتنی بار لڑکھڑائی ہوں۔ کتنی بار زخمی ہوئی ہوں کتنی بار کیسے کیسے روئی چلائی ہوں۔ یہ سب کسی نے نہیں دیکھا سوائے میری اس خبیث روح کے جس نے گہری سے گہری تاریکی میں بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ میری الجھی راہوں کی یہی اب میری اصلی ماں، میری رہبر اور رہنما ہے۔ نہیں نہیں راجو تم آگے نہ بڑھو۔ اس گھر میں اب تمہیں کوئی نہیں جانتا۔ تمہارے پرانے ملازم میں نے ایک ایک کر کے سارے نکال دیئے ہیں۔ اس گھر کا ہر فرد میرا کتا ہے۔ جو تمہیں میرے ایک اشارے پر ہی چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔

راجو۔ میں انسان کی اولاد ہوں۔ کتوں سے نہیں ڈرتا۔

رانی۔ (تالی بجاتی ہے)

ملازم نمبر ۱۔ آپ نے بلایا مالکن؟

ملازم نمبر ۲۔ آپ نے یاد فرمایا رانی صاحبہ۔

رانی۔ اس اجنبی نوجوان کے لیے شربت کا گلاس لے آؤ۔ گرمی نے بیچارے کا سر چکرا

دیا ہے۔

ملازم نمبر۱۔ یہیں حاضر کردوں یا ان کو مہمان خانے میں لے جاؤں۔

راجو۔ تمہاری یہ مجال۔

ملازم نمبر۲۔ یہ گستاخ ہے رانی صاحبہ، حکم ہو تو ذرا ٹھنڈا کردوں۔

ملازم نمبر۱۔ اس کی گرمی روح افزا سے نہیں سمندر میں دو چار غوطوں سے اپنے آپ چلی جائے گی۔

راجو۔ ہم اس گھر کے مالک ہیں۔ سیٹھ مایاداس کے اکلوتے بیٹے۔ ہم اس مایانگری کے راجکمار ہیں۔ ولی عہد۔

ملازم نمبر۲۔ یہ واقعی بوکھلا گیا ہے رانی ماں۔ چھوٹی سرکار کے ہوتے ہوئے یہ اپنے آپ کو بڑی سرکار کا بیٹا بتاتا ہے۔ وہ بھی اکلوتا۔

رانی۔ کون جانے بیچارہ ٹھیک ہی کہتا ہو۔ تمہاری بڑی سرکار کے اس عمر میں یہ تیور ہیں جوانی میں تو ظاہر ہے کہ اور بھی رنگین رہے ہوں گے۔ ابھی نہ جانے اس جیسے کتنے حرامی پلے اس قسم کے دعوے دار ہوں گے۔ اس جہاں نگر میں۔

ملازم نمبر۱۔ پھر تو ماں جی اس کا علاج سمندر کا کھارا پانی ہے، شربت نہیں۔

رانی۔ تم نے اسے اس کا مقام سمجھا دیا ہے۔ اب یہ کوئی گستاخی نہیں کرے گا۔ اب تم دونوں جا سکتے ہو۔ شربت کی بھی اب ضرورت نہیں ہے۔

راجو۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ تم واقعی اس مایانگری کی ملکہ ہو۔ ابھی ابھی یہ ملازم جس چھوٹی سرکار کا ذکر کر رہا تھا وہ اپنا وشال ہی ہے نہ۔

رانی۔ تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔ تمہارا بیٹا جو اب تمہارا بھائی ہے۔ اور میں تمہارے بیٹے کی ہی نہیں، تمہاری بھی ماں ہوں۔ ہے نہ عجیب رشتہ۔

راجو۔ میں اس رشتے کو نہ مانوں تو۔

رانی۔ تو پھر میری اس سلطنت میں تمہیں مناسب مقام تو ایک طرف معمولی سی ملازمت بھی نہیں مل سکتی۔

دروازہ کھلنے کی آواز ——— مایاداس سیٹھ کا داخلہ

مایاداس۔ (نشے میں دھت آواز میں) تم کاروبار کے بکھیڑوں میں اتنی الجھی رہتی ہو کہ
بیچارے مایاداس کے لیے تمہارے پاس وقت ہی نہیں بچتا۔ آج تم کس نئے
چکر میں (راجو کو دیکھ کر) یہ کون ہے۔

راجو۔ میں آپ کا بیٹا ہوں پتاجی۔ آپ کا راجو۔

مایاداس۔ یہ خوب رہا۔ ہمارا چار سال کا بیٹا ایکدم اتنا بڑا ہو گیا اور اس نے اپنا نام
بھی بدل لیا ہے۔ یہ راجو کیا بلا ہے۔ وشال بُرا نام تو نہ تھا۔

راجو۔ (پاؤں کو چھونے کی کوشش کرتا ہے) میں راجو ہوں۔ آپ کا راجندر
راجندر کمار

مایاداس۔ ارے ہٹ پرے۔ پاؤں چھونے کی پرانی رسم ہماری بیگم صاحبہ کی مملکت
میں اب رائج نہیں۔ کیوں بیگم ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔

راجو۔ آپ مجھے، اپنے بیٹے کو پہچان نہیں رہے۔

مایاداس۔ ہمارا ایک ہی بیٹا ہے۔ اور دو بیٹیاں۔

راجو۔ میں آپ کا بڑا بیٹا ہوں۔ آٹھ سال بعد امریکہ سے لوٹا ہوں

مایاداس۔ بڑے مورکھ ہو۔ امریکہ سے صرف بے وقوف واپس آتے ہیں۔

راجو۔ میں تعلیم ختم کر کے اپنے ملک، اپنے گھر اپنے باپ کے پاس آیا ہوں اور آپ یہ ناٹک
کر رہے ہیں۔

مایاداس۔ یہ جو کر ہمیں کسی ناٹک کا پاتر سمجھتا ہے۔ بڑا گستاخ ہے۔

رانی۔ یہ راجندر ہے۔ آپ کا بڑا بیٹا۔ یاد کیجیے۔

مایاداس۔ ہمیں کچھ یاد نہیں اور ماضی میں لوٹ جانا اب ہمارے لئے ممکن نہیں۔ اگر تم اسے
جانتی پہچانتی ہو تو کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔ اب میں اور انتظار نہیں کر سکتا۔
(لوٹ جاتا ہے)

رانی۔ (راجو سے مخاطب ہو کر) تم نے دیکھا۔ آج تم اتنے ہی بے بس اور اپاہج ہو جتنی
کبھی میں تھی۔

دروازہ پر دستک

وشال ویشالی اور چھوٹی نمی ۔ ہم اندر آ سکتے ہیں ممی جی۔
رانی۔ ضرور آ سکتے ہو۔

تینوں بچوں کا ایک ساتھ داخلہ۔

وشال۔ ہمیں بابوجی نے بھیجا ہے۔
ویشالی۔ جوکر دیکھنے۔
وشال۔ آپ ہی وہ جوکر ہیں نہ انکل۔
ویشالی۔ آپ سرکس میں کام کرتے ہیں نا انکل جی۔
وشال۔ ہم نے آج تک کوئی سرکس نہیں دیکھا۔
رانی۔ ابھی کل ہی تو ٹی وی پر تم نے روسی سرکس دیکھا تھا۔
وشال۔ ہم زندہ سرکس دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیوں ویشالی۔ کیوں نمو۔ ویشالی اور نمو (ایک ساتھ) ہاں بھیّا ہم زندہ سرکس دیکھنا چاہتے ہیں۔ (پھر راجو کی طرف مڑکر) آپ ہمیں اپنا سرکس دکھائیں گے نا۔
راجو۔ (حسرت سے وشال کی طرف دیکھتے ہوئے۔ حسرت بھرے لہجے میں) میں جوکر ہی ہوں بچو۔ تمہیں سرکس ضرور دکھاؤں گا۔
رانی۔ (بچوں سے مخاطب ہوتے ہوئے) اب تم لوگ جاؤ۔ تم لوگوں کی گورنیس اب آتی ہی ہوں گی۔ ناچتے گاتے، ہنستے، کھیلتے تینوں بچوں کا ایک ساتھ لوٹ جانا۔ (دروازہ بند کرنے سے پہلے وشال) بابوجی آپ کو بلا رہے ہیں ممی جی۔
راجو۔ (آہ بھر کر) کتنے پیارے بچے ہیں۔
رانی۔ سانچہ خوبصورت ہو تو بچے خوب صورت ہی پیدا ہوتے ہیں۔
راجو۔ تمہیں اپنی سندرتا پر بڑا ناز ہے۔
رانی۔ ناز کیوں نہ ہو۔ میں ہوں ہی سندر۔
راجو۔ اتنا غرور اچھا نہیں ہوتا رانو۔
رانی۔ یہ فلمی مکالمہ ہے۔ تم دیوداس نہ کبھی بنے نہ بن سکتے ہو۔ میرا خداوند مجھے بلا رہا ہے۔ لہٰذا اب تم جاؤ۔ تم چاہو تو اس وسیع و عریض عمارت کے کسی حصہ کو اپنا مسکن بنا سکتے ہو۔ تمہارا یہ حق میں نہ لوں گی۔ تم واپس امریکہ لوٹ جانا چاہو تو

اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ تم اپنے ہوٹل سے ٹیلی فون کر دینا تمہیں جتنے روپے درکار ہوں گے۔ پہنچا دیئے جائیں گے۔

راجو۔ اچھا رانو۔ تم جو کر رہی ہو وہ ٹھیک ہی ہے۔ تم حقدار ہو۔ میں نے تم سے جو سلوک کیا تھا۔ اس کے رد عمل کے طور پر تمہارا یہ رویہ نامناسب نہیں۔ اور ہاں۔ میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ میں نے ایک امریکی لڑکی سے شادی کر لی ہے اور ہم دونوں تاج میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور جلد ہی ہندوستان کے چیدہ چیدہ مقامات دیکھ کر واپس لوٹ جائیں گے۔ ہمارے پاس ریٹرن ٹکٹ تو ہیں۔ مگر مقامی کرنسی کافی نہیں۔ ہو سکے تو دس بیس ہزار کی رقم تاج کے کمرہ ۲۷ میں پہنچا دینا

رانی۔ بیس ہزار آج کل کیا ہوتے ہیں۔ لاکھوں کی بات کرو راجو اور ہاں یہ چند زیور میری بہو کو اس کی ساس کی طرف سے دے دینا (اپنے سارے زیور اتار کر میز پر رکھ دیتی ہے)

راجو۔ ارے کیا کر رہی ہو۔ سارے زیور

رانی۔ یہ میری بہو کے لیے ہیں۔ مجھے اب زیورات کی ضرورت نہیں رہی۔ اپنے یہ قیمتی پارچات بھی اتار دیتی مگر اپنے جوان بیٹے کے سامنے ننگی ہو جانا مناسب نہ ہوگا تم ایک کروڑپتی باپ کے بیٹے ہو بیوی کے ساتھ بنیوں جیسا سلوک نہ کرنا۔ آج شام تک تمہیں ایک نئی کار اور دس لاکھ روپے کی رقم مل جائے گی۔ جب تم یہاں سے گئے تھے تو تمہارا باپ اس سے بڑی رقم کا مالک نہ تھا۔

راجو۔ میں جا رہا ہوں اور ظاہر ہے کہ ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا

رانی۔ تم نے شادی کر کے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے راجو ورنہ خدا گواہ ہے کہ تم آج تک میرے سینے پر ایک بڑا بوجھ بنے بیٹھے تھے۔ اور اپنے فرصت کے اوقات میں میں نے اکثر سوچا تھا کہ میں نے تمہارا انتظار نہیں کیا اور اپنے بیٹے کو باپ کا نام دلوانے کی خاطر وہ کر ڈالا جو محبت کرنے والے کبھی نہیں کرتے۔ الوداع راجو۔

راجو۔ الوداع رانو۔ (اداس موسیقی ـــــ درد بھری دھن)

...... عوام سے الگ رہ کر ہم بیگانۂ محض رہ جائیں گے۔ ادیبوں کو انسانوں سے مل جل کر انہیں پہچاننا ہے۔ میری طرح گوشہ نشین رہ کر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ میں نے ایک مدت تک سماج سے الگ رہ کر اپنی ریاضت میں جو غلطی کی ہے اب میں اسے سمجھ گیا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ آج یہ نصیحت کر رہا ہوں۔ میرے شعور کا تقاضا ہے کہ انسانیت اور سماج سے محبت کرنا چاہیئے۔ اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہوا تو وہ ناکام اور نامراد رہے گا

——— رابندر ناتھ ٹیگور

یہ امر ناقابل تردید ہے کہ جدید ادب کے فروغ میں ترقی پسندی کے رجحان نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ گو گذشتہ نصف صدی میں جنوبی ایشیا کے حالات بدل چکے ہیں لیکن غیر ملکی سامراج کے بظاہر پسپائی کے باوجود سماج میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی بلکہ مذہبی، لسانی اور نسلی تعصبات پہلے سے زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ ابلاغ عامہ پر حکومتوں اور تجارتی اداروں کی گرفت زیادہ مضبوط ہو گئی ہے۔ معاشی، مشکلات اہل قلم کو آدرشوں اور قدروں سے چشم پوشی کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ترقی پسند تحریک ان مسائل پر توجہ دے گی اور اس حقیقت کا اقرار کرے گی کہ فن وفکر کی دنیا میں وہ سرحدیں نہیں ہوتیں جو انسان کو انسان سے جدا کرتی ہیں۔

——— ڈاکٹر اختر حسین

دو بڑی بڑی آنکھیں ——
آفتاب کے پہلے طلوع اور پھر غروب
ہونے کے مناظر ——
افق — چاند — ستارے — خلا —
سیاہ وسفید دھند میں لپٹی ہماری
زمیں جو محوِ گردش ہے ——
دھند کے بادلوں میں سے جھانکتی
ہوئی دو بڑی بڑی آنکھیں —— شفیق
مہربان آنکھیں —— مسکراتی ہوئی نٹ
کھٹ آنکھیں —— خوف سے ہراساں
آنکھیں —— غصیلی آگ برساتی ہوئی
آنکھیں ——

دھند میں سے ابھرتا سفید لباس میں
ملبوس ایک انسانی مجسمہ، جو دھند کے گزر
جانے پر آہستہ آہستہ ایک زندہ سفید ریش
بزرگ میں بدل جاتا ہے ——

سفید ریش بزرگ :-

ابھی ابھی تم نے آفتاب دیکھا۔ میں
آفتاب کی شعاعوں کا وہ تیز گام گھوڑا ہوں
جو لاکھوں کروڑوں میلوں کی مسافت پلک
جھپکنے میں طے کر جاتا ہے ——
ابھی ابھی تم نے اپنی زمین دیکھی جو اپنے
ہی محور پر رقصاں تھی —— میں وہ
گردشِ پیہم ہوں جو اتنی تیزی سے گھومتی
ہے کہ ایک دم ساکن دکھائی دیتی ہے۔

ابھی ابھی تم نے آسمانوں کی بے پایاں خلا میں ٹنگے چاند اور ستارے دیکھے۔ میں اِن کھُلی فضاؤں کا وہ البیلا شاہین ہوں جس کی اڑان نظر کی سیماؤں کو دم بھر میں پھلانگ جاتی ہے آغاز و انجام سے بے نیاز ــــ ابتدا اور انتہا سے ماورا میں رفتار ہوں۔ میں وقت ہوں۔ میں سب سمجھتا ہوں، سب جانتا ہوں، سب دیکھتا ہوں ــــــــ

آدمی میں تیرا اساطیر نگار، مورخ، کہانی کار، فلسفی اور شاعر ہوں، میں تیرا ــــــــ تیرا دوست۔ تیرا باپ۔ کبھی تو مجھے مقدس باپ کہتا تھا احتراماً خدا مانتا تھا مجھے، مگر اب ــــــــ

میرے ناخلف بیٹے۔ تو نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ تو میری بے غرض، بے لوث محبت کا حقدار نہیں، مگر میں تیرا باپ ہوں۔ تیرا اختلافات کے باوجود میں نے تجھے ان حقوق سے محروم و دست بردار نہیں کیا جو ایک بیٹے کے ناطے تیری وراثت ہیں۔

مگر تو ــــــــ

پھر وہی دُھند۔ پس منظر میں آدمیوں کا رواں دواں ہجوم ایک عالی شان محل نما کوٹھی، جس کے بڑے دروازے سے داخل ہو کر کیمرہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا ایک وسیع و عریض ہال میں داخل ہوتا ہے۔ اور قیمتی پوشاک میں ملبوس صوفہ چیئر میں دھنسے ایک پریشان حال آدمی کا کلوز اپ لیتا ہوا اُس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیوار آویزاں ایک بڑے کلاک پر آ کر رُک جاتا ہے۔

کلاک کی ٹِک ٹِک، ٹِک ٹِک، ٹِک ٹِک

دل کی دھڑکن۔ دھک دھک، دھک دھک، دھک دھک

دونوں آوازیں ایک دوسرے میں گڈمڈ

دور سے اُلّو کے بولنے کی آواز

پریشان حال آدمی۔

کیسی بھیانک، کیسی خوفناک رات ہے۔

ــــــــ پھر وہی آواز ــــــــ

ٹک ٹک، دھک دھک۔ ٹِک ٹِک دُھک دُھک، ٹِک ٹک، دھک دھک ــــ،

وقت کی ایک نئی آواز

میں ہل چل ہوں۔ میری حکومت میں اس جھوٹے سکون کا کوئی مقام نہیں جس کے حصول کے لیے تو گناہ کرتا ہے۔ اپنے پیاروں اور عزیزوں کا قتل کرتا ہے۔ میرے فرشتوں کے نام و ناموس پر کیچڑ اچھالتا ہے۔

(کرسی میں دھنسے آدمی کا خوف سے ہراساں چہرہ)

(دروازے میں تن کر کھڑے ایک دوسرے آدمی کے ننگے پاؤں)

دوسرا آدمی۔ کلاک کی ٹک ٹک گن رہے ہو۔ کب تک گنتے رہو گے۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ تم ختم ہو جاؤ گے۔ باقی سب کچھ بھی ختم ہو جائے گا ——

پہلا آدمی۔ (تقریباً چیخ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے) تم کون ہو؟

(کیمرہ دروازے میں کھڑے آدمی کے پاؤں سے آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا ہے اور اس کے چہرے پر آ کر رک جاتا ہے۔ چہرہ جو بے حد خوفناک ہے اور بڑے دلخراش انداز میں خندہ زن)

پہلا آدمی۔ (دوبارہ اور بھی زور سے گرج کر) میں پوچھتا ہوں تم کون ہو —— کون ہو تم —— تم ——

دوسرا آدمی۔ (طنزاً) ہاں میں، یعنی کہ میں۔ پہچانتے ہیں اپنے ابو کے قاتل کو

پہلا آدمی۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا —— مگر تم ——

دوسرا آدمی۔ جیل سے بھاگ آیا ہوں

پہلا آدمی۔ بھاگ آیا ہوں؟ تو گویا ——

دوسرا آدمی۔ بڑی واہیات قسم کی جیل تھی۔ خاصی اچھی آب و ہوا کے باوجود دل نہیں لگا۔

پہلا آدمی۔ کیسے بھاگے؟

دوسرا آدمی۔ جیسے ہی پہلا موقع ملا، دیوار پھلانگ کر چلا آیا

پہلا آدمی۔ تم نینی جیل میں تھے نا؟

دوسرا آدمی۔ جیسے یہ بھی بتانے کی بات ہے

پہلا آدمی۔ یہ بات نہیں، دراصل میں سوچ رہا تھا کہ ——

دوسرا آدمی۔ کیا سوچ رہے تھے تم

پہلا آدمی۔ یہی کہ تم نینی جیل میں تھے اور یہ بمبئی ہے۔ اتنا طویل فاصلہ اور تم بدستور جیل کی

وردی میں؟

دوسرا آدمی ۔ لو اب دیکھو (داہنے ہاتھ میں لٹک رہے اوورکوٹ کو پہن لیتا ہے) اب بھی تمہیں قیدی دکھائی دیتا ہوں ؟۔

پہلا آدمی ۔ (مسکرا کر اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے) کوٹ نے تمہاری وردی واقعی چھپالی ہے، مگر اتنے قیمتی کوٹ والا آدمی ننگے پاؤں؟

دوسرا آدمی ۔ (قہقہہ لگا کر) تمہیں تو خفیہ پولیس میں ہونا چاہیئے تھا ــــــــ

پہلا آدمی ۔ پکڑ لیا نا؟ ــــــــ

دوسرا آدمی ۔ کیا پکڑ لیا ۔ کیا تمہیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ تمہارے محل میں، جس کا ہر دروازہ اور گوشہ پٹھان چوکیداروں نے گھیر رکھا ہے، بوٹ پہن کر داخل نہیں ہوا جا سکتا ۔

پہلا آدمی ۔ تو پھر؟

دوسرا آدمی ۔ کھڑکی سے کود کر آیا ہوں ۔ اتنے عرصہ تک چوروں کی صحبت میں رہا ہوں نا ــــــــ

پہلا آدمی ۔ بہت ہوشیار ہو گئے ہو ــــــــ

دوسرا آدمی ۔ پانچ سال میں آدمی بڑی سے بڑی یونیورسٹی کی تعلیم ختم کر لیتا ہے ۔

پہلا آدمی ۔ (طنزاً) یونیورسٹی ۔ خوب

دوسرا آدمی ۔ جیل آکسفورڈ اور کیمبرج سے بھی بڑی یونیورسٹی ہے، میرے دوست

پہلا آدمی ۔ تمہیں چودہ سال کی قید ہوئی تھی نا؟

دوسرا آدمی ۔ قید بامشقت مگر پانچ ہی سالوں نے

پہلا آدمی ۔ تمہیں اتنا دلیر، جفاکش اور سخت جان بنا دیا کہ تم نینی جیل کی بارہ فٹ اونچی دیوار ؟۔

دوسرا آدمی ۔ تم بھول رہے ہو ۔ دُبلا پتلا ہونے کے باوجود میں کالج کا سب سے کامیاب اور توانا کھلاڑی تھا خاص طور پر لانگ جمپ میں ۔

پہلا آدمی ۔ آؤ بیٹھو اطمینان سے باتیں کریں ۔

دوسرا آدمی ۔ (بیٹھ جاتا ہے) میری بیوی کہاں ہے؟

پہلا آدمی ۔ نجمہ، تمہارے بیٹے سے ملنے نینی تال گئی ہوئی ہے ۔ تمہارے رشید کو میں بیلک اسکول میں تعلیم دلوا رہا ہوں ۔ تم نہیں کہہ سکتے کہ میں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا ۔

دوسرا آدمی ۔ (طنزاً) تم خود بھی تو ایک بڑے پبلک اسکول کی پیداوار ہو

پہلا آدمی ۔ یہ طنز بے مصرف ہے ۔ کہو کیا چاہتے ہو

دوسرا آدمی ۔ اپنی بیوی، اپنا بچہ، اور ــــــــــ

پہلا آدمی ۔ اور کیا ؟

دوسرا آدمی ۔ لوٹ کا آدھا حصّہ

پہلا آدمی ۔ کونسی ـــــ کیسی لوٹ

دوسرا آدمی ۔ یہ سب جو تمہارے چاروں طرف بکھرا پڑا ہے ۔ شاہی ٹھاٹ باٹ سے آراستہ یہ عظیم الشان عمارت ۔ کپڑے کے دو بڑے بڑے کارخانے ۔ فورٹ میں اتنا بڑا دفتر اور بنکوں میں اتنے ڈھیر سے روپے اور نمبر دو کی وہ دولت جو خدا کی طرح دکھائی نہیں دیتی مگر جس کا جلوہ کوئی نابینا بھی دیکھ سکتا ہے ۔

پہلا آدمی ۔ تمہارا قیافہ کوئی ایسا غلط نہیں ۔ مگر میرے پاس آج جو کچھ ہے وہ میرے خون اور پسینے کی کمائی ہے ۔

دوسرا آدمی ۔ خون پسینہ کی بات نہ کرو میرے دوست ۔ کوئی بھی دیکھ کر کہہ دے گا کہ تم خون ہی خون ہو اور میں پسینہ ہی پسینہ، یعنی محض پانی، گرچہ ــــــــــ

پہلا آدمی ۔ اُبلتا ہوا ۔ کھولتا ہوا پانی

دوسرا آدمی ۔ تمہاری نظر بڑی تیز ہے ۔

پہلا آدمی ۔ تمہیں بچپن سے جانتا ہوں ۔ تم ہمیشہ سے ایسے ہی تھے ۔

دوسرا آدمی ۔ میں تمہاری طرح فربہ کبھی نہ تھا ۔ مگر میرا خون تب میرے اپنے جسم میں تھا ۔ اب سارے کا سارا تمہارے بدن میں منتقل ہوگیا ہے اور (ہنس کر) تمہارا پسینہ میرے خالی پنجرنے چوس لیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ بدنوں کی بات چلے گی تو تم بدن اور میں پنجر ہی کہلاؤں گا ۔

پہلا آدمی ۔ (قدرے ہکلاکر) میں ـــ میں ـــ میں ـــ

دوسرا آدمی ۔ لوٹ آئے نہ اپنی اوقات پر ۔ ہمیشہ بکری کی طرح میں میں گھگھیانے کی عادت دیکھتا ہوں آج بھی ۔

پہلا آدمی۔ تُم ــــ تُم ــــ تُم

دوسرا آدمی۔ ہاں ہاں کہو۔ میں ہوں تمہارے والد بزرگوار حاجی غلام رسول صاحب کا قاتل۔
جبکہ تم جانتے ہو کہ حاجی صاحب کا قتل میں نے نہیں، تم نے کیا تھا۔ تم جو اپنے حاتم
باپ کی دریادلی سے خائف تھے۔ پاکباز بوڑھا سیکڑوں، ہزاروں روپے ہر دوسرے
تیسرے رفاہ عام میں اُنڈیل دیتا تھا۔ تمہیں خوف تھا کہ بوڑھا اسی رفتار سے دولت لُٹاتا رہا
تو تمہارے لیے کچھ نہ بچے گا۔

پہلا آدمی۔ اس میں کیا شک ہے کہ ابّو سٹھیا گئے تھے۔

دوسرا آدمی۔ ہمارا پیغمبر تنبیہہ کر گیا ہے کہ ہر مومن کو اپنی کمائی کا دس فی صد خیرات میں دینا چاہیئے۔
دان دینے سے دھن نہیں گھٹتا۔ مگر تمہارا آکسفورڈ ٹرینڈ دماغ رسول کے پیغام کو کیسے
سمجھ سکتا تھا۔

پہلا آدمی۔ تم مجھ سے ملنے آئے ہو یا ماضی کی قبریں کھودنے۔ وہ وقت گزر چکا ہے۔ میں خود دو مسجدیں تعمیر
کروا چکا ہوں اس مابین۔

دوسرا آدمی۔ وقت تو ظاہر ہے کہ ایک حرکی وحدت ہے۔ وہ میرے لیے رُکے گا نہ تمہارے لیے۔ وہ تو
گزرے گا ہی۔

پہلا آدمی۔ وقت میرے ساتھ ہے۔ میری مٹھی میں۔

دوسرا آدمی۔ تمہارا باپ ایک پاکباز مسلمان تھا۔ ایک سچا مرد مومن۔ تم احمق ہو جو ایک بحر
بے پایاں کو مٹھی میں بند کرنے کا دعویٰ کر رہے ہو۔

پہلا آدمی۔ میں نے اپنے باپ سے دس گنا زیادہ خیرات بانٹی ہے۔ میرے گناہ کا کفارہ ہو چکا ہے۔

دوسرا آدمی۔ (اُداس لہجہ میں) شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو، مگر میں نے کیا پایا اس گناہ بے لذت
میں شریک ہو کر۔ تم نے اس غریب بوڑھے کے دل میں خنجر گھونپ کر اس کی جان لے لی،
اور مجھے اپنی بیوی اور بچے کے اچھے مستقبل کے عوض چودہ سال کے لیے جیل بھجوا دیا۔
سودا مہنگا نہ تھا۔ میں نے ایک تاکردہ گناہ اپنے اوپر لے لیا اس امید پر کہ سزا کی میعاد
بھگت لینے کے بعد ہم دونوں مزے سے باقی ماندہ زندگی جی سکیں گے۔ میں اس وقت
بائیس سال کا تھا۔ آج ستائیس کا ہوں۔ سزا کی میعاد پوری کر لیتا تو بھی کوئی ایسا بوڑھا

نہ ہوگیا ہوتا۔

پہلا آدمی۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ مگر تم نے قید کی میعاد ختم کیے بغیر بھاگ کر اپنے جرم کو اور بھی سنگین بنالیا ہے۔

دوسرا آدمی۔ یہ تو تب ہی ہوگا نا جب میں دوبارہ پکڑا جاؤں گا۔

پہلا آدمی۔ یہ کون مشکل کام ہے۔ میں ابھی ٹیلی فون کرکے تمہاری یہ مشکل آسان کیے دیتا ہوں۔
(اٹھ کر ٹیلیفون کی طرف لپکتا ہے۔)

دوسرا آدمی۔ (وہیں بیٹھے بیٹھے) بے وقوف نہ بنو۔ تم ایسا نہیں کرسکتے۔ ایک قاتل کے لیے دوسرا قتل معمولی بات ہے۔ علاوہ ازیں ــــــــ

پہلا آدمی۔ علاوہ ازیں؟

دوسرا آدمی۔ میری گرفتاری تمہارے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی کردے گی۔

پہلا آدمی۔ کیسی مصیبت؟

دوسرا آدمی۔ تم نے میری یعنی اپنے باپ کے قاتل کی بیوی کو اپنے گھر میں ڈال رکھا ہے۔

پہلا آدمی۔ نجمہ کی بات کررہے ہو

دوسرا آدمی۔ نجمہ تمہارے اس دوست کی بیوی ہے جس نے تمہارا اتنا بڑا جرم اپنا کر تمہیں زندگی اور اتنی ڈھیر سی دولت بخشی۔

پہلا آدمی۔ نجمہ ایک بے وفا، سہل پسند عورت ہے، وہ تم سے پیار نہیں کرتی۔

دوسرا آدمی۔ وہ تمہاری داشتہ، تمہاری رکھیل ہوسکتی ہے مگر وہ تم سے پیار بھی کرتی ہے۔ یہ تو وہی بتاسکتی ہے۔

پہلا آدمی۔ کچھ بھی کہو۔ تم دونوں اب میرے ہاں نہیں رہ سکتے۔

دوسرا آدمی۔ تمہارے جیسے خبیث کے ساتھ کون رہنا پسند کرے گا ــــــــ

پہلا آدمی۔ تم آپے سے باہر ہوئے جارہے ہو۔ میرے ہی گھر میں مجھے گالی دے رہے ہو۔

دوسرا آدمی۔ تم میرے گناہ گار ہو۔ تمہیں گالی دینا میرا حق ہے مگر تمہارے ساتھ یا قریب رہنا ویسے بھی اب مناسب نہیں لہٰذا میں نے طے کیا ہے کہ میں اور نجمہ تمہارے ہی ایسے کسی الگ گھر میں تمہارے ہی ایسے ٹھاٹ باٹ سے، اپنے بچے کے ساتھ رہیں گے ــــــــ

پہلا آدمی ۔ اس قسم کا گھر لاکھوں میں بنتا ہے ۔
دوسرا آدمی ۔ جانتا ہوں ۔
پہلا آدمی ۔ ابا مرحوم کے لاکھ اب کروڑ بن چکے ہیں ۔
دوسرا آدمی ۔ یہ بھی جانتا ہوں ۔ لاکھوں کا چکر ہی ایسا ہوتا ہے ۔ پہلا لاکھ بنانا ہی مشکل ہوتا ہے ۔
ایک بار کسی طرح بنجائے تو باقی کے لاکھ اپنے آپ بنتے چلے جاتے ہیں ۔ تم نے لاکھوں
کے کروڑ بنا کر کوئی بہت بڑی بات نہیں کی ۔
پہلا آدمی ۔ میں نے اس کے لیے محنت کی ہے ————
دوسرا آدمی ۔ میں نے جیل جھیلی ہے ۔ بیڑیاں پہنی ہیں ۔ چکی پیسی ہے ۔ سنگلاخ زمینیں کھودی
ہیں ————
پہلا آدمی ۔ میری محنت کا مقابلہ جیل کی مشقّت سے کرتے ہو، جو تمہیں مجبوراً کرنی پڑی تھی ۔
دوسرا آدمی ۔ محنت کی نوعیت کیسی بھی ہو، محنت بہر حال محنت ہے ۔ فیکٹری کو چلانے کے لیے منیجر
کے دماغ اور مزدور کے قوتِ بازو دونوں کی یکساں ضرورت ہوتی ہے ۔
پہلا آدمی ۔ ابا مرحوم سے میں نے لگ بھگ دو لاکھ کی وراثت پائی تھی ————
دوسرا آدمی ۔ ابو کو مرحوم کر کے کہو میرے دوست ۔
پہلا آدمی ۔ تم بے حد گستاخ ہو گئے ہو ۔ کان کھول کر سن لو کہ تم میرے دوست نہیں ہو ۔
دوسرا آدمی ۔ جانتا ہوں مگر کبھی تو تھا ۔ اب کیوں نہیں ہوں ۔ یہ فرق بھی میں سمجھتا ہوں ۔
پہلا آدمی ۔ میرے پاس تجوری میں اس وقت سوا لاکھ کی رقم ہوگی، یہ تم لے جا سکتے ہو ۔
دوسرا آدمی ۔ لاکھ کبھی خاصی بڑی رقم ہوا کرتی تھی ۔ آجکل بمبئی میں دو کمروں کا فلیٹ بھی لاکھ میں نہیں
آتا ۔ ویسے تم فی الحال لاکھ ہی دینا چاہو گے، تو بھی چلے گا ۔
پہلا آدمی ۔ فی الحال ؟ تو گویا یہ سلسلہ ؟
دوسرا آدمی ۔ تب تک جاری رہے گا جب تک ہم دونوں میں سے ایک زندہ ہے ۔
پہلا آدمی ۔ تم مجھے دھمکا رہے ہو ۔ ؟
دوسرا آدمی ۔ میں تم سے اپنا حق مانگ رہا ہوں، جو ظاہر ہے کہ دھمکانا نہیں ہوتا ۔
پہلا آدمی ۔ (طنزاً) حق ؟

دوسرا آدمی۔ تمہیں ہی کیا لفظ حق کسی بھی بیوپاری کو پسند نہیں ہوتا۔ لفظ عوضانہ چلے گا نا؟

پہلا آدمی۔ عوضانہ؟ کس چیز کا عوضانہ؟ تم کیا بیچ رہے ہو۔

دوسرا آدمی۔ وہ نایاب شے، جسے لوگ آزادی کہتے ہیں۔

پہلا آدمی۔ تم بھول رہے ہو۔ قیدی تم ہو، میں نہیں۔ تم وہ چیز بیچنا چاہتے ہو، جو تمہیں خود درکار ہے ———

دوسرا آدمی۔ تم مجھ سے بڑے قیدی ہو۔ میں قید سے فرار تو ہو سکا ہوں۔ تم بدستور قیدی ہو

پہلا آدمی۔ تمہاری آزادی چند روزہ ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔

دوسرا آدمی۔ تم بھولتے ہو ——— تم مجھے اپنا سب کچھ دے دو گے جب کہ اس وقت میں نصف ہی کا طلب گار ہوں

پہلا آدمی۔ تم ایک ذلیل بلیک میلر ہو۔

دوسرا آدمی۔ سوداگری کو بلیک میل کہہ رہے ہو کیسے اناڑی بیوپاری ہو جی۔ تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ میں جو چیز تمہیں پیش کر رہا ہوں، وہ تمہیں دوسرا کوئی نہیں دے سکتا۔

پہلا آدمی۔ تم دَر دَر کے بھکاری!

دوسرا آدمی۔ میں غریب ضرور تھا اور ہوں بھی مگر بھکاری کبھی تھا نہ ہوں۔

پہلا آدمی۔ تم مجھے کیا دو گے؟

دوسرا آدمی۔ تمہارا کل۔ تمہارے آج اور کل کے سر پر کچے دھاگے سے ٹنگی ایک ایسی دو دھاری اور نوکیلی تلوار ہے جس سے صرف میں ہی تمہیں نجات دلا سکتا ہوں۔

پہلا آدمی۔ تم مجھے ڈرا رہے ہو؟

دوسرا آدمی۔ ڈر تو تم خود ہی رہے ہو۔ دیکھو تم کانپ بھی رہے ہو۔ ذلت اور موت کے خوف نے تمہیں ایکدم جکڑ لیا ہے، تم اس خوفناک حقیقت سے آشنا ہو رہے ہو، جس سے تم نے کبوتر کی طرح آنکھیں مُوند کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھ لیا تھا۔ میں تمہارے مقدر کا آئینہ ہوں۔ سچائی کا وہ کرسٹل جس میں تمہاری زندگی، ماضی حال اور مستقبل کی ساری تفصیلات بے لباس رقصاں ہیں۔ تم سے سودا کر رہا ہوں۔

پہلا آدمی۔ کیسا سودا؟

دوسرا آدمی ۔ تمہاری آدمی جائیداد کے عوض میں تمہیں ماضی کے اژدہے سے آزادی ۔ حال کے خوف
سے رہائی اور مستقبل کے لیے سکون وردان دے رہا ہوں ۔
پہلا آدمی ۔ وقت میرے ساتھ ہے ۔ تم جیل سے بھاگے ہوئے ایک حقیر مجرم ہو اور میں اپنے معاشرے
کی ایک عزت دار اور معتبر شخصیت ———
دوسرا آدمی ۔ تم بیوقوف ہو، اتنا بھی نہیں جانتے کہ معاشرہ وقت کا غلام ہوتا ہے اور وقت بڑا منہ
کھٹ ہے ۔ وقت اپنی بات کہہ کر چلتا بنتا ہے رک کر، یا پیچھے مڑ کر کبھی نہیں دیکھتا ۔
سننے والے نے اس کی بات کو سنا سمجھا ہے کہ نہیں وہ اس سے بے نیاز رہتا ہے ۔ وہ کسی
کا دوست ہے نہ دشمن ۔ بس ایک تیز رفتار جھکڑ ہے ۔ زلزلہ، آندھی ——— وقت اور سکون
دو متضاد چیزیں ہیں میرے عزیز ———
پہلا آدمی ۔ تم ہمیشہ باتونی تھے ۔ تمہارا یہ لیکچر، باتوں کا یہ طلسم سب بکواس ہے، بے وزن، کھوکھلی
ہوا ۔ مجھے ساری دنیا جانتی ہے ۔ حاجی محمد رسول صاحب کے فرزند ارجمند حاجی عبدالرشید
کو ساری بمبئی جانتی ہے ۔ سوسائٹی میں میرا ایک مستقل مقام ہے ۔ ایک سزا یافتہ مجرم،
ایک سماج دشمن قاتل میرا کیا بگاڑ سکتا ہے ؟ ۔
دوسرا آدمی ۔ میں ملزم ہی نہیں ۔ وقت بھی ہوں ۔ جب کوئی پُر امن نیک شہری اور شفیق بزرگ بلا قصور
قتل کر دیا جاتا ہے، تو وقت اس منحوس سانحہ کی تصویر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے ۔
بعد میں یہی تصویر ایک ناقابل تردید شہادت بن جاتی ہے ۔
(فلیش بیک سیاہ دھند میں لپٹا ہوا ایک منظر)
ایک بے چہرہ نوجوان (پہلا آدمی) پلنگ پر دراز ایک نحیف و لاغر بوڑھے کی چھاتی پر چڑھا اس
کی چھاتی میں چھرا گھونپ رہا ہے ۔
بٹن کے دبنے کی آواز اور بجلی کی چکا چوند روشنی
نوجوان قاتل (پہلا آدمی) یہ کیا مسخرا پن ہے
اس کا نوجوان ساتھی (دوسرا آدمی) بوڑھا مرنے سے پہلے ایک نظر دیکھ تو لے اس کا نجات
دہندہ کون ہے ۔
دکیمرہ اس سارے ایکشن میں صرف دم توڑتے ہوئے بوڑھے کے چہرے پر ہی مرکوز ہے ۔ بوڑھے

کے چہرے پر ہی مرکوز رہے ۔ بوڑھے کی آنکھوں میں ۔ التجا ہے ، حیرت ہے ، خوف ہے ۔ ایک ہلکی سی چیخ ـــــ ایک ہلکی سی چیخ اور سب ختم)

قاتل کا نوجوان ساتھی (دوسرا آدمی) تم نے ایک پاکباز روح کو جھریوں بھری بیمار کھال کے چنگل سے رہا کر دیا ـــــــ

قاتل نوجوان (پہلا آدمی) حاجی صاحب اللہ کے گھر جانے کے لیے بیتاب تھے ۔

(دونوں کا قہقہہ جس میں ظلم اور نفرت کے علاوہ خوف و ملال کے عناصر بھی کارفرما ہیں ۔)

قاتل کا نوجوان ساتھی (دوسرا آدمی) لاؤ یہ چھرا اب مجھے تھما دو ، اور بلالو محافظان قانون کو میں قاتل کا کردار نبھانے کو تیار ہوں ۔ (اس ساری ایکشن میں وقت یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے)

(دھند ـــــ ایک ـــــ اور منظر)

مجرم (دوسرا آدمی) کٹہرے میں سر جھکائے کھڑا ہے ـــــــ

جج ۔ اور چونکہ مجرم نے خود بھی جرم کا اقبال کر لیا ہے لہٰذا میں اُسے ـــــــــــ

(دھند ۔ سیاہ و سفید بادل جو دھیرے دھیرے چھٹتے ہیں تو وہی پرانا منظر سامنے آجاتا ہے)

پہلا آدمی ۔ (سر کو زانوں میں دھرے سوچ میں گم ہے) تم سمجھتے ہو میں اعتراف گناہ کر کے ایک مری کھپی مصیبت کو گلے میں ڈال لوں گا ــــــــــــ

دوسرا آدمی ۔ میں نے کب کہا تھا کہ تم ایسا کرو ۔ میں نے تو وقت کی شہادت کی بات کہی تھی ۔

پہلا آدمی ۔ لے دے کر تم ہی تو ایک شہادت ہو ۔ کون مانے گا تمہاری شہادت ، اور کون بنے گا تمہارا گواہ ـــــــــ

دوسرا آدمی ۔ نجمہ ، میری بیوی

پہلا آدمی ۔ (حقارت سے) میری داشتہ ۔ میری رکھیل ـــــــ

دوسرا آدمی ۔ میری بیوی ، میرے بچے ، میرے اکلوتے بیٹے کی ماں بھی ہے ۔

پہلا آدمی ۔ باسی جلیبی

(فلیش بیک ۔ دھند میں لپٹا ہوا ایک اور منظر)

شراب میں دُھت ایک بے چہرہ نوجوان آدمی (پہلا آدمی) ایک بے چہرہ مظلوم عورت کو زبردستی پلنگ پر گرا کر اس کی عصمت دری میں کوشاں ۔ عورت چیخ چلا رہی ہے ، مرد قہقہے لگا رہا ہے

(ایک کونے میں کھڑا وقت یہ سب دیکھ رہا ہے)

دوسرا آدمی ۔ تم نے اس عورت کا جسم جھوٹا کیا ہے اس کی روح کی آبرو آج بھی بے عیب ہے ——

پہلا آدمی ۔ جو عورت درجنوں بار ——

دوسرا آدمی ۔ اس نے اپنے بیٹے کے تحفظ اور اس کے روشن مستقبل کے پیش نظر اپنا جسم تمہارے حوالے ضرور کیا مگر اس کی روح کی پاکیزگی بے داغ ہے ۔ آج بھی بے عیب ہے ۔

پہلا آدمی (طنزاً) کون مانے گا ؟

دوسرا آدمی ۔ وہی جس کا ماننا نہ ماننا ہی ضروری ہے، یعنی اس غریب بے سہارا ابلا کا شوہر ۔ میں

پہلا آدمی ۔ تم بے حیا ہو ۔ نکل جاؤ میرے گھر سے اسی وقت ورنہ میں پولیس کو بلوا کر ——

دوسرا آدمی ۔ (ٹیلیفون کا چونگا اٹھاتے ہوئے) لو بلاؤ پولیس کو اگر ہمت ہے تو ۔ مگر کہاں ۔ تم بزدل ہو ہر مجرم بزدل ہوتا ہے —— تمہاری ذلت، تمہاری موت تمہارے سامنے کھڑی ہے —

تمہارے ذہن کا توازن بگڑ چکا ہے ۔ تمہارا ذہن ماؤف ہو گیا ہے ۔ تم سوچنے سمجھنے کی حالت میں اس وقت نہیں ہو لہٰذا میں جاتا ہوں ۔ مگر (جیب سے تصویروں اور پرانے کاغذوں کا ایک پلندہ نکال کر دکھاتے ہوئے) ان کاغذات اور تصاویر میں تمہارے جرم کا ثبوت ہے ان میں ایک تصویر ایسی بھی ہے جس میں تم اپنے والدِ محترم کی چھاتی پر سوار ان کے دل میں خنجر گھونپ رہے ہو ۔ بوڑھے کے چہرے پر خوف اور حیرانی کی جو شبیہہ کھنچ آئی ہے اس سے بڑا ثبوت کیا درکار ہو گا قانون کو ——

(فلیش بیک ۔ اسی پہلے منظر کا وہی حصہ جس میں بوڑھے کا قتل ہو رہا ہے)

پہلا آدمی ۔ (تصویر کو چھیننے کے لیے جھپٹتا ہے)

دوسرا آدمی ۔ اسے دھکا دے کر گرا دیتا ہے)

پہلا آدمی ۔ تمہاری یہ مجال ——

دوسرا آدمی ۔ تم سمجھتے ہو میں تمہیں یہ سارے ثبوت جو تمہارا اقبالِ جرم ہیں اتنی آسانی سے لوٹا دوں گا ۔

پہلا آدمی ۔ (چل کر میز پر آ بیٹھتا ہے مگر کوئی جواب نہیں دیتا ۔ مڑ مڑ کر کلاک کی چلتی ہوئی سوئیوں کی طرف دیکھے جا رہا ہے)

دوسرا آدمی ۔ یہ تم ایک ٹک گھڑی کی طرف کیا دیکھ رہے ہو ۔ تمہارے اس کلاک کی ٹک ٹک بے معنی

آواز ہے۔ وقت کو سمجھنے کا ایک بڑا ہی ناکارہ اور ناقابل اعتماد آلہ۔ مگر اس وقت یہ بھی وہی کہہ
رہا ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ سُنو غور سے سُنو۔ یہ کیا کہہ رہا ہے۔

ایک ہنسی آواز۔ پس منظر میں وقت کی مدھم سی پرچھائیں

تیرے ساتھی کے بُرے دن ختم ہو گئے ———————

تیرے شروع ہو رہے ہیں۔

پہلا آدمی۔ حیران و ششدر، کسی قدر خوف زدہ بھی، مگر چُپ

دوسرا آدمی۔ چپ کیوں ہو۔ اتنے سارے اہل کار، ملازم ہیں تمہارے، اپنی اس بے بسی اور بے سہارگی
میں کسی کو پکارتے کیوں نہیں۔

(دور سے آتی ہوئی قدموں کی چاپ ———)

پہلا آدمی۔ (لپک کر میز کی دراز سے پستول نکال لیتا ہے)

اب تم میرے رحم و کرم پر ہو۔ پستول کی گولی ابھی تمہارے سینے سے پار ہو جائے گی اور میرے
آدمی تمہاری لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میرے پالتو کتوں کو کھلا دینگے۔ کسی کو کانوں کان خبر
نہ ہوگی کہ تمہارے ایسا کوئی آدمی اس گھر میں کبھی آیا بھی تھا۔

دوسرا آدمی۔ نو وارد، تمہارے آدمی نہ ہوئے تو ؟

پہلا آدمی۔ تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ حقیقت کچھ بھی رہی ہو، مگر ملک کا قانون تمہیں قاتل
تسلیم کر چکا ہے۔ تم میرے خاندان کے دشمن ہو۔ باپ کے بعد بیٹے کو قتل کرنے کے لیے جیل
سے فرار ہوئے تھے مگر بیٹے نے اپنی ذاتی حفاظت کے لیے تمہیں ہلاک کر دیا۔

دوسرا آدمی۔ کہانی اچھی ہے۔ ہر مجرم کی کہانی اچھی ہوتی ہے۔ دیکھتے کیا ہو۔ چلاؤ پستول ہم بھی دیکھیں
تم میں کتنا دم ہے۔

پہلا آدمی۔ یہ کوئی معمولی ریوالور نہیں۔ اس سے ایک اونٹ بھی ہلاک کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا آدمی۔ باتیں ہی بناؤ گے یا آزماؤ گے بھی اپنے اس ہتھیار کو ———————

پہلا آدمی۔ مرنے کے لیے بہت اتاولے ہو رہے ہو۔ لو (پستول چلاتا ہے) ایک بار، دو بار،
تین بار، چار بار

دوسرا آدمی۔ تم بھی خالی۔ تمہارا پستول بھی خالی۔

پہلا آدمی۔ (مسکرا کر) میں تو مذاق کر رہا تھا۔ اسی طرح جیسے ابھی ابھی تم۔

دوسرا آدمی ۔ میں نے کون سا مذاق کیا تھا

پہلا آدمی ۔ یہی کہ تمہارے پاس میرے ابو کی جان لیتے وقت کی تصویر ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تمہارے پاس اس قسم کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تم نے وہ منظر دیکھا تھا۔ تم اس واقعہ کے واحد چشم دید گواہ ہو۔ تصویر کا ذکر کر کے تم مجھے وہ منظر یاد دلانا چاہتے تھے، تاکہ میں ــــــــ

دوسرا آدمی ۔ (طنزیہ) بڑے سمجھ دار ہو گئے ہو یا وہ ہے تم نہیں ۔ تم نے اپنے باپ کا قتل کیوں کیا تھا؟

پہلا آدمی ۔ بوڑھا سٹھیا گیا تھا ۔ اپنی کمائی ہوئی دولت کے علاوہ ہماری آبائی جائیداد بھی نکمے اور ناکارہ قسم کے بھک منگوں میں بانٹ کر ثواب کمانا چاہتا تھا ــــــــ

دوسرا آدمی ۔ اور بات یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ زمین کا جو حصہ تم نے اپنی ذاتی رہائش کے لیے تجویز کیا تھا وہ اس پر بھی مسجد بنانے کے درپے تھا۔ تم نے اسے قتل کر دیا اچھا ہی کیا۔ تمہارا حق چھیننے کا اُسے کوئی حق نہ تھا

پہلا آدمی ۔ وہ اپنے خدا کو ہی حق مانتا تھا۔ میں نے اسے اس کے بنانے والے کے ہاں بھجوا کر اس پر ظلم نہیں، مہربانی کی تھی ۔

دوسرا آدمی ۔ اب آئے ہو نا راہ راست پر۔ مجھے اتنی بڑی بات ہضم کر جانے کے لیے کہہ رہے تھے بلا اجرت ۔

پہلا آدمی ۔ ارے بھئی، تم سیدھے راستہ سے یہ سارا ڈرامہ کھیلے بغیر اندر آتے تو ہم مل کر کاروبار کی بات کرتے۔ تم آئے ہی اس طرح کہ میرا موڈ بگڑ گیا۔

دوسرا آدمی ۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرے یوں وارد بلکہ نازل ہونے کا طور طریقہ مناسب نہیں تھا، مگر میں بھی کیا کرتا قید سے بھاگا ہوا مجرم اور آتا بھی کیسے ۔

پہلا آدمی ۔ سزا کی میعاد پوری کیے بغیر تمہارا یوں اچانک آدھمکنا ایک اچنبھا سا تھا۔

دوسرا آدمی ۔ تو تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے ۔

پہلا آدمی ۔ معاہدہ کہو میرے یار۔ وہ قرارداد میرے ذہن پر ایسے نقش ہے جیسے کل کی بات ہو۔ تم بہت بدل گئے ہو

دوسرا آدمی ۔ تم نے جیل نہیں دیکھی ورنہ میرے بھاگ آنے پر حیران نہ ہوتے ــــــــ مگر تم خود بھی تو ماشاء اللہ خاصے بدل گئے ہو ۔

پہلا آدمی ۔ میں منکر نہیں مگر تم تو ایک دم

دوسرا آدمی ۔ ہڈیوں کا پنجر ۔ قید با مشقت کے پانچ سال ۔ جیل کی سوکھی ادھ کچی یا ایک دم جلی بھنی روٹیاں اور تنہائی ۔ مگر تم تو ماشاءاللہ

پہلا آدمی ۔ ذرا فربہ ہو گیا ہوں ۔

دوسرا آدمی ۔ (زرا مسکراتے ہوئے) انڈر سٹیٹمینٹ کی تمہاری عادت نہیں گئی ۔ دیکھتا ہوں تم ویسے کے ویسے صاحب بہادر ہو

پہلا آدمی ۔ آزادی کے بعد ہماری شہری زندگی پر یورپ اور امریکہ کے رنگوں کی چھاپ اور بھی گہری ہو گئی ہے ۔ تم جانتے تھے کہ یہ تمہارا اپنا گھر ہے پھر بلا وجہ کھڑکی میں سے کود کر کیوں آئے؟

دوسرا آدمی ۔ ایک سزا یافتہ ملزم کو ایک شریف آدمی کے گھر چوروں کی طرح چھپ کر داخل ہونا چاہئیے ــــــــــ

پہلا آدمی ۔ ابھی ابھی تم کس تصویر کا ذکر کر رہے تھے، یہی جو تمہارے ہاتھ میں ہے، کیا ہے ۔

دوسرا آدمی ۔ چند تصویریں، چند خطوط جاناں ۔

پہلا آدمی ۔ مسکرا کر ۔ کس کی تصویریں کس کے خطوط ۔

دوسرا آدمی ۔ ہمارے تمہارے بچپن کی یادگاریں ــــــــــ

پہلا آدمی ۔ اب جب کہ بادل چھٹ گئے ہیں اور ہم تم ایک دوسرے کو ایک بار پھر سے اسی پرانی پہلے والی نظر سے دیکھ رہے ہیں، تو پھر ان پرانی دستاویز کو چھپانے سے کیا حاصل ؟

دوسرا آدمی ۔ (کاغذات کو جیب میں ڈال لیتا ہے)

پہلا آدمی ۔ دکھاؤ گے نہیں ؟

دوسرا آدمی ۔ کیوں نہیں ضرور دکھاؤں گا ۔ ان خطوط میں تم نے مجھ سے بارہا اپنے ابو کی بے راہ روی کے تذکرے کئے ہیں ۔

پہلا آدمی ۔ تب تو ظاہر ہے کہ یہ دستاویز میرے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہیں تم انھیں اتنے دنوں جیل میں کیسے رکھے رہے ۔

دوسرا آدمی ۔ یہ سب کچھ میں نجمہ کے پاس بحفاظت رکھ گیا تھا ۔

پہلا آدمی ۔ (خوفزدہ ہو کر) نجمہ ؟

دوسرا آدمی ۔ گھبرا کیوں گئے، نجمہ ہی نے تو مجھے نینی جیل سے فرار ہونے اور تمہیں اس طرح ملنے

کی ترغیب دی تھی۔

پہلا آدمی۔ تو وہ تمہیں اس مابین ملتی بھی رہی ہے۔ شیطان کی پر کالہ!

دوسرا آدمی۔ تم اپنے پیارے دوست اور پارٹنر کی بیوی کو گالی دے رہے ہو ——————

پہلا آدمی۔ اسے بیوی نہ کہو۔ بدن فروش عورت فاحشہ ہوتی ہے۔

دوسرا آدمی۔ عورت جب اپنی اکلوتی اولاد کے فلاح اور تحفظ کے لیے جسم کا سودا کرتی ہے تو وہ ماں ہوتی ہے فاحشہ نہیں ہوتی۔

پہلا آدمی۔ تم جانو۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو ایسی خبیث عورت کو منھ نہ لگاتا ——————

دوسرا آدمی۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو دوست کی بیوی کو زبردستی اپنے بستر کی زینت نہ بناتا۔ اس کا احترام کرتا۔ اسے اپنی ماں جائی بہن کی طرح رکھتا، اور دوست کے بیٹے کی پرورش اپنی بچی اولاد کی طرح کرتا ——————

پہلا آدمی۔ اب تمہیں کیسے بتاؤں کہ وہ خود اپنی مرضی سے، میرے ضمیر کے خلاف —————— میں آدمی ہوں گوشت پوست کا آدمی ہوں۔ موم کا کھلونا نہیں۔ وہ یہاں ہوتی تو ——————

دوسرا آدمی۔ وہ یہیں ہے۔ پردے کے پیچھے اپنے بیٹے کے ساتھ کھڑی وہ ہماری اس عجیب و غریب ملاقات کا نظارہ دیکھ رہی ہے اور رو قت کی وہ آواز بھی سن رہی ہے جسے تم نے مجھے جیل بھجوا کر اپنی دانست میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دبا دیا تھا

(بلند آواز) بخمہ۔ رشید۔ اندر آجاؤ بھائی ——————

نجمہ اور رشید پردہ ہٹا کر اندر آجاتے ہیں۔

پہلا آدمی۔ (تقریباً چلا کر) یہ سازش ہے، دھوکہ ہے، فریب ہے۔ مگر میں دیکھ لوں گا۔

(پردے کے پیچھے سے ایک بارعب آواز)

اب آپ کیا دیکھیں گے حاجی صاحب۔ آپ کا وقت ختم ہو گیا، اور ہاں اب اس کھلونے کو بھی پھینک دیجئے۔ اس کی گولیاں (پردے کے پیچھے سے ایک باوردی ہاتھ ابھرتا ہے) یہ ہیں۔

پہلا آدمی۔ یہ سازش ہے۔ یہ سازش ہے۔

پردہ ہٹتا ہے۔ پولیس آفیسر، سپاہی اور پہلے آدمی کے چند ملازمین کمرے میں

داخل ہوتے ہیں۔

پولیس آفیسر (ایک آدمی کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے) تم حاجی صاحب قبلہ کے سکریٹری ہو نا۔ تم نے قانون کا ساتھ دیا ہے، ہم سب تمہارے ممنون ہیں۔

پہلا آدمی۔ یہ سازش ہے، یہ سازش ہے، یہ سازش ہے (چلّاتے چلّاتے باہر کی طرف بھاگتا ہے)

پولیس آفیسر (مسکراتے ہوئے) باہر بھی آپ کے سواگت کے لیے ایک دنیا منتظر ہے۔ آپ کے کارندے کارخانوں کے مزدور، کالے کارناموں میں آپ کے زرخرید غلام۔ سب کے سب بڑے انہماک سے اس ٹی وی سرکٹ پر آپ کی شرمناک کہانی دیکھ رہے ہیں۔

سامن کی طرف دیکھ کر —— ایک جرم کے نشانات چھپا کر آدمی کتنا بڑا مجرم ہو جاتا ہے ——

نجمہ اور رشید دوسرے آدمی کے قریب آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ انھیں وفورِ محبت سے اپنی چھاتی سے چمٹا لیتا ہے۔

—— دھند۔ ——

وقت کی وہی پرانی شبیہہ۔

میں وقت ہوں۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ سب جانتا ہوں۔ سب دیکھتا ہوں۔

آدمی میں تیرا اساطیر نگار، تیرا مورخ، تیرا کہانی کار، تیرا فلسفی، تیرا شاعر ——

میں تیرا ——

—— دھند ——

پھر وہی منظر۔

کلاک کی ٹِک ٹِک۔ ٹِک ٹِک۔ ٹِک ٹِک

دل کی دھڑکن۔ دھک دھک، دھک دھک، دھک دھک

دونوں آوازیں ایک دوسرے میں گڈمڈ

دور سے اُلّو کے بولنے کی آواز

(کرسی میں دھنسے اسی پریشان حال پہلے آدمی کا خوف سے ہراساں چہرہ)

وہی آدمی۔ کیسی بھیانک، کیسی خوفناک رات ہے۔ کیسا ڈراونا خواب تھا۔ کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کا دروازہ کھولتا ہے۔ باہر خاموشی اور سکون ہے یا پھر ہر منٹ دو منٹ بعد آنے والی چوکیدار کی مانوس آواز۔

جاگتے رہو ——— جاگتے رہو ——— جاگتے رہو ۔ ———

آدمی ۔ سالا حرامی ۔ کیا مزے سے جاگتے رہو کی رٹ لگائے جا رہا ہے ۔ سارا دن تان کر سوتا ہے ، رات کو جاگتا ہے تو دوسروں کو بھی جاگتے رہنے کا مشورہ دیتا ہے ——— جاگتے رہو ——— تیری ایسی کی تیسی ——— مگر مجھ سے بہتر ہے اِس کی زندگی ———

میں نہ دن کو سوتا ہوں ، نہ رات کو ، میں نے نیند کے عوض ہی تو شیطان سے یہ سب (محل کی قیمتی اشیاء ، تجوری میں پڑی بے پناہ دولت اور قیمتی زیورات کا کلوز اپ) لیا ہے ۔ نیند نہیں آتی نہ آئے ———

فیاض رفعت
اے۔ آئی۔ آر۔ بمبئی

الف لیلیٰ

اسٹوو میں ہوا بھرتے ہوئے سلا سے میں نے جب پوچھا، کہ شہید گنج کہاں ہے، تو ایک لمحہ کے لئے اس کا چلتا ہوا ہاتھ رُک گیا۔ اس نے اپنی ناک 'فرن' کے پلّو سے صاف کرتے ہوئے کھنکار کر کہا۔

" صاحب شہید گنج کا کیوں پوچھتا ہے۔ بہت خراب بستی ہے۔"

" سلا، تو بالکل احمق ہے، میں پوچھتا ہوں، شہید گنج کہاں ہے؟"

" صاحب پہلے قہوہ پیو، کانگڑی میں آگ دہکا دی ہے بستر گرم کر دیا ہے۔" کبھی شہید گنج بھی جائے گا!

میں عاجز ہو کر بستر میں سمٹ گیا اور قہوے کی چسکیاں لینے لگا۔

سینچر کی شام تھی، مسلسل برف باری نے طبیعت میں عجب سی اداسی پیدا کر دی تھی۔ بخاری کے کوئلے سُلگ کر کبھی کے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکے تھے۔ میں دفتر سے اٹھ کر سیدھا امیرا بار کا راستہ پکڑنا چاہتا تھا۔

اچانک دروازے پر کوندہ سا لپکا۔ فہمیدہ صنم سامنے کھڑی تھی۔ اس نے مونگیا رنگ کے اونی شال کو عجب ڈھنگ سے اپنے جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا، کہ اس کے بولتے بدن کی منہ زور گولائیاں کچھ اور واضح ہو گئی تھیں۔ مجھے لگا جیسے کمرہ اچانک گرمی سے بھر گیا ہے۔ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ میرے برابر کُرسی کھینچتے ہوئے بولی۔

" سر! میں نے ایچ۔ ایم۔ ٹی کی نوکری چھوڑ دی ہے۔ میں ٹیچر ہو گئی ہوں۔ ہندوارہ بس میں جاتی ہوں۔ دوپہر کو آ جاتی ہوں۔ کبھی کبھی وہیں ہندوارہ میں رات گذر جاتی ہے خاصہ عرصہ گذرا ایک دن زبیر صاحب کے یہاں آپ سے ہلکی سی ملاقات رہی تھی جب آپ نے ریڈیو آنے کے لئے کہا تھا۔ پھر ایک دن بڈشاہ چوک میں شام کو

آپ مجھے گھور رہے تھے اور میرے سلام کرنے پر آپ جھینپ سے گئے تھے۔ یاد آیا؟"
اس پوری عورت کی مجسم سروں والی آواز میرے جسم کے سوئے ہوئے مساموں کو گدگدا گئی۔ شاعروں نے عورت کو جس قیامت سے تشبیہہ دی ہے۔ وہ قیامت اپنی تمام تر انگڑائیوں کے ساتھ میرے وجود پر غمزوں کی چھریاں چلا رہی تھی۔

"جی ہاں۔ خیال آیا۔ آپ کے ساتھ غالباً آپ کی چھوٹی بہن بھی تھیں۔"

"ایاز صاحب بُرا نہ مانیں تو مجھے یہ مصنوعی تخاطب پسند نہیں۔ تم کہنے میں آپ کو کوئی اعتراض ہے کیا؟" اس نے دانتوں میں انگلی دباتے ہوئے بڑی لگاوٹ کے ساتھ کہا۔

"نہیں ایسی بات تو نہیں، مگر خواتین کے ساتھ ......

"ایاز صاحب ذرا کھل کر بات کرنا ہی اچھا لگتا ہے۔"

اس نے بیچ سے لقمہ دیا۔ "تکلفات میں کیا رکھا ہے ___ اور پھر میں آپ کے پاس بڑی امیدیں لے کر آئی ہوں مجھے ریڈیو میں لگا دیجئے، خدارا تاکہ آپ کی قربت سے کچھ سیکھ سکوں، اپنی صلاحیتوں کو نمایاں کر سکوں۔"

میں نے گھبرا کر باہر نظر ڈالی۔ برفباری کا زور بڑھ چلا تھا، مگر میرا جسم حرارتوں کے سمندر میں دُھواں دُھواں ہو رہا تھا۔ دفتر میں ہو کا سناٹا تھا۔ بس فہمیدہ کا جسم بول رہا تھا پھڑپھڑاتا ہوا جیسے ابھی کپڑوں کی قید و بند سے آزاد ہوا چاہتا ہے۔

"سر آپ کہاں رہتے ہیں کل سنڈے ہے میں گھر آؤں؟"

"میں لداخی کالونی میں رہتا ہوں۔ آسکتی ہیں۔ مگر کیا آپ کا آنا مناسب رہے گا۔"

"میں آرہی ہوں، مناسب یا نامناسب کا فیصلہ بعد میں ہوتا رہے گا۔" اس نے گرم گرم سانسیں میرے چہرے پر چھوڑتے ہوئے اور سلام کر کے لہکتی ہوئی چل دی۔

اس کہانی میں دلچسپی لینے والوں کو بتلاتا چلوں کہ میرا نام ایاز سانیال ہے۔ میری عمر اڑتیس برس ہے۔ میری بیوی کو مرے ہوئے چھ برس ہو چکے ہیں اور میں اکیلا رہتا ہوں۔ تنہائی کے سناٹوں کے علاوہ میرا کوئی ساتھی نہیں۔ بس میں ہوں اور میری تنہائی ہے۔

دوسرے دن فہمیدہ آگئی۔ ساتھ میں اس کی بہن کوثر بھی تھی۔ میں بال کالے کر کے نہا دھو کر تیار بیٹھا تھا۔ روغن جوش تیار ہونے میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔ چولہے پر چاول

اُبل رہے تھے۔ سلاّ کچن کی کرسی پر بیٹھا 'پلے بوائے' میں ننگی عورتوں، کی تصویریں دیکھ رہا تھا اور ورق پلٹنے کے ساتھ ساتھ توبہ توبہ کر کے اپنے گالوں پر تھپڑ بھی مارتا جارہا تھا۔ مگر ننگی تصویریں دیکھنے کا سلسلہ برابر جاری تھا۔

فہمیدہ کے آنے سے لداخی کالونی میں جھماکا سا ہوگیا۔ میرے لداخی مالک مکان کی بیوی امالے اور اس کی خوبصورت بچیاں دروازے پر جمع ہوگئیں۔ فہمیدہ کے نظارہ سوز حُسن کو اپنی آنکھوں میں اُتارتی رہیں۔ اس نے جینز پہن رکھی تھیں۔ اور اس کے سر پر بالوں اور ازبکستانی ٹوپی تھی۔ مردانہ کپڑوں میں اس کا شباب فتح کے ڈنکے پیٹتا ہوا مجھ پر یلغار کر رہا تھا۔ کوثر سلاّ کا ہاتھ بٹانے باورچی خانے میں چلی گئی۔ مجھے اکیلا دیکھ کر فہمیدہ نے اٹھلاتے ہوئے میرے سینے پر ہاتھ پھیرا اور بے حد لگاوٹ کے ساتھ بولی۔

"ایاز صاحب ہماری دوستی کا" راز راز ہی رہے" پھر وہ مجھ سے اس طرح لپٹ گئی جیسے ہم دونوں کا برسوں یارانہ ہو۔ میں پیار سے اس کی ریشمی زلفوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ میرا سارا وجود جیسے گرمی کے سمندر میں زیروزبر ہورہا تھا۔

اسی دوران کوثر آگئی۔ اسے دیکھ کر فہمیدہ الگ ہوگئی۔ سلانے شاید اسے میرے سینے سے لگا ہوا دیکھ لیا تھا۔ وہ کشمیری میں بڑبڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے نیم غصے کی حالت میں اعلان کیا۔

"کھانا لگادیا ہے صاحب"

ہم لوگوں نے برسوں پرانے دوستوں کی طرح ہنسی خوشی کھانا کھایا۔ سلاّ جزوقتی ملازم تھا۔ وہ سلک مل چلا گیا۔ جہاں وہ چپراسی کی نوکری کرتا تھا۔ کوئی تین بجے کوثر نے اپنی چادر لپیٹی اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

"باجی مجھے ضروری کام ہے۔ تم بیٹھو شام تک گھر آجانا"

کوثر کے جاتے ہی فہمیدہ اپنی معشوقانہ کارستانیوں میں لگ گئی۔ ایک انگڑائی لے کر وہ بستر میں سمٹ گئی اور نیم وا آنکھوں سے مجھے تکنے لگی۔ اس کی ہری ہری سبز آنکھوں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے چرس کی خوشبو کا خیال آگیا۔ فہمیدہ کے جسم کا نشہ جادو بن کر میرے سر پر سوار ہو چلا تھا۔ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر میں اس کا جسم سہلانے لگا۔ گویا مساج میرا خاندانی پیشہ ہو۔ فہمیدہ نے ہاتھ بڑھا کر مجھے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اس کے گرم قندھاری

ہونٹ میرے چہرے کو چاٹ رہے تھے۔ آگ لگ چکی تھی۔ میں نے اندھوں کی طرح اس کے جسم کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔

اس نے میرے گال تھپتھپائے اور میرے سینے کو سہلاتے ہوئے کہنے لگی۔

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ میں تو آپ کی ہوں۔ بس آپ ذرا صبر کیجئے۔ جی بھر کے دو چار ملاقاتیں ہولیں۔ ذرا ایک دوسرے کو سمجھ لیں۔ پھر جیسی سرکار کی مرضی"

میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اناڑی پن سے کہا۔

"فہمیدہ مجھے چھوڑنا نہیں"

"ایاز صاحب، پیاسا کہیں کنوئیں کو چھوڑ کر جاتا ہے" اس نے اپنی آنکھوں سے گلابی چھلکاتے ہوئے کہا۔ اور پھر ایک لمحہ کے توقف کے بعد بڑی ادا سے بولی۔

"اور ہاں ایک گستاخی کی اجازت چاہتی ہوں"

میں نے آنکھیں اٹھائیں ــــ

"اک ذرا قمیض کے بٹن کھول سکتی ہوں"

میں چپ رہا۔ فہمیدہ نے قمیض کے بٹن کھولے اور میرے سینے کو بے تابی سے چومتے ہوئے بولی۔

"مجھے مرد کے جسم میں سب سے زیادہ یہ حصّہ پسند ہے مگر ایک بات پوچھوں، بُرا تو نہیں مانیں گے، پوچھوں نا۔؟"

"کیا"

"سر آپ کے سینے پر بال کتنے کم ہیں، ایسا کیوں ہے۔؟"

اس کے بعد فہمیدہ نے ایک سرد آہ بھری۔

"خالق صاحب کو آپ نہیں جانتے، شائد جانتے بھی ہوں۔ بات زیادہ پرانی نہیں، یہ ایچ ایم ٹی میں انجنیئر تھے۔ ان کے سینے پر ریچھ کی طرح بے حد گھنے بال ہیں۔ ان کے شانوں پر بھی بالوں کا بڑا سا گچھا ہے۔ کاش ایسا نہ ہوتا"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں حواس باختہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

"خالق نے مجھ سے محبت کی اور پھر مجھے دھوکہ دیا۔ ایک اور لڑکی سے شادی کرلی۔ کتنا کمینہ آدمی تھا۔ میں اسے بھول گئی ہوں، مگر اس کے سینے کے بالوں کو نہیں بھولتی۔ کاش

اس کے سینے پر بال نہ ہوتے۔"

معاف کرنا ایاز صاحب، میں ذرا سا جذباتی ہو گئی۔ اچھا آیئے آپ کو کچھ اشعار سنائیں۔
اس نے ہنس ہنس کر کچھ عشقیہ اشعار سنائے اور اپنی آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سو گئی تھی۔

پھر دن و رات فہمیدہ کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ میں اس کی محبت کے جال میں ایسا پھنسا کہ اپنی سدھ بدھ گنوا بیٹھا۔ شکنجے میں پوری طرح دیکھتے ہی اس نے جال کسنا شروع کر دیا۔ برفباری میں، آندھی طوفان میں وقت بے وقت مجھے اس کے یہاں آتے جاتے دیکھا جا سکتا تھا۔ رات کا کھانا اکثر فہمیدہ کے یہاں ہوتا۔ اس کی بہنیں مجھے بہنوئی سمجھتیں اور اس کی ماں داماد۔ راتوں کو گیارہ گیارہ بارہ بجے واپسی ہوتی۔

دفتر سے شہر تک اس عشق کے چرچے ہونے لگے۔ اسی دوران میرے ٹرانسفر کے آرڈر آئے۔ یہ خبر سن کر فہمیدہ ہچکیاں لے کر زار و قطار رونے لگی، گھنٹوں روئی، میں بھی اس کے ساتھ مل کر رونے لگا۔

میں نے ڈائریکٹر سے کہہ سُن کر اپنا تبادلہ التوا میں پڑوا دیا۔ اچانک ایک دن فہمیدہ کے پیٹ میں سخت درد اٹھا۔ اسے ہسپتال لے جایا گیا، مجھے بیماری کی اطلاع ملی تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ فوراً بڑے ڈاکٹر سے مل کر، میں نے اسے نرسنگ ہوم میں داخل کرایا۔ گردے میں پتھری تھی۔ آپریشن ہوا اور کامیاب رہا۔ میں رات رات بھر جاگ کر اس کی تیمارداری کرتا رہا۔ میری محبت کی خاطر بعض عمائدین شہر بھی فہمیدہ کی عیادت کو آئے۔

خدا خدا کر کے وہ سنبھلی۔ ایک دن شام کو اس نے مجھے اکیلا دیکھ کر اپنی چادر اٹھا دی۔ اس کی رانیں کندن کی طرح دہک رہی تھیں۔ بھر کراہتے ہوئے اس نے اپنا پیٹ کھولا۔ ناف سے ذرا اوپر زخم تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ہفتہ دس دن میں وہ چلنے پھرنے کے لائق ہو گئی۔ ڈاکٹر دار نے اسے چہل قدمی کی اجازت دے دی۔ میری دعائیں اور رات رات بھر کی ریاضتیں رنگ لا رہی تھیں۔ فہمیدہ کا سرخ گلاب چہرہ چمکنے لگا تھا۔ ایک دن اچانک اس نے کراہنا شروع کر دیا۔ میں کرسی پر اونگھ رہا تھا۔ گھبرا کر اٹھا۔

"ایاز صاحب، ڈاکٹر دار کو بلائیے، میں درد سے مر رہی ہوں"۔

ڈاکٹر دار کو تلاش کرتا ہوا میں ان کے کوارٹر میں پہنچا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے باہر آئے۔ انہوں گاؤن کے بٹن لگاتے ہوئے اپنا بیگ مجھے تھما دیا۔

فہمیدہ بدستور کراہ رہی تھی۔ ڈاکٹر دار نے مجھے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ دیر تک معائنہ کرتے رہے۔ میری جان پر بنی تھی۔

باہر آئے تو انہوں نے مجھے تشفی دی ــــ

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں، زخم بھر گیا ہے۔ کبھی کبھی ٹیسیں ہوتی ہیں! میں نے اچھی طرح معائنہ کر لیا ہے۔ مریض کی حالت ہر طرح سے بہتر ہے"۔

میں نے ڈاکٹر کا ہزار بار شکریہ ادا کیا۔ اور فہمیدہ کے کمرے میں پہنچا۔ وہ بیحد ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر کے ہاتھوں میں واقعی جادو تھا۔ کہنے لگی۔

"ڈاکٹر دار نے انجکشن دیا ہے طبیعت بالکل سنبھل گئی۔ اور ہاں ایاز صاحب، آپ بھی کئی دنوں کے جاگے ہوئے ہیں، جائیے آج گھر جا کر سو جائیے۔ آپ کو میری قسم۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مگر صبح جلدی آ جائیے گا"۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی گھر آ گیا۔ سلاّ آنکھیں ملتے ہوئے ہڑبڑاتا ہوا اٹھا، کانگڑی گرم کی اور لحاف کو میرے چاروں طرف لپیٹتے ہوئے خود بھی سونے چلا گیا۔

رات بھر مجھے بے چینی رہی۔ صبح اٹھ کر میں سیدھا ہسپتال گیا، پتہ چلا فہمیدہ چہل قدمی کے لئے باغ میں گئی ہے۔ باغ میں کوثر مل گئی۔ اس نے بتلایا۔ ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں ہے۔ میں تیز تیز قدموں سے ڈاکٹر کے معائنے کے کمرے کی طرف بڑھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ خدا نہ کرے، کہیں پھر تو حالت نہیں بگڑ گئی۔

فہمیدہ کی چوڑیاں کھنکھناتی آواز سن کر میں ٹھٹھک کر کمرے کے باہر ہی رک گیا۔ فہمیدہ ڈاکٹر سے کہہ رہی تھی

"ڈاکٹر دار مجھے تمہارے سینے کے گھنیرے سیاہ بال بہت پسند ہیں۔ بالکل ریچھ جیسے، اور ہاں تمہارے شانوں پر بھی تو بالوں کے گچھے ہیں"۔

دروازے کے سوراخ سے میں نے دیکھا۔ وہ بالکل برہنہ حالت میں ڈاکٹر کے سینے اور شانوں کو دیوانہ وار چوم رہی تھی۔

ف۔ س۔ اعجاز

(بخطِ شاعر)

غزل

غزل

مرے گھر کی اینٹیں چرا لے گیا وہ
نہیں جانتا ہے کہ کیا لے گیا وہ

اسے کیا ضرورت تھی وہ جانتا ہے
جو گھر میں پڑا تھا خدا لے گیا وہ

سرِ راہ جس نے کیا قتل میرا
ستم ہے مرا خوں بہا لے گیا وہ

مرا ادھ بچہ بہلتا تھا جس سے
وہ مکڑی کا ہاتھی اٹھا لے گیا وہ

سنا ہے کہ اس کو دھنی کر دیا ہے
فقیروں کی سچی دعا لے گیا وہ

اسے تو ضرورت تھی چنگاریوں کی
ہواؤں میں شعلے دبا لے گیا وہ

وہ کل آئے گا آگ اس میں لگانے
مری جھونپڑی کا دیا لے گیا وہ

لبھانے کی اس میں ادا کب تھی پہلے
مری شاعری کی ادا لے گیا وہ

وہ سب ہم سے مل کر بتا سو بتاتی
کہ سونے کا پانی چڑھا لے گیا وہ

●●

غزل

فرح جب ہوئی جذبوں کی رقم آپ ہی آپ
کھل گیا ہم پہ حسینوں کا بھرم آپ ہی آپ

اب کے روٹھے تو منانے نہیں آیا کوئی
بات بڑھ جائے تو ہو جاتی ہے کم آپ ہی آپ

روز بڑھتا تھا کوئی دستِ طلب اپنی طرف
سر سے ہٹتا گیا اک بوجھ بھی کم آپ ہی آپ

ان کے وعدوں پہ کوئی دن تو گزارا کیجیے
آپ بن جائیں گے تصویرِ الم آپ ہی آپ

جیسے بجھتا ہے کوئی پھول شرارا بن کر
حسن کی آنچ بھی ہو جائے گی کم آپ ہی آپ

آبگینوں کی طرح ٹوٹ گیا ٹوٹ گیا
خوابِ یوسف میں زلیخا کا بھرم آپ ہی آپ

شاخِ تنہائی سے پھل توڑیں گے دیکھے کیسے
عشق کے دیں بھی مزے لوٹیں گے ہم آپ ہی آپ

دیر تک چھائی رہی ایک اداسی دل پر
جانے کیا سوچ کے پھر ہنس دیے ہم آپ ہی آپ

میں کہاں آیا ہوں لائے ہیں تری محفل میں
مری وحشت کے مجبور قدم آپ ہی آپ

●●

Ehjaz F.S.
editor Mahnama INSHA
Insha Publications 6-A
Kamai Seal St. Calcutta
700073

نظمیں

ڈاکٹر اختر بستوی

انتباہ

لو سنو آج میں اک بات بتاتا ہوں تمھیں
ذہن کا ایک بڑا چور دکھاتا ہوں تمھیں
نصف بہتر ہو مری، ہمدم و دمساز ہو تم!
تم سے کیوں اِس کو چھپاؤں، مری ہمراز ہو تم
ایک دیوار کے مانند ہے میرا کردار
تم سمجھتی ہو جسے اپنی حفاظت کا حصار
لیکن اے جانِ حیا، اس پہ نہ تکیہ کرنا
پختگی پر نہ کبھی اس کی، بھروسہ کرنا
میرا کردار ہے اک عام بشر کا کردار
ایسا کمزور کہ ہو ریت کی جیسے دیوار
اس کے سائے کو کسی وقت بھی کھو سکتی ہو
اس تحفظ کے نہ رہ جانے پہ رو سکتی ہو

می گزرد

(۲)

مجھ پہ چھایا ہے اثر یوں مری بدحالی کا
جیسے شمشان پہ سایہ ہو مہا کالی کا
جذبۂ شوق نہ آئے گا مرے دل کے قریب
تازگی ہو نہیں سکتی کبھی مرگھٹ کو نصیب
مجھ سے کترا کے ہر اک جذبہ گزر جاتا ہے
قلب ویراں میں قدم رکھنے سے گھبراتا ہے
ہو نہ جس شخص کے دل میں کسی جذبے کی ترنگ
اس میں باقی نہیں رہتی کبھی جینے کی امنگ
میں مگر ایسے بھی عالم میں جئے جاتا ہوں
رات دن زہرِ غمِ زیست پیے جاتا ہوں

اعتراف

میں ایک ناکارہ ننگِ ہستی
تمہاری مجھ پر عنایتیں
محبتوں کی جو بارشیں ہیں
میں اس کے قابل مگر نہیں ہوں
اگر کبھی تھا۔
تو اب نہیں ہوں
یہ تم ہی سوچو
کہ میری باہوں میں آکے تم بھی
حیات سے کتنی دور ہو گی
عمل ہے بنیادِ نظم ہستی
عمل سے ہی ہے قیامِ ہستی
عمل سے ہیں دور میری راہیں
عمل سے خالی ہے ذہن مرا
یہ تم ہی سوچو
کہ میری باتوں میں آکے تم بھی
حیات سے کتنی دور ہو گی
مجھے دکھاؤ نہ علم کی جگمگاتی راہیں
کہ یہ جہالت کے گھپ اندھیرے
مرے لیے ایک آبِ حیواں
کہ جن میں ہر پل سسک سسک کر
میں جی رہا ہوں
یہ تم ہی سوچو
کہ میری باہوں میں آکے تم بھی

حیات سے کتنی دور ہو گی
نہ میرے ماحول کو کھنگالو
کہ گندے پانی کا ایک تالاب ہے یہ جس میں
ہزار مینڈک وضع وضع کے
ہزار بولی میں ایک ہی گیت گا رہے ہیں
ہمیں نہ چھیڑو، ہمیں نہ چھیڑو
کہ اس غلاظت سے مطمئن ہم
کثافتوں میں نہا رہے ہیں۔
اسی میں ہے زندگی ہماری
اسی میں ہے زندگی بھی میری
یہ تم ہی سوچو
کہ میری باہوں میں آ کے تم بھی
حیات سے کتنی دور ہو گی
کبھی یہ لگتا ہے
ماحول میں جنازے ہی رقص فرما رہے ہیں ہر سو
کفن سے آزاد ہو گئے ہیں
فضائیں خوشبو سے بھر گئی ہیں
کہ جیسے کافور جل رہا ہے
نظام ہستی پگھل رہا ہے
ہر ایک سو موت کی حکومت
حیات کو راستہ نہیں ہے
حیات سے واسطہ نہیں ہے
یہ تم ہی سوچو
کہ میری باہوں میں آ کے تم بھی
حیات سے کتنی دور ہو گی

باقر مہدی

ایک کالی غزل

(محمد علوی کے لیے!)

بکھرتا آسماں اچھا لگا ہے!
خلا میں وہ مکاں اچھا لگا ہے!

نہ جانے کیوں یہ باتیں ٹوکتی ہیں
ہمیں وہ بے زباں اچھا لگا ہے!

سمجھ بیٹھے اشاروں کی زباں تک
وہ بے کس نوحہ خواں اچھا لگا ہے!

فلک پر بادلوں کی ایک کشتی
ہوا کا بادباں اچھا لگا ہے!

برستی ہر طرف تنہائیاں ہیں
یہ رونق ناتواں اچھا لگا ہے!

سنبھل کر ٹھوکریں کھاتے رہے ہو
کہو، سود و زیاں اچھا لگا ہے!

سمجھ کر ہم کو آئینہ وہ بولے
یہ اندازِ فغاں اچھا لگا ہے!

ہماری چھت ٹپکتی ہے تو کیا غم
پڑوسی، سائباں اچھا لگا ہے!

خفا تم ساری دنیا سے ہو باقر
تمہیں کب یہ جہاں اچھا لگا ہے

EI, RAVI DARSHAN, CARTER RD. BANDRA,
BOMBAY- 400050

باقر مہدی

ایک کالی نظم

(ایک پاکستانی شاعرہ کے نام)

تمہارے نام سے جنبش ہوئی مگر کیسی؟
کہ ایک بھولی ہوئی یاد آ کے ٹکرائی!
خموش لفظ مرے ذہن میں خموش رہے
چھپی چھپی ہوئی شورش مگر اُبھر آئی!
ملے تھے ایسے کہ ہم دونوں آشنا جیسے!
ہزار حیف کہ مل کر بھی اجنبی ہی رہے!
سمجھ میں اب نہیں آتا کہ کیا لکھوں تم کو
کوئی تڑپتا ہوا شعر یا نئی سی نظم۔
عجیب بات ہے میں کچھ بھی لکھ نہیں سکتا
بس ایک خوف مسلّط ہے ذہن و دل پہ مرے
ہر ایک سمت وہی ظلم، چیخ نعرے ہیں.
ہزار چاہوں کہ روشن ہو ایک لمحہ بھی!
مگر اندھیرے میں زخموں کی روشنی کیسی؟
سمجھ لو اب مرے سینے میں آرزو بھی نہیں!
قیامت آ بھی چکی روز حشر ہو بھی چکا!
مگر جزا و سزا کے وہی طریقے ہیں.
کہاں یہ جا کے کوئی منصفی تلاش کرے؟
وہ ایک لفظ جسے خیریت سمجھتی تھی
کہاں گیا کہ یہاں بے کسی و حیرت ہے!
یہ خط کہاں ہے فقط صبر ہے ندامت ہے!!

باقر مہدی

ایک کالی نثری نظم

(ایک سابق دوست کی سالگرہ کے موقع پر کہی گئی تھی)

ایک مدت سے دروازے پہ دستک نہیں دیتا کوئی
پھر بھی اک سایہ سا۔ تنہا کھڑکی سے اُتر کر
کبھی کبھی میرے کمرے میں آجاتا ہے!
خاص کر — اتوار کی اُداس شاموں میں — !
پھر بید کی کرسی میں آرام سے لیٹ جاتا ہے!
اور دیر تک وہ اپنے تھکے ہارے پیروں کو گول میز پر پھیلاتا ہے!
اور کچھ دیر بعد وہ کبھی کبھی بے تابی سے اٹھ کر پاز، پو یا پابلو لاّن کی نظمیں
بک شلف سے نکالتا ہے!
پھر کچھ دیر بعد فرج سے چیز اور بیر کی بوتل نکال کر گلاس میں انڈیلتا ہے
آہستہ آہستہ چسکی لیتا ہے اور زیر لب گنگناتا ہے!
جانے کیوں۔
پھر عجیب سی جنونی کیفیت میں اپنے داہنے پیر کو فرش پہ
پٹکنے لگتا ہے!
جیسے نقارہ بجا رہا ہو!

جیسے ہی رات کمرے میں داخل ہوتی ہے!

وہ بلب جلتا ہے!
اور سورج کی آخری کرن کے ساتھ کہیں غائب ہو جاتا ہے!

بکھری ہوئی کتابیں، خالی گلاس اور لرزتا ہوا فرش
دیر تک اسے یاد کرتے رہ جاتے ہیں!
پھر رات بھر تیز ہوائیں میرے دروازے پر مسلسل دستک دیتی رہتی ہیں!
یہاں تک کہ صبح ہو جاتی ہے!

غزلیں
پرکاش تیواری

ہرا بھرا بار بخت ہو گا ۔۔۔ جھکا ہوا جو درخت ہو گا
نہ تاج ہو گا نہ تخت ہو گا ۔۔۔ غریب کا یہ ہی بخت ہو گا
جو لب پہ رکھتا ہے مسکراہٹ ۔۔۔ جگر اسی کا دو لخت ہو گا
جو دل میں رکھتا ہے بول سچے ۔۔۔ اُسی کا لہجہ کرخت ہو گا
خیال آیا نہیں ہے جس کا ۔۔۔ وہ لمحہ قربت میں سخت ہوگا
جسے سمیٹا ہے تیرے غم نے ۔۔۔ وہ دل کہاں لخت لخت ہوگا
سجالے اعمالِ خوش سے ہستی ۔۔۔ یہ کرم ہی تیرا بخت ہو گا
جسے ملے گا نہ عکس تیرا ۔۔۔ وہ آئینہ لخت لخت ہو گا
جب آئے گی غم کی دھوپ یارو ۔۔۔ کوئی نہ سر پر درخت ہو گا
ستم کبھی پرکاش اس کے لکھ لو ۔۔۔ یہ قصہ ورنہ دو لخت ہو گا

۲

لہو میں غرقاب ہو گئی ہے ۔۔۔ حیات پنجاب ہو گئی ہے
اندھیروں کا باب ہو گئی ہے ۔۔۔ یہ زیست بے خواب ہو گئی ہے
جھلس رہا ہے ہر ایک پتہ ۔۔۔ بسنت رُت خواب ہو گئی ہے
سنہری نگری تھی ایک یارو ۔۔۔ جو نذر سیلاب ہو گئی ہے
جو شے ہمیں تھی عزیز یارب ۔۔۔ وہ شے تو نایاب ہو گئی ہے
جو تیز رو تھی ندی میں کشتی ۔۔۔ وہ غرقِ گرداب ہو گئی ہے
کہاں تلک روئیں دل کے دُکھڑے ۔۔۔ نگاہ بے آب ہو گئی ہے
بہت ہی مشکل تھی زندگانی ۔۔۔ غموں کے اسباب ہو گئی ہے
شکستگی دیکھ کر نگر کی ۔۔۔ ہر آنکھ پُر آب ہو گئی ہے
ہٹا لو پرکاش منظرِ خوں ۔۔۔ حیات بیتاب ہو گئی ہے

2159- Lodhi Complex, N.D. 3

غزل

(بخطِ شاعر)

جینت پرمار

دیکھو اُڑے خیمہ ویران ہوا
اس کے بعد سفر آسان ہوا

خواب دکھاتا اور چُراتا ہے
جانے کون ہے دل حیران ہوا

ساری بستی اس کے ساتھ گئی
سایہ سایہ آتش دان ہوا

ایک حقیقت تھی جو اُٹھ گئی
ایک تماشا میری جان ہوا

چاند ابھی بازو میں اترا تھا
ساحل پہ کیا طوفان ہوا

اس کے پیچھے میرے کتنا ہے
ایک محل کیا عالی شان ہوا

شب بھر اس کی یاد رہی گھر میں
ایک سمندر بھی مہمان ہوا

دن میں کیا شور شرابہ تھا
شام ڈھلی اور سنسان ہوا

اس کو چادر تان کے سویا ہوں
مٹی کا کچھ یہ احسان ہوا

ایک ستارہ آنکھ میں ہے
خواب خیمہ آنکھ میں ہے

دور بہت ایک گھر ٹوٹے
چاند چہرا آنکھ میں ہے

زُلف کو چھو کر گزرتا
سوندھا جھونکا آنکھ میں ہے

لمس کا دریا چڑھا پھر
لمحہ لمحہ آنکھ میں ہے

جھانکتا ہے منظرِ شب
ایک پرندہ آنکھ میں ہے

رات شمع بھر روشن
دل کا پتہ آنکھ میں ہے

روٹھ جانے کیا لگتا ہے
حرف سادہ آنکھ میں ہے

عشق ہے ایسی پہیلی
دل دھڑکتا آنکھ میں ہے

نیند گہری نیند میں ہوں
گھر ہمارا آنکھ میں ہے

مشق بازی میں دھرا کیا
شعر سچا آنکھ میں ہے

جینت پرمار

غزل

حقیر آستانی

وسعتِ قلب و نظر دہر میں زنہار نہیں
کون کہتا ہے بشر اپنا گرفتار نہیں

یہ پرندے یہ چرندے یہ سمندر یہ ہوا
اور کچھ بھی ہو یہ انساں ترا شہکار نہیں

بھٹکا بھٹکا ہوا پھرتا ہے بشر شام و سحر
خود رسائی کے لئے پھر بھی یہ تیار نہیں

مرکزِ نقد و نظر خود کو سمجھ بیٹھا تھا۔
کوئی بازار میں یوسف کا خریدار نہیں

اور ہوں گے جنھیں دشوار محبت ہو گی
اپنا شیوہ ہے محبت ہمیں دشوار نہیں

اس کے آنچل میں کھلا کرتے ہیں پاکیزہ کنول
زینتِ خانہ ہے وہ رونقِ بازار نہیں

یہ ترا طرزِ عمل باعثِ حیرت ہے حقیر
شورشِ فکر نہیں گرمیٔ گفتار نہیں

حقیر آستانی

ستی

میں ستی ہوں
زندگی میری نہیں ہے
موت بھی میری نہیں ہے
میری قسمت کا تقاضہ ہے کہ میں
رہ جاؤں باقی ایک مشتِ خاک بن کر
ذلتِ ادراک بن کر

زندگی جیسے بھی گزرے
موت اِک تہوار بن جائے زمانے کے لئے
خوشیاں منانے کے لئے

ازحد ضروری ہے
کہ میں قربان ہو جاؤں کسی کے جسم خاکی پر
سراسر بے رُخ و بے جان ہے جو
وگرنہ میرے احساسات کی وقعت نہیں ہے
میری کوئی گت نہیں ہے

اُس جہاں کی بات بعد از مرگ ہو گی
کون جانے اُس جہاں میں
بُود میری
باش میری

نرک ہوگی سُورگ ہوگی

اس جہاں میں

میں اِسے چاہوں نہ چاہوں

زندگی میری نہیں ہے

موت بھی میری نہیں ہے

زندگی میری تو ہے مرہونِ مِنّت دوسرے کے نقش پاکی

موت ہے میری سماجی فِکر کی مرہونِ مِنّت

میرا اپنا کچھ نہیں ہے، میں

نہ اپنے ساتھ جلتی ہوں نہ مرتی ہوں ستی ہوں

بالِ وِدھوا تو نہیں ہوں[1]

غزل

تِرا ہم پایہ مشکل ہے ترا ثانی نہیں کوئی

تبسم سے تِرے ہٹ کر گُل افشانی نہیں کوئی

تِری بندہ شناسی ہے تری مہمان نوازی ہے

تِری خوشیوں کامیبوں کے بعد مہمانی نہیں کوئی

یہی تو وقت ہے ہنس ہنس کے مرے کا جہاں والو

کہ دیکھا جارہا ہے اور آسانی نہیں کوئی

اندھیرے پاس رکھتے ہیں اُجالوں کو لُٹاتے ہیں

جنابِ آب وگل ہیں آپ سا دانی نہیں کوئی

حقیر آتا ہی ہوگا بزم میں تیری خداوندا

کسی نے اسکو بہکایا یہاں فانی نہیں کوئی

---

[1] بالِ وِدھوا کا شوہر بچپن ہی میں گزر جاتا ہے اور وہ عمر بھر غیر شادی شدہ رہتی ہے

حقیر آستانی

بھاگل پور کے اندھے

(پولیس مظالم) سے متاثر ہو کر

سزا دینا جزا دینا خدا کے ہاتھ میں ہے
رعونت میں مگر انسان بن جاتا ہے خود اپنا خدا
بصیرت کو بصارت کو
نگل جاتی ہے اُس کی کور چشمی
ڈھونڈتا پھرتا ہے اپنے آپ کو ویرانیوں میں
گلشنِ جنّت سمجھ کر
جنّت الفردوس کہہ کر
اور جو کوئی پلٹ دے بات اس کی
دیکھ لے اُس کی جنوں سامانیوں کو
بند کر دے نطق اُس کا
اس کے دیدے پھوڑ دے گا
بڑھتی جائے گی جہالت
تا قیامت!

Dr. Keshow Chander
Sen 'Haqeer Astani'
702- Gold Crown
J. P. Road Andheri west
BOMBAY - 61

(بخطِ شاعر)

غزل

ربطِ جان و دل بھی ہے رنجشیں بھی ہوتی ہیں
دھوپ بھی نکلتی ہے بارشیں بھی ہوتی ہیں

ہلکی ہلکی بوندوں میں کچھ بدن تو بھیگے گا
موسموں کی صحبت میں لغزشیں بھی ہوتی ہیں

خواب، نیند، آنکھوں میں اک عجیب اُلجھن ہے
رات میں سیاہیٔ شب کی سازشیں بھی ہوتی ہیں

اُس کی دید کا موسم شاخِ دل ہری رکھے
وہ نظر نہ آئے تو پرسشیں بھی ہوتی ہیں

سیلِ بے پناہ جیسے سب بہا کے لے جائے
تن بدن میں کچھ ایسی شورشیں بھی ہوتی ہیں

خواب کی زمینوں پر گھر بنا کے رہتے ہیں
جاگتے ہیں پیروں میں گردشیں بھی ہوتی ہیں

زبیر رضوی

دستخط

ZEHNE JADID
1957, Turkman Gate,
DELHI-110006.

پریم نارائن سکسینہ
راز

غزلیں

۱

کوئی قدم بھی جب اوجِ کمال پر رکھا
تمہارے پاؤں پہ با انکسار سر رکھا

ہوا کا چلنا بھی مشکل ہے جس بلندی پر
جلا کے ہم نے چراغ اُس مقام پر رکھا

پرکھ کے سادہ مزاجی کو بارہا اُس نے
زمانے بھر کا ہر الزام میرے سر رکھا

ستم تو یہ ہے کہ خالق نے موم سے تن میں
چراغ جلتا ہوا دل میں عمر بھر رکھا

بہار بانٹ کے آپس میں باغبانوں نے
ہم اہلِ باغ کو کانٹوں کی نوک پر رکھا

کسی نے اپنا کھلونا بنا کے پردے میں
اسے نظر میں زمانے کی معتبر رکھا

نہ دی کسی نے بھی دادِ ہنروری اے رازؔ
بساطِ بزم پہ کیا سوچ کر ہنر رکھا

سکھدیو شرما رشک

ہر سمت اس جہان میں جس کا ظہور تھا
پہچاننا مگر اُسے مشکل ضرور تھا

دل میں لگی ہے آگ محبت کی خود بخود
اُن کا قصور تھا نہ ہمارا قصور تھا

وہ چاند چودھویں کا نہ آیا ہمیں نظر
کہتے ہیں لوگ شہر میں دیکھا ضرور تھا

آخر وہ رفتہ رفتہ گیا حسنِ تابدار
جس پر حضور آپ کو اِتنا غرور تھا

فرقت تو ناگزیر ہے اس سے مفر کہاں
بے وجہ بے قرار دلِ ناصبور تھا

اے رشک اب کہاں گئی وہ مستیٔ شباب
کل تک مرے وجود میں جس کا سرور تھا

کرشن موہن

ابتدائیہ

○

ایک سکُوتِ حیرت ہے حیوانوں میں
کتنی وحشت پھیل گئی انسانوں میں

مجُھ پر بھی ہو ایک نگاہِ کرم اے دوست
میں بھی ہوں تیرے مچلے دیوانوں میں

جس کو پی کر دیوانوں کو ہوش آئے
ایسی مے بھی ہے میرے پیمانوں میں

دیکھ کے تیرا روپ انوپ اے راحتِ دِل
جان آئی ہے تیرے سوختہ جانوں میں

اہلِ دُنیا نے جانا دانا مجُھ کو
اہلِ عِرفاں گِنتے ہیں نادانوں میں

میری حدیثِ باغی، معنیِ طاغی سے
ہلچل پیدا ہے اونچے ایوانوں میں

58-Pushpanjali, I.P. Extn II,
DELHI-110092

چنچل من کو خواہش بیکل رکھے گی
گھوم خواہ پہاڑوں پر، میدانوں میں

کیسا غضب ہے مجھ کو بنا کر دیوانہ
اس نے میرا نام لکھا فرزانوں میں

ہوش و خرد نے شہرِ جنوں ویران کیا
موسم بدلا، دھول اڑی مے خانوں میں

کرشنا موہن جذبِ شرارت غالب ہے
کیفِ حرارت اب ہے کہاں ایمانوں میں

کرشن موہن

اختتامیہ

مِلّتِ جانباز میں سے ہم بھی ہیں
اہلِ سوز و ساز میں سے ہم بھی ہیں

گرچہ ہیں وابستۂ عشقِ مجاز
محرمانِ راز میں سے ہم بھی ہیں

اک نظر ہم پر بھی ہو اے چشمِ ناز
کُشتگانِ ناز میں سے ہم بھی ہیں

گرچہ اب اِس میں نہیں ہم باریاب
محفلِ ممتاز میں سے ہم بھی ہیں

کیوں نہ ارفع ہو ہمارا مرتبہ
تارکانِ آز میں سے ہم بھی ہیں

دو کھردری غزلیں

کرشن موہن

نوائے رازِ غزل اور سوز و سازِ غزل
جوازِ نازِ غزل، شان و امتیازِ غزل

۱

چہرہ پژمُردہ اور شکستہ دانت
یاس و حسرت شباب کے اُپرانت
تیاگ دے اب تو موہ مایا کو
یاتری آگیا ہے انتم پرانت
بس گیا من میں اِس طرح انوراگ
ایسے ایکانت میں بھی یہ ہے اشانت
رنگ و رونق دلیلِ ہستی ہے
زیست میں کیوں ہو موت کا ایکانت
تن جو کمزور ہے تو کیا غم ہے
یہ بھی کیا کم ہے من تو ہے وِکرانت
ہم تو اُن اہلِ عشق میں سے ہیں
جن کو ملتا ہے مان مرنوپرانت
تب کھلا بھید اس کی عظمت کا
ہو گیا جب غریب کا دیہانت

نوجوانی ہے گرمیِ احساس
اور محبت بسنت، پالے اُڑنت
کامنی کے ملن سے کھل اُٹھا
کھویا کھویا ہمارا من دگنت۔
آج کل کے مشاعروں میں ہے
شاعروں کی مداریوں سی بھانت
روکھی روٹی بھی لطف دیتی ہے
لمبے فاقے سے جب ہو سوکھی آنت
اس میں جیون کا ہرش اور آدرش
روحِ فکر و شعور ہے ویدانت
کیوں بیاکل ہُوا ہوں دُبدھا میں
آتم وشواس تھا مرا سدھانت
کرشن موہن مرا اکیلا پن
مجھ کو رکھتا ہے صبح و شام اشانت

۲

اصل میں ہے ووٹوں کا، کاروبار نوٹوں کا
کرتے ہیں بڑے جس کو کام ہے وہ چھوٹوں کا
تُند، خود نگر نیتا، عامیوں کے آگے بھی
سر جھکائے رہتے ہیں جب سمے ہو ووٹوں کا
موسمِ بہاراں میں تو دُکھا گیا مجھ کو
دفعتاً اُبھر آنا دل کی سند چوٹوں کا
اب کہاں رسیلی رُت میری شوخ نظروں کی
اب کہاں ادھر موسم تیرے سرخ ہونٹوں کا
ذہن و دل نہ تھے ان میں، گرچہ ایک میلہ تھا
شوخ و شنگ سُوٹوں کا، کنٹھ کے لنگوٹوں کا

کلدیپ گوہر

غزل

یہ اشکِ خوں ہیں مرے اِن کو بے زباں نہ سمجھ
نشانِ سوزِ دروں ہیں یہ بے نشاں نہ سمجھ

صلاحیت کا تو کر پہلے اُس کی اندازہ
یُونہی ہر ایک کو سالارِ کارواں نہ سمجھ

چمن میں پھیل گیا ہر سمت سُرخ انگارے
بہار کا ہے یہ موسم اِسے خزاں نہ سمجھ

غم والم بھی ضروری ہیں زندگی کے لئے
فقط خوشی ہی کو معراجِ جسم وجاں نہ سمجھ

کسی کے ظاہر و باطن میں امتیاز بھی کر
ہر ایک شخص کو ہمدرد و مہرباں نہ سمجھ

یہی اُبھارتی ہے انقلاب پر اکثر
تو لَےِ نیم شبی کو فقط فغاں نہ سمجھ

یہی ہے فن جو ہے عُقدہ کشائے رمزِ حیات
سخن سرائی کو تو سعیٔ رائگاں نہ سمجھ

جنہیں ہے شام و سحر کام نُکتہ چینی سے
وہ اہلِ فن بھی ہوں گوہرؔ تو نکتہ داں نہ سمجھ

16-A, Pocket IV Mayur Vihar
DELHI - 110091

مخمور سعیدی

غزل

بے دست و پا ہوں اور ارادہ سفر کا ہے
میرے لیے بُلاوا یہ کس رہگذر کا ہے؟

یہ دل، کہ مدّتوں سے گرفتار گھر کا ہے
گھر کیا ہے؟ اک حصار سا دیوار و در کا ہے

منظر کا سارا حسن حجابات ہی کی دین
منظر ہو بے حجاب، تقاضا نظر کا ہے

میں نے بھری اڑان تو جھونکے بپھر گئے
سیلِ ہوا میں زور، مرے بال و پر کا ہے

بے آب کھیتیوں سے تو بچ کر چلا ہے تو
اے ابرِ خوش خرام ارادہ کدھر کا ہے؟

بھولا نہ جائے سانحۂ قتلِ آرزو
رشتہ نئے غموں سے پُرانی خبر کا ہے

دل کو تلاش، شہرِ نشید و نشاط کی
نقشہ، نظر میں وادیِ خوف و خطر کا ہے

جھکا کرے یہیں، مرے خیمے کے آس پاس
یہ آخری پڑاؤ نسیمِ سحر کا ہے

مخمور! ناشناسِ رہِ عشق ہم نہیں
ہم کو تو پاسِ مصلحتِ ہمسفر کا ہے

Delhi Urdu Academy
Ghata Masjid Road
DELHI - 110002

مخمور سعیدی

غزل

سفر ہے سہل مگر پھر بھی خوشگوار نہیں
کہ منزلوں کو مری، میرا انتظار نہیں

یہ بھیڑ خود مری مجبوریوں کی شاہد ہے
یہاں کسی پہ مجھے کوئی اختیار نہیں

خدا ہی جانے کسے، کس طرف بہالے جائے
ہوا کے سیلِ رواں کا کچھ اعتبار نہیں

جھلس بھی دے مرے کھیتوں کو تیز دھوپ اگر
میں بادلوں کو پکاروں، مرا شعار نہیں

میں سوچتا ہوں، خریدار کیا بنوں تیرا
محبت ایک عبادت ہے، کاروبار نہیں

بہت ہی خوب سہی شہرِ مصلحت کی فضا
مگر یہ کیسے کہوں میں، کہ ناگوار نہیں

پلٹ پلٹ کے وہاں کس لیے ہم آتے ہیں!
جہاں ہمارا کسی کو بھی انتظار نہیں

بساط ہی جب الٹ دی گئی تو پھر کیا ہے؟
کسی کی [illegible] اب کسی کی ہار نہیں

جہاں بھی جائیے وہ محفل اسی کی محفل ہے
کوئی دیار اسے اجنبی دیار نہیں

تو جنگلوں کی طرف لوٹ جاؤ تم مخمور
جو بستیوں کی فضا تم کو سازگار نہیں

مخمور سعیدی

رُباعیاں

تقدیر کا یہ کھیل ہے، کوئی بتلائے
یا محض اک اتفاق ہے، اتنا سمجھائے
مٹی پہ رکھو پانو، تو سونا نکلے
سونے کو لگاؤ ہاتھ، مٹی ہو جائے

خود پیشِ نظر مآل آ جاتا ہے
لمبا ہے سفر، خیال آ جاتا ہے
جب تیز ہوائیں رہ نما بن جائیں
رفتار میں اعتدال آ جاتا ہے

رمزِ ذات و صفات! روشن ہو جا
ظلمت کدۂ حیات! روشن ہو جا
اے جہلِ خرد کی رات! ڈھل جا تو بھی
اے معنیٔ کائنات! روشن ہو جا

رستہ اُن قدموں سے یہ مہکا ہو گا
اب بھی اِسے انتظار اُسی کا ہو گا
اس راہ سے خوشبوئے وفا آتی ہے
اس راہ سے اکثر کوئی گذرا ہو گا

جو سہہ گئے ان گنت یُگوں کی بیداد
اب لمحہ دو لمحہ انھیں ہم کر لیں یاد
لاکھوں جانیں گڑی ہیں بنیادوں میں
تب جا کے یہ بستیاں ہوئی ہیں آباد

محسن زیدی

غزل

سیلاب سنگ و آتش و خوں سے گذر کے ہیں
آیا ہوں اپنے پیشِ نظر پھر سنور کے ہیں

اب جا کے اس پہاڑ کی اونچائی ناپ لو
آیا ہوں جس پہاڑ سے نیچے اُتر کے ہیں

اُس کو مٹا سکے گا نہ موجِ ہوا کا ہاتھ
پانی پہ جا رہا ہوں جو تحریر کر کے ہیں

اب دھوپ پر کروں نہ قناعت تو کیا کروں
پتّے گرا چکا ہوں ابھی اس شجر کے ہیں

اے خاکِ شہر تو مجھے بے شک سمیٹ لے
آیا ہوں کتنا ٹوٹ کے کتنا بکھر کے ہیں

چہروں کے ازدحام میں ڈھونڈوں بھی کس طرح
اُس کو تو دیکھ بھی نہ سکا آنکھ بھر کے ہیں

آنکھوں سے ہو گئے وہ مناظر بہت ہی دور
اتنا قریب آ گیا اپنی نظر کے ہیں

اک روز محسن اس سے بچھڑنا ضرور تھا
بیٹھا ہوا تھا پہلے ہی افسوس کر کے ہیں

غزلیں

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاؔ

درِ جبیں سے اور چمکے اور وہ ہوا کب آئے گی
دل کی کھیتی کو ہرا کرنے گھٹا کب آئے گی

غنچہ غنچہ جس سے ہو جائے تبسم آشنا
میرے گلشن میں بھی وہ موجِ صبا کب آئے گی

جانے کب پائیں گے یہ ہم سا شعور زندگی
ان خرد والوں کو مرنے کی ادا کب آئے گی

کب تلک یونہی سہیں گے ہم زمانے کے ستم
کام آخر اپنی شمشیرِ انا کب آئے گی

رستے زخموں پر بھی جو کرتے ہیں ہنس کر تبصرے
ان جفا کاروں کو تہذیبِ جفا کب آئے گی

اُگتے سورج سے تو محلوں کے کلس چمکے مگر
ہر کسی آنگن تلک اس کی ضیا کب آئے گی

منشاؔ ہر لمحہ یہی رہ رہ کے آتا ہے خیال
آج کے انساں کو انساں پر دیا کب آئے گی

(۲)

زخم کو پھول کہا کرتے ہیں اب بھی کچھ لوگ
یوں ادا حقِ وفا کرتے ہیں اب بھی کچھ لوگ

یہ جسارت بھی نہیں ہے کسی اعجاز سے کم
زہرِ غم پی کے جیا کرتے ہیں اب بھی کچھ لوگ

خونِ دل خونِ تمنا کا سہارا لے کر
رنگ الفت میں بھرا کرتے ہیں اب بھی کچھ لوگ

کیا کہیں اپنے ہی رِستے ہوئے ناسوروں سے
کس طرح کسبِ ضیا کرتے ہیں اب بھی کچھ لوگ
آبروِ زیست کی رکھنے کے لئے ہنستے ہوئے
قسط در قسط مرا کرتے ہیں اب بھی کچھ لوگ
چند سکّوں کے عوض اپنا گرانمایہ ضمیر
جانے کیوں بیچ دیا کرتے ہیں اب بھی کچھ لوگ
کس قدر دیدہ دلیری سے خود اپنا الزام
سر پہ اوروں کے دھرا کرتے ہیں اب بھی کچھ لوگ
منشا آئینہ امروز میں نقشِ فردا
چپکے سے دیکھ لیا کرتے ہیں اب بھی کچھ لوگ

بلجیت سنگھ مطیرؔ-

کس کو فرصت ہے ترا رُوئے منوّر دیکھے
تیری آوازِ فسوں خیز پہ سر کون دُھنے
ہر طرف شورِ سیاست سے ہے کہرام مچا
تیری پازیب کی جھنکار کو اب کون سُنے
دنیا کے مصائب ہیں مرے شوق کی پائل
ہر راہِ سفر میرے ارادوں کی ہے سائل
آلام و غمِ دنیا نے بخشا ہے جو مجھ کو
وہ دردِ مسلسل ہے مری زیست کا حاصل
حق بات سرِ دار و رسن مل کے کہیں دوست
دکھ درد زمانے کے بھی آ مل کے سہیں دوست
تُو میرے بنا خام ہے، میں تیرے بنا خام
آ بل کے پییں، مل کے جییں مل کے رہیں دوست

قطعات

ایک سلطان سے چھٹکارا تھا چاہا ہم نے
اُس نے جمہور کے پردے میں سلاطین دیے
ساقیِ وقت کی بیدادگری تو دیکھو
اس نے انصاف کے طالب کو قوانین دیے
ایک ظالم ہے، ایک فاسد ہے
ایک ہی شے ہیں آج شاہ و فقیر
تا بہ مقدور آدمی سے بچو
اس کے منہ خون لگ چکا ہے مطیرؔ

مظہر امام

غزل

میں عکس عکس رنگِ بہاراں میں کھو گیا
یہ حادثہ عجیب ہے، ہونا تھا، ہو گیا

جلتی ہوئی سڑک پہ اکیلا رہا سفر
جب برف گر رہی تھی ترا ساتھ ہو گیا

اب دیکھیے کہ فصل ہو کس کے نصیب میں
میں تخمِ خواب رات کی کھیتی میں بو گیا

میں ساحلِ مراد پہ تھا تیرا منتظر
لہروں کا زور دل کا سفینہ ڈبو گیا

جاگا رہا جو بسترِ شب پر تمام عُمر
وہ کون تھا جو آج سرِ صبح سو گیا

آیا تھا وہ بہار کا موسم گزارنے
اپنے لہو میں اپنا سراپا بھگو گیا

اٹھو کہ اب تو صبح ہوئے دیر ہو گئی
وہ داستانِ درد سنا کر، سُنو، گیا

استفسار

اے دشتِ غم کے ساکنو
کیا تم نے سوچا ہے کبھی
وہ ہاتھ کس کا ہاتھ ہے
جس کے اشارے پر یہاں
چلتی ہیں غم کی آندھیاں

اے دشتِ غم کے ساکنو
کیا تم نے سوچا ہے کبھی
کس چارہ گر کے فیض سے
آباد ہیں اس دشت میں
بے چارگی کی بستیاں

اے دشتِ غم کے ساکنو
کیا تم نے سوچا ہے کبھی
کس ڈال کا پنچھی ہے وہ
جس کے پر پرواز نے
بخشی ہے تم کو پستیاں

اے دشتِ غم کے ساکنو
کیا تم نے سوچا ہے کبھی
اس زخم زارِ وقت سے

روٹھی ہوئی ہیں کس لیے
رنگیں، نظر کش تتلیاں

اے دشتِ غم کے ساکنو
کچھ تو کہو، کچھ تو کہو
اُس شہر کا بھی نام لو
جس کے دھوئیں کی اوٹ سے
برسی ہیں تم پر تلخیاں ....

B3/269, Paschim Vihar,
NEW DELHI-110063

پدما سچدیو

ساگر

(ڈوگری سے ماخوذ)

تم ساگر تھے
دھیر، ویر، گمبھیر، مہان
لہر لہر مٹھی میں باندھے
دور کھڑے تم دیکھ رہے تھے
اُمڈ امڈ کر لہریں آتیں
لینے مجھے آغوش میں اپنی
بندھن میں کس دیئے تمھارے

❋

دور ہمالہ کے بالوں میں
جمی ہوئی میں پگھل رہی تھی
اس کی بند آنکھوں سے بہہ کر
اُس کے تپے ہوئے تن کو دھو دھو کر
پیچھے مُڑ مُڑ، دیکھ دیکھ کر
بہہ آئی میں
چیخوں کی اکولاہٹ کے شور
میرے پیچھے پیچھے آئے
پھولوں کے کھلنے کے سُر بھی
میرے من کے پیچھے بھاگے
لیکن مجھ کو چھو نہ پائے
تم تک پہنچ گئی میں ساگر
تیری ہی ہوگئی میں ساگر

تم پانی تھے، میں پانی تھی
تم تھے کھارے، میں تھی میٹھی
میں تو اپنا آپ گنوا کر کھاری ہوگئی
کنڈل جیسی نازک تھی میں
بھاری ہوگئی
تجھ میں کھو کر ساگر میں بھی ساگر ہوگئی
میں میں نہ رہی
پر تم
تم ہی رہے
ندی کبھی بھی نہ بن پائے
آخر تم بھی پرش ہی نکلے
میں مورکھ تھی
میں سمجھی تھی
تم کو ساگر
دھیر، ویر، گمبھیر، مہان!

سنواگھر۔ ۱۶ ٹوڈرمل لین - نزد بنگالی مارکیٹ
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
فون- ۳۸۸۸۴۶

(بخطِ مترجم)

ڈاکٹر وِسلیز وٹاکینیز

تاخیر

مترجم: رام پرکاش راہی

Ram Prakash Rahi
198, AGCR Enclave,
Delhi 110092

ہوا چل رہی تھی

تو کانوں میں شاید ہی کچھ کہہ گئی تھی

پرندہ بھی جب آسماں میں اُڑا تھا

تو شاید ہی کچھ چہچہاتا گیا تھا

"سمے کی روش اُس سے بھی تیز تر ہے، جو تم سوچتے ہو"

بڑی سادگی سے پکارا جو میں نے :

کہ اے بھاگتے وقت کے شوخ پیکر!

ٹھہر، دیکھ، مجھ سے، بہت کچھ، یہاں،

ان کہا، ان کیا، رہ گیا ہے"

تو گونج ایک انکار کی لے میں بولی :

"عبث، سب عبث ہے،

کہ تاخیر کی انتہا ہو چکی ہے۔"

راہی

(بخط مترجم)

۲ - سورج کے بعد ستارے

رام پرکاش راہی

وہ گدرایا سا آسمانی انار
ریشمی بادلوں کی سبک اوٹ میں
محو تھا جیسے چھپنے چھلکنے کی کھلواڑ میں
کسی اُبھری اُبھری، کڑی سطح پر پاش پاش ہو گیا
دلِ آتشیں اس کا ٹوٹا، کھلا
ریزہ ریزہ ہوا اور بکھرا۔
اِدھر سے خفا، نور کے ان گنت بیج نکلے
اُدھر، نیلگوں آسماں کی دلآویز پہنائیوں میں
اُگے تھے کئی ٹمٹماتے ستارے!!

از: ڈاکٹر ولسلیز وٹاکشنز
یونانی شاعر

مترجم: رام پرکاش راہی

راجندر سنگھ ورما

ادھیڑ عمر — کملا داس

مسافت زیست

درمیانی عمر ہے وہ مرحلہ

جب تمہارے لاڈلے

شیوۂ انس و محبت چھوڑ کر

نکتہ چینی کو بناتے ہیں شعار

ہے یہ وہ ہنگام جب ان کا شبابِ عنفواں

پُرصلابت، باوقار

اپنا کویا توڑ کر نکلے ہوئے

کرم کی مانند ہوتا ہے عیاں

اب انہیں حاجت تمہاری ہے بس اتنی ہی کہ تم

استری ان کے لباسوں پر کرو

یا بنا کر چائے دو

تم کو البتہ ابھی ان کی ضرورت ہے بہت

لامحالہ ناگزیر

تا کہ جب بھی تم ہو تنہائی کے زنداں میں اسیر

ان کی چیزوں اور کتابوں کو چھوؤ

(دیدہ و دل سے لگاؤ)

اور چپکے چپکے دو آنسو بہاؤ

درمیانی عمر ہے وہ مرحلہ

جب تمہارا لاڈلا

عہدِ رفتہ میں جسے

اک بڑی بھاری ضیافت کے لئے

آبِ زر سے رقعۂ دعوت لکھا
اور سپردِ ڈاک اسے
رات کے وقت اپنے ہاتھوں سے کیا
— تم کو بیزاری سے کہتا ہے کہ "ماں!
زندگی بھر تم نے کی ہے خواب زاروں میں بسر
اب خدارا تہہ کر دو یہ بسترِ خوابِ گراں
جانتی ہو کون سی منزل میں ہے
اب تمہاری زندگی کا کارواں ؟"

(انگریزی سے ترجمہ

۲:۔ کفر — امریتا پریتم

آج میں نے ایک دنیا بیچ کر
اس کے بدلے مول لے لی جنس دیں
دیکھو کیسی کافرانہ بات کی
اپنے سپنوں سے بنایا ایک تھان
کر کے چاک اس میں سے گز بھر پارچہ
میں نے اپنی زیست کی چولی سلائی
آسماں کے جام سے ڈھکنا ہٹایا
اور پیے چاندنی کے گھونٹ چار
اپنے گیتوں سے چکا جاؤں گی میں
موت سے جو لی ہے اک ساعت اُدھار

(پنجابی سے ترجمہ)

Prof. Rajinder Singh Verma
Ghas Mandi Sheranwala Gate,
PATIALA (Panjab)

۴۔ای/۱، جھنڈے والان ایکسٹینشن۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۵۸

ٹیلی فون: 52887،52049

"شامِ یاراں"

مورخہ

مکرمی!

تسلیمات۔ "شامِ یاراں" کی ماہ ...... ۱۹ء کی محفل شعر و ادب مورخہ ......

۱۹ء کو بروز شام کے بجے مندرجہ بالا پتہ پر منعقد ہوگی۔ لہٰذا التماس ہے کہ محفل میں شرکت فرما کر اپنے کلام بلاغت نظام سے دوستوں کو محظوظ فرمائیں

یہ جگہ ناز سینما کے عقب میں واقع ہے۔

نیاز مند

رگھوناتھ گھئی کنوینر

تناظر کے ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی نمبر دسمبر ۱۹۸۷ء

میں ہم اپنے قارئین کا تعارف "شامِ یاراں" سے کروا چکے ہیں۔

اوپر لکھی عبارت اس دعوت نامے کی نقل ہے جو جناب رگھوناتھ گھئی

ناتھ، کنوینر "شامِ یاراں" ہر ماہ مقامی شعراء حضرات کی خدمت میں

بھجواتے رہتے ہیں۔

یہ محفلیں عام طور پر ہر ماہ کے دوسرے سنیچر کی شام کو ان کے

دولت کدہ پر منعقد ہوتی ہیں۔ باہر کے اردو اور ہندی شعراء جب کبھی دلی

تشریف لائیں تو ان محفلوں میں شرکت فرما کر "شامِ یاراں" کی رونق بڑھائیں

اس شمارے کے صفحات (ص تا ص) کی تخلیقات

"شامِ یاراں" کی فائلوں سے لی گئی ہیں۔

(ادارہ)

اُردو اکادمی، دہلی
آپ کی
اپنی اکادمی ہے
رابطہ: گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی
فون: ۲۷۶۲۱۱ - ۲۶۳۴۴۸
سیکریٹری

ساہتیہ اکادمی

(قومی اکادمی برائے علم و ادب)

اکادمی کے اغراض و مقاصد

۱۔۔۔ ہندوستان کی چوبیس زبانوں (جن میں انگریزی بھی شامل ہے) کے علم و ادب کا تحفظ اور ارتقا اور ان زبانوں کی معیاری تصنیفات کی اشاعت۔

۲۔۔۔ کسی ایک ہندوستانی زبان کے کلاسیکی ادب کا دوسری ہندوستانی زبانوں میں اور غیر ملکی ادب پاروں کے ہندوستانی زبانوں میں صحیح و مستند تراجم کا اہتمام اور اشاعت۔

۳۔۔۔ معیاری علمی اور ادبی تصنیفات کے مستحق مصنفین کی حوصلہ افزائی کے طور پر ہر سال قومی انعامات کی تقسیم۔

۴۔۔۔ علمی اور ادبی موضوعات پر سمینار، مصنفین کی نشستیں، کتابوں کی نمائشیں اور دیگر ادبی اجتماعوں کا اہتمام۔

۵۔۔۔ معزز، ممتاز اور قابلِ تعظیم ادبی شخصیتوں کی قدر و منزلت اور عزت افزائی کے طور پر انھیں اکادمی کے فیلو (رفیق خصوصی) کے اعزاز سے سرفراز کرنا۔

۶۔۔۔ انگریزی میں انڈین لٹریچر، سنسکرت میں سنسکرتی پرتیبھا اور ہندی میں 'سم کالین بھارتیہ ساہتیہ' جیسے معیاری رسائل و جرائد کی اشاعت۔

۷۔۔۔ یونیسکو کے اشتراک و تعاون سے ہندوستانی کلاسیکس کی بیرون ممالک میں اشاعت۔

ساہتیہ آکادمی
رابندر بھون
۳۵۔ فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

Sahitya Akademi
(National Academy of Letters)
Rabindra Bhavan,
35, Ferozeshah Road, New Delhi 110 001
gram : Sahityakar 'phone : 38 66 26

رگھوناتھ گھئی
A E/1 جھنڈے والان
اکسٹینشن نئی دہلی ۱۱۰۰۵۵

پیری میں عشق

کیوں بتوں کا عشق پیری میں بھی قائم ہے ہنوز
اک حسیں چہرے پہ اب بھی کیوں مچل جاتا ہے دل
کیا کروں اس دل کا، کافر یہ ابھی تک ہے جواں
دید کی حسرت میں اب بھی ہچکیاں کھاتا ہے دل

نوجوانی میں محبت کا جنوں کچھ اور تھا
نوجوانی میں محبت درد کا عنوان تھی
نوجوانی میں محبت نشۂ لطف سرور
نوجوانی میں یہ اک چبھتا ہوا پیکاں نہ تھی

نوجوانی میں تمھارے حسن کی رنگینیاں
دعوت عشرت تو تھیں پر درد کا ساماں نہ تھیں
نوجوانی میں تمھارا قرب تھا عیش و نشاط
وصل کی راتیں وقارِ عشق کے شایاں نہ تھیں

حسن کے عارض پہ وہ کھلتا ہوا رنگیں گلاب
وہ گھٹا زلفوں کی وہ بہکی ہوئی نظروں کی چاہ
وہ سرکتا ریشمی آنچل۔ وہ پتھریلا شباب
وہ بدن مہکا ہوا۔ وہ چال وہ دل کش خرام

حسنِ نسوانی پہ وہ کھلتی جوانی کا فسوں
روح پرور ہر ادا۔ غارت گرِ دنیا و دیں

جنبشِ مژگاں میں لرزاں عشوہ ہائے دلنواز
جانِ لیوا حسن کی اِک اِک ادائے دِل نشیں

بارگاہِ حسن میں یاں دِل لٹا دینے کا شوق
واں جھجکتی آرزوئیں جانگسل خاموشیاں
بولتی نظروں میں باہم عہد و پیمانِ وفا
پُر تکلّم خامشی میں عشق کی سرگوشیاں

باہمی لطف و ہم آہنگی کی وہ سرمستیاں -
وصل کے لمحے ہوا کے دوش پر بہتے ہوئے
سلوٹیں بستر کی شب کے راز بتلاتی ہوئی
بال اُلجھے سے کہانی رات کی کہتے ہوئے

اِک ہوس تھی۔ تشنگی تھی عشق کہتا تھا اُسے
گرمیٔ خوں کو محبت کا فسوں سمجھتا تھا میں
بوسۂ لب سے جوانی میں جو پاتا تھا سکوں
واسنا تھی۔ پیار کا اِس کو جنوں سمجھتا تھا میں

بھوک تھی جسموں کی اُس میں پیار کا جذبہ نہ تھا
طالبِ عشرت جوانی باہیں پھیلائے ہوئے
کامنا تھی۔ پیاس تھی۔ تسکینِ طلب مجبور سی
لالسا کی آگ سی پہلو میں بھڑکائے ہوئے

لیلٰے وسلمہ کا غلبہ تھا میرے اعصاب پر
صورتِ خوش دیکھ کر مدہوش ہو جاتا تھا میں
عشرت و شوقِ شراب و شعر میں ڈوبا ہوا
حافظ و خیّام کے انداز میں گاتا تھا میں

آج جب دیکھا تجھے تو دل کو کچھ ایسا لگا
درد کی دنیا میں کتنی بیکراں ہے زندگی
پیار کے ماحول میں پلتی ہوئی بڑھتی ہوئی
کس قدر دلچسپ ہے کتنی جواں ہے زندگی

حسن فانی ہے تو ہو پر مجھ کو ہے کامل یقیں
حسن پر تیرے رہے گا تا ابد یوں ہی نکھار
عشق کی صہبا سے کھیتی حسن کی شاداب ہے
عشق سے ہی حسن کی دنیا میں ہے رنگِ بہار

انبساطِ روح کی منجدھار میں بہتے ہوئے
لطف بے پایاں کی گہرایوں میں کھو جائیں گے ہم
زندگی اور موت کی مجبوریوں سے بے نیاز
عشق کے فردوس میں ابدی بقا پائیں گے ہم

ٹیسٹ ٹیوب بے بی

تم کب مر گئے، مجھے خبر ہی نہ ہوئی
میں تمہیں زندہ سمجھتی رہی
تمہاری مردہ اولاد کو جنم دیتی رہی
اور ہر نو مولود کو، مردان خانہ کی بھینٹ چڑھاتی رہی
میں جانتی تھی کہ انہیں بھی حنوط کیا جا رہا ہے
خوبصورتی سے، بالکل تمہاری طرح
کمالِ فن کی داد دیتی ہوں کہ
میں!
تمہاری سانسوں کے قریب جانے والی نہ پہچان سکی کہ
تم مر چکے ہو
مگر ابھی تو کچھ دن پہلے تمہارے بازو بڑے جوش سے پلتے تھے
کبھی دایاں بازو، کبھی بایاں بازو
تمہاری آنکھوں میں۔ ہونٹوں میں جنبش تھی
زندگی کی سرخی، تھی
کتنے پیارے لگتے تھے
ہاں مگر خوفناک بھی
جب کھردری زبان سے
میرے تلوے پیار میں نہیں بو کہ
اس غرض سے چاٹتے تھے کہ سیسہ پلائی
(زنان خانہ) کی اس چار دیواری سے باہر نہ جا سکوں

اور میں تمہارے کمزور پیلے دانتو کو بھی
کشار سے تشبیہ دیتی رہی، خود کو دبکاتی
اور تمہیں پیار کرتی رہی
کہ تم زندہ ہو
تمہارے گال سرخ ہیں
اپنی کوکھ کی جنی ساری
تمہارے بیٹوں کے ساتھ. رغبت سے سونے کی تربیت دیتی رہی
کہ یہ ہی اُن کا انعام ہے ¹ے
اور نکیل سے تیکھی نتھ پہن کر
چابک کے سائے میں
خود کو تمہاری اقتدا ہانکتی رہی
بنایہ جانے کہ مردہ بیجوں کی تخم ریزی سے جُٹی ہوں
کیونکہ
تم کب، مر گئے، مجھے خبر ہی نہ ہوئی
تھے تو حنوط مگر ہو بہو زندوں کی طرح
تم کو باندھے ان
مردان خانہ میں
تمہارے ذریعے کیا کیا حاصل کیا
یہ تو وہی جانیں
میں تو تب کھٹکی
جب زنان خانہ کے رنگ آلود قفل ٹوٹے
طلسم بھری آوازیں مجھے پھسلانے لگیں
اور تم گونگوں بہروں کی طرح ان میں شامل ہو گئے

۱ے تمہیں اپنے شوہروں کے ساتھ رغبت سے سونا چاہیے. کیونکہ یہی تمہارا انعام ہے (قرآن شریف کی ایک آیت)

تو جان گئی
تم تو کب سے مر چکے ہو، مجھے ہی خبر نہ ہوئی
طلسم بھری آوازیں پھر اُبھریں مجھے پھسلانے لگیں
مگر مجھ میں
ہوس کم اور برداشت زیادہ ہے
غرض کم اور ممتا زیادہ ہے
سو، وہ غالب نہ آسکیں
میں زندہ ہوں
اور عہد کرتی ہوں کہ
اب تمہارے ساتھ رغبت سے سوؤں گی
کہ یہ تو مجھے خمار آلود کرتی ہے
اور تمہارے زندہ یا مردہ ہونے کی تمیز بھلا دیتی ہے
میں زندہ ہوں اور عہد کرتی ہوں کہ
تمہاری بری میں لائی ہوئی تمام چیزیں
مذہبی تعصب، پیر کی بیڑی اور بلادستی
سب ایک ساتھ تمہارے تابوت میں دفن کر دوں گی
کہ تمہارے یوں چلے جانے کے بعد
انہیں ساتھ رکھنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں رہا
میں زندہ ہوں اور عہد کرتی ہوں کہ
حنوط شدہ عضو تناسل کی بجائے
اس سرنج کو ترجیح دوں گی
جس میں ایک زندہ انسان کا دان کیا ہوا
تخم رکھا ہوگا، جسے سینچوں گی
اور مردان خانہ کی بھینٹ چڑھائے بغیر
زندگی کی سرخ لہروں میں تیرنا سکھاؤں گی

بھوک

بخطِ شاعر

بھیک — منور سرحدی

چھ سال کی معصوم تھی
معصومیت مغموم تھی
جیسے شکستہ ساز تھا
وہ ساز بے آواز تھا
اک شاخ کمہلائی ہوئی
سہمی سی گھبرائی ہوئی
انسان کی جائی ہوئی
انساں سے شرمائی ہوئی
دل کشتۂ آلام تھا
لب پر خدا کا نام تھا
جیسے کہ جھولی پھیلا کے
مجھ سے مخاطب یوں ہوئی
بابا خدا کے واسطے
دین و دھرم کے راستے
مجبور ہوں لاچار ہوں
مدت سے میں بیمار ہوں
میں زندگی پر بار ہوں
مرنے کو بھی تیار ہوں
بھوکی گزشتہ رات سے
ہوں تنگ ان آفات سے

میں رات بھر سوئی نہیں
میرا یہاں کوئی نہیں
اک بھوک میرے ساتھ ہے
روٹی ہی اب تو ذات ہے

کاسے میں تھوڑا ڈال دو
ٹکڑا طلب ہے بھیک کو
دنیا مبارک ہو تمہیں
حاصل ہوں تم کو نعمتیں
تم کو بلندی ہو عطا
شاعر نہیں تو رہ خدا
اللہ رحیم و رام پر
پرماتما کے نام پر
ٹکڑے جھٹک دے بھیک کے
لا بھیک دے کچھ بھیک دے

لب اس کے تھرانے لگے
آنکھوں سے اشک آنے لگے
دیکھا جو اپنا ماجرا
میں خون جگر رونے لگا
میں کیا مری خیرات کیا
یہ خاک کیا اوقات کیا

دل درد میں گھلتا رہا
لب پر مرے سلگتا رہا
میں دیکھ کر حیران تھا
شاعر تھا پھر انسان تھا
قدرت کا آئینہ کہیں
لپٹا تھا لیکن گرد میں
تھا نور کا بالا ہوا
منظر اندھیری رات کا

جس کے کھلونے کھو گئے
گڑیاں ہوئیں سو گئے

آنکھوں کا کاجل بہہ گیا
ارمان گھٹ کر رہ گیا
جو تھی بہاروں کی کلی
مرجھا کے آخر رہ گئی
یہ عمر ننھے سال و سن
یہ کھیلنے کھلنے کے دن
یہ کون سب کچھ کھا گیا
حصہ تیری تقسیم کا
معصوم ہے کیا چھوڑ دوں
قسمت سے ناتا توڑ دوں

بچے کہیں تو کار پر
کچھ کھیلتے ہیں نار پر
کچھ ہیں تو دریاؤں میں ہیں
کچھ ہیں تو صحراؤں میں ہیں
یہ ہند کی تقدیر ہے
ملت کی تصویر ہے
کچھ بول اے ہندوستان
لب کھول اے جنت نشان
بچوں کا رونا بے ہوشی ہے
کیوں پھر یہ خاموشی ہے

جو لگ گئی تو رحم کر
معصوم کے حقوق پر
ایسی نہ دے ان کو سزا
گھٹ جائیگا دم تیر کا
بیٹی بلکتی دے رہی دعا

اتنی سی ہے بس التجا
اے رحمتوں کے پاسباں
دونوں جہاں کے مہرباں
بھوکے بچوں کو بخش دے
محتاج ہیں الطاف کے

منور سرحدی

پروفیسر بیدار سرسی

غزل

وفاداروں پہ ہی تو نے جفا کی، واہ ری دنیا
خلوص دل کی یہ قیمت ادا کی، واہ ری دنیا

جو تیری مردنی میں زندگی بیدار کرتے تھے
انہیں کو موت کی وادی عطا کی، واہ ری دنیا

مداوا بن کے جو آئے تھے تیری تشنہ کامی کا
دکھا دی ان کو صورت کربلا کی، واہ ری دنیا

بڑی حیرت ہے تجھ کو جس خدا سے سخت نفرت ہے
قسم کھاتی ہے اکثر اس خدا کی، واہ ری دنیا

فرشتے تک سبھی بیدار جن پر رشک کرتے تھے
غضب تو کھا گئی وہ جسم خاکی، واہ ری دنیا

عزیز بگھروی

غزل

پھول سے خار کا شبنم سے شرر کا رشتہ
روز اول ہی سے ہے سنگ سے سر کا رشتہ

جہل کا رنگ جدا راہ فراست کی الگ
ظلمت شب سے نہیں نور سحر کا رشتہ

ہر نیا موڑ بدل دیتا ہے سمتِ منزل
ہر نئے نقش سے ہے پائے سفر کا رشتہ

ہے جو شائستہ انوار چمک جاتا ہے
یوں تو ہر ذرہ سے ہے شمس و قمر کا رشتہ

شہر خوباں کا ہر اک چہرہ ہے معصوم صفت
کس سے منسوب کروں زخم جگر کا رشتہ

عصر نو کی ہے نمائندہ غزل تیری عزیز
ذہن فردا سے بھی ہے تیرے ہنر کا رشتہ

ڈی۔ راج۔ کنول

غزل

جو جسم کو جلائیں وہ پُروائیاں نہ دو
جو کاٹنے کو آئیں وہ تنہائیاں نہ دو

دامن میں میرے ڈال دو کچھ مسکراہٹیں
پھر اس کے بعد مجھ کو شہنشاہیاں نہ دو

میں زندگی کو ڈھونڈھتا پھرتا ہوں دوستو!
مجھ کو غمِ حیات کی پرچھائیاں نہ دو

مجھ کو بچھڑتے رہنا ہے اس کائنات میں
محدود مجھ کو جسم کی انگڑائیاں نہ دو

ساحل سے کچھ نہ کچھ تو تعلق رہے مرا
بالکل ہی جوڑ بو دیں وہ گہرائیاں نہ دو

دو شوق سے کنولؔ کو غمِ دو جہاں مگر
خوشیوں کی چیختی ہوئی شہنائیاں نہ دو

افضل کرت پوری

غزل

عمر بھر غم سے ہم آغوش رہے ہم طبعاً
بارہا ہم تھے کہ ہنسنا بھی پڑا مصلحتاً

کیا کیا تم نے کہ پیمانِ وفا توڑ دیا
دل کا اک شہر فنا ہو گیا آناً فاناً

کینہ فطرت ہی نہ تھے ہم کو مٹانے والے
اُن میں کچھ لوگ تو معصوم بھی تھے تم مثلاً

اس توقع میں کہ شاید کوئی پھر کر دیکھے
بار ہا رک کے چلے چل کے رکے ہم قصداً

تم نہیں ہو تو کسی طور نہیں دل کو قرار
زندگی ویسے تو معمول پہ ہے تقریباً

زیست اک بوجھ رہی ان سے بچھڑ کر افضلؔ
یہ الگ بات کہ جینے کو جئے مجبوراً

ڈاکٹر ہری مہتہ مرحوم

قطعات

ہوں وہ لمحہ جو غم میں بیتا ہوں
مے کو پانی سمجھ کے پیتا ہوں
زندگی اس طرح سے گذری ہے
روز مرتا ہوں روز جیتا ہوں

کیا کبھی آپ نے یہ پوچھا ہے
کیوں ہری مر گئے کہ جیتے ہو؟
زندگی زہر تھا جو میٹھا سا
اب بھی کیا گھونٹ گھونٹ پیتے ہو

جانی پہچانی بھول کرتا ہوں
کتنی محنت فضول کرتا ہوں
زندگی پھر سزا جو دیتی ہے
میں خوشی سے قبول کرتا ہوں

روشن لال روشن

تم اک بار اشارہ کر دو
ناممکن کو ممکن کر دوں
ہر پتھر میں پھول کھلاؤں
ہر گُل کو انگارہ کر دوں

فرض ہے فرض نہیں فرض نبھانا ہوگا
تم ہو فنکار تو لازم ہے کہ حق بات کہو
ظلم کے سامنے جھک جانا تمہیں زیب نہیں
دن ہے تو دن ہی کہو، رات ہے تو رات کہو

ستیہ پال الفت:

برہمن نے اپنی شردھا سے بنائی مورتی
شیخ نے اپنے تخیل سے خدا پیدا کیا
ایک میں سیرت نہیں اور ایک میں صورت نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ ان دونوں نے کیا پیدا کیا

خدا جانتا ہے کہ میں جانتا ہوں
اجابت کی بھو کی ہماری وفا ہے
میں چاہوں تو دنیا کو جنت بنا دوں
مِرے پاس دنیا کے دکھ کی دوا ہے

فرشتوں کو حیران و ششدر بنا دوں
الٹ کے جو میں اپنی جھولی دکھا دوں
میں تن کے چلوں اور تنکے نہ ٹوٹیں
میں نظریں اٹھاؤں۔ تو نظریں جھکا دوں

دو نثری نظمیں

رتی

سالہا سال کے بعد
آج اچانک کیوں فون کیا تھا تُو نے اور
اجنبی کی طرح پوچھا تھا
کیسی ہو
کیسے کٹ رہی ہے حیات ؟
بڑا ہی موہ تھا، پیار تھا، اپنائیت تھی
اس لمحہ بھر کے مکالمے میں
میں ہمکلام تھی، تم سے
ایک بھی شبد مگر نہ منہ سے نکلا تھا
وہ کیا جذبہ تھا
لاشعور سے جو ابھرا تھا تری آواز کو سن کر
ایک فتنہ تھا
جگا دی تھی جس نے
موت سی نیند میں
کھوئی ہوئی
سوئی ہوئی
بھولی بسری ہر یاد مری
الفاظ
ہزار لاکھ گلے اور شکوے

جو ذہن میں تو چمکے تھے۔ بجلیوں کی طرح
مگر اس لمحۂ رستخیز کی گہرائیوں سے اٹھتے
سانس کے کُہروں میں کھو کر
منجمد ہو کر
حلق میں اٹک گئے تھے، اس طرح گویا
تری مینا، تری پیاری مینا
حشر تک کے لیے
گونگی، بہری، بے آواز ہو گئی ہو
فون بند ہے
مگر تری آواز
گنبدوں میں بھٹکتی صدا کی طرح
کھٹکھٹا رہی ہے دل کے دروازے
اور
ہلکی تیکھی، تیز نعل سی بن کر
کھود رہی ہے۔
ترے مرے کل کی قبر ــــ کہانیاں دفن ہیں جس میں کتنی ہی
ہمارے بچپنوں کی بھیدوں بھری درد سری
رستخیزی تھی یہ
یا گڑے مردے اُکھاڑنے کی رسم
بیتا کل
اوڑھ کر مرے ترے غم کی قبا
عفریت سی، عقاب سی صورت
جھپٹتا ہے، کہ چھین ہی لے گا
درد اپنے جو جاں سے پیارے ہیں
فون بند ہے، مگر

تری آواز
سہارے دے رہی ہے جینے کے، اسی طرح کہے جانے کے

اور

سجھا رہی ہے مجھے اب بھی
ٹوٹے رشتے جوڑو گی تو دکھ ہوگا
نئے رشتوں کو توڑو گی تو دکھ ہوگا
فون بند ہے مگر تری آواز

. . . .

منو

آج ترے شہر سے جو گذرا ہوں، تو دیکھا ہے
اندھی آندھیوں نے، وقت کے سیلابوں نے
مٹا دیے ہیں وہ سارے نشاں سارے نقوش
وہ عطر آمیز ہریالی، وہ ٹیلے، وہ صندلیں جھاڑیں
جو
ترے بدن مرے پیار سے مہکتی تھی تو یوں لگتا تھا
یہ شہر یہ دنیا، یہ سارا جہاں ہمارا ہے
کہاں ہے تو ؟
نہ آ، بھلے نہ آ، آواز تو دے یار مرے
لحد وہ پیار کی اپنی کہاں ہے ؟
یہیں کہیں تھی، کہ لوگ کہتے ہیں
مگر کہاں ؟
کہاں گئی وہ
اپنے ارمانوں، اپنے سپنوں کی جو کاہکشاں تھی

مرے گھروندے تری حویلی کے درمیاں کی جو شاہراہ تھی
ترے مرے جنون کی صداقت پر جو خفا رہتے تھے
وہ لوگ شرمسار ہیں اشکبار ہیں اور سناتے ہیں
کہانیاں درد کے دائروں کی، ترے وقتِ آخر کی
لبوں کی تیرے، بے آواز صدا
ہزار اشک پپوٹوں میں سمیٹے
چلی گئی تھی تو ایسے کہ کون جاتا ہے
متاعِ غم جو تجھے جان سے بھی پیاری تھی ترے ساتھ گئی
وہ چاندنی رات تھی مگر ماہتاب
شرمسار سا اتنا کہ چھپا رہا تھا ساری رات
سرمئی بادلوں کے جھرمٹ میں
اور اس قہر آلود ظلمت کے بعد جو دن آیا
رات ہی کی مانند مہیب و تاریک تھا
ہاڑ کے سورج کو پوہ کے افق نے نگل لیا ہو جیسے
گمشدہ ماضی کے ہل چل نے
دل کی دھڑکنوں نے، یادوں نے
ننھے منے کنکروں کی طرح
ہو کے تالاب میں کتنے ہی گھیرے بنا ڈالے ہیں آج اور ہر گھیرا
اپنے ہی ماضی کا کوئی لمحۂ مختصر ہو گویا
مگر ان ان گنت ہو یوں میں کہیں
کوئی پیکر، کوئی رنگ کوئی خاکہ بھی نہیں ہے ایسا
آنکھ جسے دیکھ سکے، دل جسے پہچان سکے
بدلے بدلے سے اس خلا کی کسی گلی میں کہیں
خاک و بجری کی تہوں کے نیچے
زمیں کی نم، نرم و گداز باہوں میں

سو رہا ہے میرا انیت، نیرا وجود خاکی
آنا ممکن نہیں، نہ آ، کہاں ہے تو

آواز تو دے یار مرے
یوں چلے جانا تو کوئی بات نہیں
وہ بلائے تو چلے جانا ہر ذی جان کا مقدر ہے
مگر یہ سکھ دکھ یہ اندوہ و رنج و غم اپنے
یوں ہی آتے ہیں ہنساتے ہیں رلاتے ہیں چلے جاتے ہیں
یوں چلے آنا، چلے جانا، بھی کوئی بات نہیں
کال کا چکر ہے یہ، رُکا کب ہے
یہ چلا آئے چلا جائے کسے غم اس کا
غم کوئی ہے تو یہی کہ ایسے لمحے
خود تو اڑ جاتے ہیں اور جا ملتے ہیں وقت کے سمندر میں
چھوڑ جاتے ہیں پیچھے مگر کتنی یادیں
کتنی گریہ و بکا کتنی دلِ گیری
کتنی پرچھائیاں
درد و غم، رنج و الم کے کتنے قصے
مرے ماضی، مرے ہمدم دیرینہ
مرے محرمِ راز، یار مرے
کچھ تو بتا

کہاں پہ دفن ہے تو

کہاں تری سمادھی ہے

مُسافتِ زیست

(امرتا پریتم)

زندگی کا مہذب منظر نامہ

(امرتا پریتم) انٹرویو ——— راکا سنہا

میرے دو فیصلے ——— کندلا

امرتا سے میری نجی ملاقاتیں ——— احمد سلیم (پاکستان)

شناخت

ایک مکتوب نامہ۔ امرتا اور امروز کے لیے ——— دیو سوئٹزرلینڈ

امرتا آگ کا لباس ——— جارجیائی شاعر۔ اراکلی آباشیدزے

حرفوں کا گالا ——— زمبیائی شاعر ——— چپا شلا

امرتا ——— انگریز شاعر ——— جارج گرفتھ

پانی کا ایک گھونٹ ——— ہنگری کی شاعرہ ——— تنور فرینک

اطلیس بنارسی صبح ——— ازبیک شاعر ——— خیرالدین سالرہ

خوبصورت پنجابی ملک ——— ازبیک شاعر ——— خرمازار

بہار جیسی ہندوستانی عورت ——— ازبیک شاعر ——— شکرادا

دو نظمیں ——— آزربائیجان کی شاعرہ ۔ مروارید خانم

رانا سنہا

اقتباسات

انٹرویو

چہرہ حیرت انگیز حد تک سلوٹوں سے عاری، بالوں میں چاندی کے تاروں کا ظہور مگر نشیبِ ابرو میں جھلملاتی آنکھیں اردگرد کی کائنات کا جائزہ لیتی ہوئی، سکوت افزا استعاروں کو سمیٹ کر یاد کے کسی بعید گوشے میں محفوظ کرتی ہوئی کہ ــــــ حسبِ توفیق کسی ناول یا نظم پر سرمایہ کاری کی جا سکے۔

امرتا پریتم نے اپنے گھر کو سایوں کے درمیان اسیر کر رکھا ہے، کچھ سائے بہت گہرے ہیں، کچھ اُن سے مقابلتاً روشن، نسبتاً کم تاریک، گھر کے اردگرد درختوں کا اژدہام ہے، کھڑکیوں میں سے پتوں اور پھولوں سے لدی شاخیں نگاہوں کو چھو لینا چاہتی ہیں اور طائروں کی موسیقی کی آواز مسلسل آتی ہے۔ گو اس کے کمرے نیم روشن ہیں لیکن اس کی شاعری سورج کی پے در پے تمثالوں سے مزین ہے۔

اس کی زندگی کے سفر کی منزل تکمیلِ ذات و فن ہے۔ یہ تکمیل جو خدا ہے.....

"میں خدا کی عبادت نہیں کرتی لیکن میں اپنے فردا کو امروز سے بہتر دیکھنا چاہتی ہوں۔" وہ کہتی ہے جب وہ سولہ سال کی دوشیزہ تھی تو اُس نے تقسیمِ ہند کے موقعہ پر خوں افشانی، تشدد اور بربریت کے مظاہرے دیکھے وہ درد زا یادیں اس کے پلو میں بندھی ہیں۔ اس نے اس کرب کا

اظہار اپنی بہت سی نظموں اور ایک ناول "پنجر" میں کیا ہے۔

"جب سے ہی ان عفریت صورت ساعتوں کی ہوس میرے ہمراہ رہی ہے جو مجھے کسی آگ کی طرح جلاتی رہی ہے۔ اس نے مہذب، سماج اور سیاست سے متعلق میری اقدار کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ قتل، عورتوں کی آبرو ریزی، جبری حمل ـــــ یہ سب کچھ کتنا دہشت ناک تھا۔"

"کیا اس نے آپ کو ملحد بنا دیا؟" میں پوچھتی ہوں۔

"ـــــ نہیں، ایسا نہیں ہے، میں دین کو مانتی ہوں جو مذہب سے ممتاز ہے۔"

لیکن محبت کی پیچیدگیوں، انسانی ذہن کی اذیت کاریوں، تنہائیوں اور دردوں نے بھی اسے تحریک دی ہے کہ وہ اپنے قلم کو جنبش دے اور قرطاس پر اپنے تاثرات ثبت کرے۔

"میں محبت کے باب میں بھی خامہ فرسائی کرتی ہوں لیکن محدود معنوں میں نہیں۔ آپ کا پہلا رشتہ اپنی ذات سے ہے، پھر اس فرد سے جو آپ کا ممدوح ہے۔ محبوب ہے، پھر معاشرے سے، مختلف عقائد سے، ذاتوں اور رنگوں سے ـــــ محبت حاکم اور محکوموں کے درمیان، اور محبت ملکوں کے مابین۔"

اس کے ناولوں اور نظموں کے کردار ان افراد کی تصویر کشی کرتے ہیں جو حالات سے نبرد آزما ہیں، سماج میں مروج بدعنوانیوں سے برسرِ جنگ ہیں

"میں عمر بھر جنگ کرتی رہی ہوں۔" وہ کہتی ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کا مفہوم خود شناسی ہے، عرفانِ ذات اور پھر عرفانِ معروض۔ یہ جب حاصل ہوتا ہے جب ایک فرد اپنی زندگی کے عرصے میں بہترین کو انجام دیتا ہے۔"

"لیکن بیشتر لوگ،" میں دیکھتی ہوں،" کہ زندگی میں متوسط سے آگے کی منزل پر نہیں پہنچتے۔ ممکن ہے کہ اس کا سبب اقتصادی مجبوریاں ہوں یا پھر دوسرے اسباب بھی ہوں۔ آپ ایک ادیب کی حیثیت میں بہت خوش نصیب

ہیں کہ اس منصب تک پہنچی ہیں ۔"

" فرد کو اس کے لئے کتنی خوفناک قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ ہر لمحہ آپ اپنے اطراف سے نبرد آزما رہتے ہیں۔ آپ پر ہم عصر ادیب ، نقاد، عزیز و اقارب اور اقتصادی تقاضے دباؤ ڈالتے ہیں ۔" وہ جواب دیتی ہے۔

اس کے لئے درد ، اذیت اور تنہائی زندگی کے سلسلوں کا ایک حصہ ہے ۔اس طرح انسان اپنے آپ کو دریافت کرتا ہے......

"ہو سکتا ہے ۔" میں کہتی ہوں "کہ آپ جس درد کو لکھتی ہیں ، وہ فرضی اور خود ساختہ ہو ۔"

" ـــــــــ نہیں، یہ عواقب و جوانب میں ہے ، تم جہاں بھی نظر ڈالو وہاں پر مصائب ہیں۔ یہ تخلیق کار کی حساسیت ہے کہ وہ دوسروں کے درد کو اپنے وجود پر سہتا ہے ۔"

اس کے گھر کی دیواریں تصویروں سے مزین ہیں ، دروازے پر، سیڑھیوں پر، کھڑکیوں اور دیواروں پر تصویریں ہی تصویریں۔ امروز نے جو بیس سال سے یہاں رہ رہا ہے ، یہ تصویریں بنائی ہیں۔ لیکن یہ امرتا کی موجودگی ہے جو اس گھر کو معتبر بناتی ہے ، اس مصوّر کی نہیں۔ وہ گھر کے عقبی کمرے میں رہتا ہے جس کی دیواریں سفید ہیں، فرنیچر سفید ہے ، وہ دیوانوں کی طرح کتابوں کے سرورق ڈیزائن کرتا رہتا ہے لیکن اس کی یہ گمنامی بھی رضا کارانہ ہے۔ وہ اپنی تخلیق کی سوداگری اور نمائش میں یقین نہیں رکھتا۔

"میں صرف اپنے لئے تصویر بناتا ہوں ۔" وہ کہتا ہے۔ چنانچہ جب امرتا اپنے ملاقاتیوں سے مکالمہ کرتی ہے تو وہ چائے پیش کرتا ہے۔ جب وہ تلاشِ حیات میں ادبی سرحدیں عبور کر رہی ہوتی ہے تو وہ پسِ منظر پر اکتفا کرتا ہے۔ اس کی عظمت اور ذہنی پراگندگی کا خاموش ہم سفر بنتا ہے۔ ہو سکتا ہے، کسی نہ کسی طرح یہ اس کی تلاش بھی ہو ۔"

یہ امرتا کی دیانت داری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں نمایاں طور پر آنے والے دو افراد سے اپنے تعلقات کا تجزیہ کرتی ہے۔ پہلا شخص تھا ساحر لدھیانوی ـــ

شاعر اور فلم کی ممتاز شخصیت۔ دوسرا ــــ امروز "
میں نے ساحر پر اپنے خوابوں کی سرمایہ کاری کی، اپنے احساسات اور خیالات کے لیے آشیانہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ میرا ذہن ہمیشہ اپنے سے رفیع تر کی تلاش میں رہتا تھا۔ جو میری تلاش کو زبان دینے میں میرا ساتھ دے۔ اُسے میں نے امروز میں پایا۔ ایک محبت آسمان جیسی ہوتی ہے۔ اور دوسری اس طرح جیسے سر پر چھت۔ ساحر آسمان کی طرح تھا۔ امروز ــــ امروز میری پناہ گاہ بنا، میرے سر پر ایک چھت۔"

حساسیت کے باوجود، اس میں ایک بیگانہ پن ہے، ایک طرح کا فاصلہ اس کے اور دنیا کے درمیان۔ لیکن شدت ایسی کہ آپ کو ثابت نہ رہنے دے آنکھوں میں، ملائم آواز میں، جیسے وہ لمحہ لمحہ اپنی نظموں میں تحلیل ہو رہی ہو ــــ موت، خواب، خاموشی ــــ اس کی دنیا میں تندگوئی کا گذر نہیں، سوائے زندگی کے تجربے کے، جو وہ موضوع میں رکھتی ہے اور اس کا اظہار اپنے شعروں میں سمو دیتی ہے۔

"آپ اپنی زندگی میں بہت تنہا رہی ہیں؟" میں کہتی ہوں۔

"میں تنہائی محسوس نہیں کرتی۔ میں اکیلی ہوں۔ اگر آپ تنہائی محسوس کریں تو احساسِ شکست سے دوچار ہونے لگتے ہیں۔ اگر آپ اکیلے ہوں تو پھر احساسِ شکست طاری نہیں ہوتا۔ میں صرف سوچتی ہوں۔ اور جب میرے ذہن کے شیشے میں کوئی عکس واضح ہو تو میں اسے لکھ دیتی ہوں۔"

لیکن تنہائی وقتاً فوقتاً اس کے گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ اس کی جڑیں اس کے بچپن سے منفک ہیں۔ جب اس کی ماں مری تو وہ بہت کم سن تھی۔ اُس کے والد ایک قلم کار تھے، پہلے وہ برج بھاشا میں لکھتے تھے۔ پھر پنجابی میں وہ رات کو لکھتے اور دن کو سوتے۔ گھر میں کوئی اور بچہ نہ تھا۔ ایک وہ تھی جو اپنے ساتھ رہنے پر مجبور تھی۔ گھر میں کتابیں تھیں اور وہ پڑھتی، سوچتی اور ذہن ہی ذہن میں سوال کرتی۔ اپنی تنہائی کو کم کرنے کے لئے اس نے ایک نقش تراشا، محبت کرنے کے لیے، سراہنے کے لیے۔ اور وہ اسے راجن

کہتی۔ اس کا باطنی خلفشار، باہر نکلنے کے بہانے تو تلاش کر ہی رہا تھا۔
اپنی نظموں اور نثر کے توسل سے وہ زندگی کے تنزّل کا سبب تلاش کرتی ہے ــــ سیاست داں کو اقتدار کی ہوس ہے۔ مذہب کی تہی سامانی جو انسانوں کو نفرت اور دوسروں کو قتل کی تلقین کرتی ہے۔ اپنے تازہ ترین ناول۔ "۴۹ دن" میں مرکزی کردار ایک ہندو کا ہے جس سے ایک مسلمان لڑکی محبت کرتی ہے۔ جب وہ شادی کا فیصلہ کرتے ہیں تو لڑکی کا باپ کہتا ہے، "تم اسے ہندو بنالو۔" آدمی کہتا ہے۔ "ہم تبدیلیٔ مذہب میں یقین نہیں رکھتے، نہ وہ نہ میں۔"
"جب آپ ایک جنگل میں تنہا چل رہے ہو،" امرتا کہتی ہے، "تو آپ کو ڈر محسوس ہوتا ہے۔ لیکن جب آپ کسی سے محوِ گفتگو ہوں تو آپ خود کو محفوظ خیال کرتے ہیں۔ چنان چہ اگر دو مذاہب ایک دوسرے سے متصادم ہونے کے بجائے، ایک ساتھ چلیں، تو وہ محفوظ اور مامون رہیں گے۔"
"ادیب" میں کہتی ہوں، "خوفناک حد تک اظہار کی خواہش میں مبتلا ہوتے ہیں۔"
"ہاں،" وہ کہتی ہے، "یہ ایک تخلیقی خواہش ہے، اور اگر تحریر کے ذریعے لوگوں کے رویوں اور نقطہ ہائے نظر کو بدلا جاسکے تو ایک بہتر معاشرت کی طرف پیش رفت ہو سکتی ہے۔"
آپ اپنی تحریروں سے معاشرے کو بدلنا چاہتی ہیں؟ میں اس سے پوچھتی ہوں۔ "نہیں، یہ بلاواسطہ نہیں ایک بالواسطہ تبدیلی ہوسکتی ہے۔ اطراف میں کثافت ہی کثافت ہے۔ آپ اسے صاف کرنا چاہتے ہیں تو آپ لوگوں کو اس سے آگاہ کرتے ہیں۔ میں دنیا کو تبدیل نہیں کر سکتی، تبدیلی تو عوام لاتے ہیں۔
اس کے کمرے کے ایک گوشے میں رکھی الماری میں وہ یادیں ہیں جنھوں نے اس کے کئی خواب بنے ہیں۔ وہاں ٹالسٹائی کی قبر سے لایا گیا ایک پتہ ہے اور ایک کاغذ کا ٹکڑا، جس کے ایک طرف لکھا ہے، "ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس" اور دوسرے پر ساحر لدھیانوی، شراب کی صراحیاں، خوشبوئیں، مجلس دوسرے ملکوں کے ادیبوں کے بھیجے ہوئے تحائف اور امروز کے خطوط کچھ ساحر کے

مکتوبات اور کچھ اس کے بچوں کی چٹھیاں — بہت سی کتابیں اس کے کمرے کی دیواروں سے لگی ہیں۔ بہت سی ہندوستانی ادیبوں کی ہیں۔ اور کچھ نکوس کازانتزاکیس، آئین رینڈ اور نفسیات داں لیَنگ کی۔

اس کے دنوں کے لمحے مسلسل ان کتابوں سے علم اخذ کرتے رہتے ہیں یا کاغذ پر خیالات کا تجزیہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ نہ تو زیادہ تر باہر جاتی ہے اور نہ ہی وہ لوگوں کی زیادہ تواضع کرتی ہے۔ وہ رات کے وقت لکھتی ہے، رات کے آخری حصے میں صبح کے تین بجے بیدار ہوتی ہے اور دوپہر کے بعد سوتی ہے۔ امروز اور وہ مل کر کھانا تیار کرتے ہیں۔ ایک سالن صبح کے لئے ایک شام کے لئے، ان کے پاس ملازم نہیں ہے۔ وہ اس کی بیٹی اور امروز باری باری باورچی خانے کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں۔

صوفی شاعروں کو اس لیے قتل کیا گیا کہ انھوں نے مذہب میں انقلاب کی تبلیغ کی۔ خدا کو پہچانو، انھوں نے کہا۔ معبدوں میں نہیں۔ اپنے اندر۔ امرتا بھی ہر روز خود کو تھوڑا تھوڑا قتل کرکے شعروں میں منتقل کرتی رہتی ہے، حق گوئی اور بے باکی کے ساتھ۔ لیکن وہ زندہ رہتی ہے اور از سرِ نو زندگی اختیار کرتی ہے تاکہ وہ اپنے عہد کے آشوب کا زائچہ مرتب کر سکے۔ انسان کے مقدر کا نوشتہ

میرے دو فیصلے

کندلا

میں کوئی آٹھ برس کی تھی اور میرا بھائی چھ برس کا، جب ہم دونوں ماڈرن اسکول میں اکٹھے پڑھتے تھے ـــــ کہ ایک دن ہمارے ایک مدرس نے ہم دونوں کو بڑے پیار سے پاس بلا کر پوچھا ـــــ تمہاری ماں کا نام امرتا پریتم ہے؟ وہی جس نے "ڈاکٹر دیو" اور "پنجر" نامی ناول لکھے ہیں؛ ناول والی بات ہم سمجھ نہ سکے، اس کے پیار کے انداز سے سمجھا کہ کوئی اچھی بات ہے.......

تھوڑے دن بعد ہمارے اسکول کے گھوڑسواری کے اتالیق نے ہم دونوں کو بلوا کر گھوڑسواری کروائی۔ اس نے بھی بتایا کہ اس نے ہماری ممی کا ناول ڈاکٹر دیو پڑھا ہے۔ اس وقت ہمیں پھر لگا کہ یہ کوئی بہت بڑی بات ہے۔

اسی طرح ہم دونوں ایک بچے کے جنم دن کی تقریب میں اس کے گھر گئے تھے اس بچے کی ماما نے بھی ہم دونوں کو بہت دلار سے کہا، "میں نے آپ کی ماما کا ناول ڈاکٹر دیو پڑھا ہے۔"

یہ امرتا کے بچے ہونے کا ایک بہت بڑا لیبل تھا۔ جو ہم نے اپنے اوپر لگا لیا۔ لیکن اس کے حروف کی شناخت ہمیں بہت تاخیر سے ہوئی۔

جب ہم کتاب پڑھنے کے قابل ہوئے، تب تک ماما کی کئی اور کتابیں چھپ چکی تھیں۔ لیکن ہمارے دماغوں میں ڈاکٹر دیو سمایا ہوا تھا۔ اس لیے ہم نے سب سے پہلے وہی ناول پڑھا۔ ہمارے اسکول میں انگریزی اور ہندی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس لیے ہم پنجابی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ لیکن ممی کے تمام ناول ہندی میں بھی

چھپے ہوئے تھے۔

مجھے ابھی تک یاد ہے کہ میرا چھوٹا بھائی شیلی ناول پڑھ کر روئے جارہا تھا۔ اور ممی سے لڑ رہا تھا کہ آپ نے ممتا کو کیوں مار دیا؟ اگر وہ ڈاکٹر دیو کو مل جاتی تو آپ کا کیا جاتا؛ آپ نے اسے کیوں مار دیا؛ جب تک ہم یہ جان چکے تھے کہ کہانی کار جس طرح چاہے کہانی لکھ سکتا ہے۔ کہانی میں کوئی کردار مرجاتا ہے تو یہ خدا کی مرضی سے نہیں، کہانی کار کی مرضی سے ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے...... اس دن میری ممی نے میرے چھوٹے بھائی کو چپ کراتے ہوئے اقرار کیا کہ جب نیا ناول لکھوں گی تو اس کی کہانی والی لڑکی کو زندہ رکھوں گی۔ اس دن تو میرا چھوٹا بھائی کہتا رہا کہ میں بڑا ہو کر ڈاکٹر دیو بنوں گا اور میں شاید من میں سوچتی رہی کہ بڑی ہو کر ماما کی طرح ناول لکھوں گی۔

ایک بات بتانا میں بھول گئی ہوں کہ اس سے پہلے جب ہمیں پتہ نہیں تھا کہ ناول کیا ہوتا ہے، صرف یہی علم تھا کہ وہ کوئی بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ تب ہم شور مچاتے ممی کے کمرے میں جاتے اور دیکھتے کہ وہ کچھ لکھ رہی ہیں تو میں اپنے بھائی سے کہتی "چپ"، دیکھ! ممی ناول لکھ رہی ہیں...... اور وہ بھی اس وقت خاموش ہو جاتا تھا۔"

لیکن کئی برسوں کے بعد ایک بہت عجیب واقعہ ہوا۔ تب تک میں نے گھر میں پنجابی پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ تب دیکھتی کہ اخبارات میں ممی کے خلاف بہت کچھ لکھا ہوتا ہے ایسی ہی باتیں جو نہ ہم نے اپنے گھر میں کبھی دیکھی تھیں اور نہ سنی تھیں۔ ماما کو کئی کئی دن تک بہت اداس دیکھا تو میرے من نے ایک فیصلہ کیا میں کبھی بھی مصنف نہ بنوں گی......

اور دوسرا فیصلہ میں نے زندگی میں اس وقت کیا تھا، جب ماما کو امروز انکل کی محبت میں تڑپتے دیکھا تھا۔ میرے پاپا ایک اچھے اور نیک دل آدمی تھے گھر میں میں نے کبھی کوئی لڑائی جھگڑا نہیں دیکھا تھا۔ لیکن ماما کی اداسی نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ ندی کے ان دو کناروں کی طرح ہیں جو زندگی میں کبھی بھی ایک نہیں ہو سکتے، میں خود ایک جوان ہوتی ہوئی لڑکی تھی اور سمجھ سکتی تھی کہ ماما

کی تلاش اس ندی کی تلاش ہے جو ایک دوسری ندی میں مدغم ہو سکے۔

میرا چھوٹا بھائی میری طرح نہیں سوچتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ چھوٹا تھا۔ یا شاید ایک مرد کے لیے ایک عورت کے دل اور دل کی مزدوریوں کو سمجھنا مشکل ہے اس وقت جب میرے بھائی کے رویے سے ماما اداس ہو جاتی تو میں ہی ماما کو تسلی دیا کرتی کہ آپ فکر نہ کریں، جب یہ بڑا ہو گا تو خود ہی سمجھ جائے گا۔ لیکن اس وقت ماما کی اداسی سے میں نے اپنی زندگی کا بہت بڑا فیصلہ کر لیا کہ میں بڑی ہو کر کسی آدمی سے محبت نہیں کروں گی۔

آج پورے جیون کی ریاضت کے بعد ماما نے اپنی دونوں منزلیں حاصل کر لی ہیں، انھیں جس قسم کے آدمی کا ساتھ چاہیے تھا، انھیں مل چکا ہے۔ اور اب دنیا بھر کی شہرت کے آگے ایک دو اخبارات کی دشنام طرازی بے معنی ہو کر رہ گئی ہے ان کی کتابیں دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں، لیکن یہ فقط میں جانتی ہوں کہ ان دو منزلوں کے حصول کے لئے ماما کو کس طرح کی ریاضتیں کرنی پڑی ہیں۔

میرے فیصلے اب بھی وہی ہیں کیوں کہ جانتی ہوں کہ اس نوع کی ریاضت میرے بس کا روگ نہیں۔

ابھی میرے بچے قریب اسی عمر کے ہیں، جب وہ نہیں جانتے کہ ناول کیا ہوتا ہے، یا گیان پیٹھ ایوارڈ کن مصنفین کو ملتا ہے۔ لیکن جب ان کے اسکول کی کوئی استانی اخبار میں چھپی ہوئی تصویر انھیں دکھا کر کہتی ہے 'کارتک'! مٹھائی کھلاؤ، آپ کی نانی ماں کو اتنا بڑا ایوارڈ ملا ہے یا اور مدرسین کہتے ہیں 'آر وہی'! آج میں نے تمہاری نانی ماں کا ناول پڑھا تھا؛ تو دونوں بچے اسکول میں فخر سے تن جاتے ہیں اور میں سوچتی ہوں کہ شاید یہ بچے میرے جیسے فیصلے نہیں کریں گے۔ یہ شاید بڑے ہو کر فن کار بھی بنیں اور زندگی میں محبت بھی کریں گے۔

یہ بچے میری طرح ریاضت کے دکھ نہیں جانتے۔

احمد سلیم
(لاہور پاکستان)

دیارِ شاعری میں ایک منفرد اور معتبر نام

امرتا پریتم سے میری نجی ملاقاتیں

۱۰۲ درجۂ حرارت کے ساتھ جب میں نے اپنے اس مضمون کا عنوان رکھا تو مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی، امرتا جی کو ملے بغیر، ان سے اپنی ملاقاتوں کا حال قلمبند کرنا کوئی بہت عجیب بات تو نہیں نا! کیا کہا آپ نے؟ مجھ پر ہذیان طاری ہے؟ ایک بات کہوں آپ سے، میرا جنون بھی Rational ہوتا ہے۔ محبت اور آزادی کا انتخاب کوئی جذباتی فیصلہ نہیں ہونا چاہیئے اور یہی دو لفظ ہیں جنہوں نے کئی برس پہلے مجھے امرتا سے جوڑا تھا۔

محبت اور آزادی اور ان کا ہم معنیٰ ایک اور لفظ ہے ــــــ انسان، امرتا جی کی پوری شخصیت تمام تخلیقات، سارے اعمال ان ہی تین لفظوں کے ذریعے بیان کیے جا سکتے ہیں میں بہت کم عمر تھا، بمشکل سات یا آٹھ برس کا جب میں نے محبت کا لفظ اپنی استانی سے سنا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی، لیکن ایک صبح چارپائی پر اس کی میت پڑی تھی۔ غور کیا جائے تو خودکشی بیاطن ایک بڑا سبب ہے۔ اس پل پہلی بار مجھ پر انکشاف ہوا کہ مجھے اس سے محبت تھی اور محبت مر بھی سکتی ہے۔ پھر کئی برس کے بعد جب میں پہلے ساحر اور پھر فیض کے عشق میں مبتلا ہوا تو لفظ "محبت" کا پھیلاؤ مجھے بہت بڑا لگا۔ میں بارہویں درجے کا طالب علم تھا۔ فیض صاحب میرے محبوب شاعر اور استاد تھے، میں اپنا اردو کلام انھیں دکھائے بغیر نہیں چھپواتا تھا۔

ایک بار وہ میری نظم پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے پنجابی شاعری کی ایک کتاب عنایت فرمائی ــ "نویں رُت"۔ یہ امرتا جی سے اور آزادی سے میری پہلی ملاقات تھی۔ ان دنوں میں کراچی میں اے شاد اور نور کاشمیری کے کہنے پر پنجابی میں لکھنے لگا تھا پھر ۶۸۔۱۹۶۷ میں کراچی کو خیرباد کہہ کر پہلے راولپنڈی اور پھر لاہور آ گیا۔ یہاں پنجابی ادب کا دامن بہت وسیع لگا۔ ان دنوں میں نے بہت سی نظمیں لکھیں گورمکھی رسم الخط سیکھا۔ دونوں

طرف اپنی نظمیں شائع کروائیں۔ اس بارے امرتا جی کی بہت سی کتابیں اور "ناگ منی" منگوا کر پڑھتا رہا اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ اس لمحہ تک جاری ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اب میں امرتا جی سے اپنی کتابی ملاقاتوں کا قصہ کہوں گا۔ نہیں، میں نے اپنے عنوان میں ایک لفظ "نجی" لکھا ہے نا! اس کا مطلب ہے کہ میں کتابی ملاقات کی بات بھی نہیں کروں گا کیوں کہ کتاب کسی کی نجی ملکیت نہیں ہوتی، خود مصنف کی بھی نہیں۔

میں جن دنوں کی بات کر رہا ہوں، اس وقت میں پاکستان اور ہندوستان کے تمام معروف جرائد میں چھپ رہا تھا۔ پنجابی ادب، لہراں پنجاریا، اور [illegible] چھپتا تھا ہو رکئی۔ ایک بار ایک پنجابی ادیب نے مجھ سے کہا، "تمہیں شاعر جب تسلیم کروں گا اگر ناگ منی میں چھپ کے دکھا دو" یہ سن کر میرا چہرہ متغیر ہو گیا میں کتنے ہی مہینوں سے اپنی نظمیں امرتا جی کو بھجوا رہا تھا لیکن ان کی جانب سے کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ نہ وہ نظمیں چھاپتے تھے، نہ جواب ملتا تھا، جب تک میں ان کی بہت سی تحریریں پڑھ چکا تھا میرے دل میں ان کی منزلت اور بھی سوا ہو گئی تھی۔ لیکن جب ان کی طرف سے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ ہوا تو میں ناامید ہونے لگا۔۔۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں بھی خط لکھتا رہا، نظمیں بھجواتا رہا۔ یہ ۱۹۶۸ کے بھڑکیلے دن تھے اور میری عمر ۲۳ برس تھی۔ مہربان قاری! تم اب تو جان گئے ہو گے کہ میں امرتا جی سے کن ملاقاتوں کی بات کرنے لگا ہوں۔ اب بھی نہیں سمجھے۔۔۔؟ اچھا میں خود ہی بات کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں

(۲)

اچانک ایک روز ان کا خط موصول ہوا۔ میں لفافہ ہاتھ میں تھام کر بہت دیر تک اُداس نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ لفافے پر "ناگ منی" کی مہر تھی۔ مجھ میں خط کھولنے کی تاب نہ رہی تھی بالآخر کانپتے ہاتھوں سے میں نے لفافہ کھولا، سچ مچ امرتا پریتم کا خط تھا۔ میرے نام! بھلا اس بات پر یقین کیا جا سکتا ہے؟ پنجاب کی سب سے بڑی شاعرہ نے خود اپنے ہاتھوں سے مجھے خط لکھا ہو، اپنے ہاتھوں سے لفافے پر پتہ بھی لکھا ہو، اچانک مجھے محسوس ہوا، یہ خط نہیں خود امرتا جی ہیں۔ خط کے حروف ان کے چہرے کے نقوش میں ڈھلنے لگے۔ ایک خوب صورت، انتہائی خوب صورت، پنجابی شاعرہ میرے پاس بیٹھی کہہ رہی تھی۔۔۔ "پیارے احمد سلیم جی! آپ کے خطوط کے لیے بہت بہت شکریہ، سارے خط میں نے بڑے احترام سے پڑھے تھے۔ پڑھے نہیں

پڑھوائے ہیں۔ میں اردو پڑھنا نہیں جانتی،، خط کے آخر میں میری نظموں کے بارے میں صرف اتنا لکھا تھا۔ آپ کی اور آپ کے دوست کی نظمیں ملیں، اور بلند معیار کی نظموں کی منتظر ہوں۔،، خط پڑھ کر میں اور بھی اداس ہوگیا۔ اس کے بعد بھی میں نے نظمیں بھجوائیں مگر ان کا بھی پہلے جیسا ہی انجام ہوا۔ پھر ۱۹۶۹ آگیا۔ اپریل میں، مجھے اپنی زندگی کے سب سے قیمتی انسان سے ملاقات کا موقع ملا، پر یہ ملاقات نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک گہرے درد نے مجھے بے حال کر رکھا تھا۔ زندگی نے جو سب سے بڑی خوشی مہیا کی تھی وہ ہر بار خوشی بنتے بنتے رہ جاتی تھی۔ ان ہی دنوں میں نے ہیر وارث شاہ کی بحر میں کئی نظمیں لکھیں، ایک نظم امرتا جی کے نام بھی تھی، پر مجھے خدشہ تھا کہ یہ نظم بھی "ناگ منی" میں نہیں چھپ سکے گی سو "آرسی" کو بھجوا دی۔ یہ نظم شائع ہوئی تو امرتا جی نے بھی پڑھی اچانک ایک روز ان کا مختصر سا خط ملا۔ "کوئی محبوب نظر ہی محبوب چہرا دیکھ سکتی ہے۔ احمد سلیم کے محبوب قلم کے لیے پیار اور اس کا شکریہ۔ خط پڑھ کر میں حیران رہ گیا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ امرتا جی پر اس نظم کا ایسا اثر ہوگا۔ مجھے لگا میں نے اپنی زندگی کی یہ پہلی نظم لکھ لی ہے اور اب میں شاعر ہوگیا ہوں۔

ان ہی دنوں سکھ زائرین کا ایک قافلہ لاہور آیا۔ ان میں کچھ ادیب بھی تھے۔ پنجابی ادبی سنگیت کے زیر اہتمام ان کے اعزاز میں پاک ٹی ہاؤس کے بالائی فلور پر ایک ادبی اجتماع ہوا۔ وہاں میں نے اپنی یہی نظم سنائی۔ سارے جھوم جھوم گئے، ہندوستان سے آئے ایک پنجابی شاعر جھومتے ہوئے کہنے لگے "نظم تو خوب ہے مگر امرتا پریتم کے نام کیوں؟ نظم کا سارا مزا آپ نے کر کرا کر کے رکھ دیا ہے۔"

اس لیے کہ میں نے لکھی ہی ان کے نام ہے۔

وہ جی آپ جانتے نہیں۔ وہ سرکاری پٹھو ہے، یورپ کے دورے کرتی رہتی ہے اور نوجوانوں کو گمراہ کرتی ہے"...... یہ سنتے ہی مجھے امرتا جی کی کتاب "کالا گلاب" یاد آگئی۔ یوں تو معاشرہ اس کے سکوں کو کھوٹا کہنے والی ہر جرأت پر وار کرتا ہے لیکن جب یہ جرأت کسی عورت نے کی ہو تو سماج کے منہ سے یوں ہی جھاگ بہنے لگتا ہے اور وہ سبھی دلائل کو جھٹک کر جیسے اپنے ہاتھوں میں کیچڑ کا ہتھیار سنبھال لیتا ہے۔ اس وار کو صرف وہی عورت سمجھ سکتی ہے جس نے اسے کبھی خود پر سہا ہو"۔

اس رات، میں اپنے گھر بہت اداس لوٹا اور رات کو بیٹھ کر امرتا جی کو ایک خط لکھا۔

زیدی! کیچڑ کے ہتھیار والا وار میں سمجھ سکتا ہوں، ہندوستان میں بہت سے پنجابی رسالے جو کچھ آپ کے بارے میں چھاپتے ہیں، اس کیچڑ کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں" میں نے اس کے بعد بھی انھیں کئی خط لکھے لیکن وہ پھر بھی خاموش تھیں۔ ادھر ہمارے ہاں بہت سی اتھل پتھل تھی۔ ہم سب بے یقینی کی صلیب پر کھنچے ہوئے تھے۔ اس وقت میں بہت سلگتی ہوئی نظمیں لکھ رہا تھا۔ محبت، آزادی اور انسان کے بارے میں۔ امرتا پریتم کے نام میں نے جو دوسری نظم کی، اس کی پہلی سطریں تھیں

ہتھکڑی نفرت دی میرے ہتھ جکڑ سکدی نئیں
دے سکو تاں دے دیو، مینوں محبت دی سزا

اور آخری سطر تھی

بول مرے، زہر پی سکدے ہیں، مر سکدے نئیں

وہ دن عذاب کے تھے، ایک طرف میرے وجود کے باہر بڑے پیمانے پر اتھل پتھل ہو رہی تھی دوسری طرف میرے اندر ایک تلاطم برپا تھا۔ جب پہلا انسان چاند پر اترا تھا، اور میں نے اپنے عہد کے سب سے قیمتی انسان کے بارے میں لکھا تھا۔

میرا چن کتھے ہے؟

میرا چاند میرے سامنے تھا لیکن میرے ہاتھ اس تک پہنچ نہیں پا رہے تھے۔ اس وقت میں نے جنگ اور سزا جیسی نظمیں لکھیں۔ یہ نظمیں بھی میں نے امرتا جی کو بھجوائیں مگر "ناگ منی" میں نہ چھپ سکیں۔ مجھے یہ سوچ کر الجھن ہونے لگتی کہ امرتا جی اچانک خاموش کیوں ہو جاتی ہیں۔ ۱۹۷۰ء بیتتا جا رہا تھا جب ان کا خط آیا، "میرے عزیز! احمد سلیم، تمہارے خط بھی تمہاری روح کی طرح خوب صورت ہیں لیکن خدارا اتنی خوب صورت زبان کے لیے چار حرف گورمکھی کے ہی سیکھ لو تاکہ خطوں کا پڑھنا اور لکھنا آسان ہو جائے، میں چاہتی ہوں پنجابی کے لیے جو کچھ پاکستان میں لکھا اور کہا جائے اس کی رپورٹ مجھے بھجوا دیا کریں۔ رومن حروف میں خط اچھی طرح نہیں پڑھا جا سکتا........ پچھلے دنوں فیض آئے تھے..... ان سے تین بار ملاقات رہی.....

ایک خط میں، میں نے پوچھا کہ کیا میں ان کی تحریروں کو پاکستان میں چھاپ سکتا ہوں؟ اسی خط میں آگے چل کر انھوں نے لکھا تھا، "تم جو چاہو چھاپ لو، یہ تمہارا حق ہے، میں

تمہاری دیدی ہوں نا؟" اور پھر میری نظم کے بارے میں لکھا تھا، امرتا پریتم کے نام تیسری نظم کے بارے میں، "آرسی میں تمہاری نظم پڑھی، بہت سا پیار! پھر جلد ہی ایک اور خط آیا جس میں تین دوستوں کا ذکر تھا ——— اوتار خالصہ، فہمیدہ ریاض اور سجاد حیدر۔ اوتار خالصہ وہ پنجابی خاتون ہیں جو کنیڈا میں رہتی ہیں اور ڈاکٹر ندیر جن کے بہت معترف تھے۔ ایک بار کنیڈا سے اچانک ان کا خط آیا۔ میری نظموں کے بارے میں، میری کہانیوں کے بارے میں، پاکستان اور لاہور کی سڑکوں کے بارے میں، مادھولال حسین اور بلھے شاہ کے بارے میں۔ ان کے خط سے محبت ٹپکتی تھی۔ یوں ہمارے درمیان خط وکتابت کا گہرا رابطہ قائم ہوگیا۔ سجاد حیدر پنجابی کے مسلمہ ڈرامہ نگار ہیں اور میں ان کا بڑا عقیدت مند ہوں۔ صرف فہمیدہ ریاض سے تعارف نہ تھا۔ امرتا جی نے لکھا تھا۔ "پیارے اور اچھے احمد سلیم"! آج کل میری دوست اوتار میرے پاس ہے، تمہارے خطوں کا بہت تذکرہ کرتی تھی۔ میں اسی کے توسط سے تمہیں ڈھیر ساری محبت بھجوا رہی ہوں۔ خدا وہ دن لائے کہ تم مجھ سے مل سکو۔ آج کل لندن سے میری ایک دوست شاعرہ فہمیدہ ریاض آپ کے وہاں آئی ہوئی ہیں۔ کبھی ملاقات ہو تو میرا پیار پہنچا دینا۔ میرے دوست سجاد حیدر کیسے ہیں۔ میرا سلام ان تک ضرور پہنچانا۔"

امرتا جی کو اپنی طرف کے پنجابی ادیبوں سے شکایت ہے کہ وہ کیچڑ اچھالنے کا کاروبار بہت کرتے ہیں۔ ہماری طرف بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ امرتا جی کے خط میں سجاد حیدر کا ذکر پڑھ کر مجھے ایک پنجابی ادیب کے دشنام نما الفاظ یاد آگئے۔ اس نے اپنے پیلے دانت نکوستے ہوئے کہا تھا، "امرتا پریتم، سجاد حیدر پر ریجھ گئی تھی لیکن اپنا یار بڑا بزدل نکلا۔ بہت زور کا عشق چلا تھا ان کا تقسیم سے پہلے۔ تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں، اس کی نظم سینیٹرے "سجاد حیدر کے نام ہی تو ہے ......

یہ فقرے یاد کر کے مجھے بڑی کراہت محسوس ہوئی۔ لگا ابھی متلی ہو جائے گی۔ مجھے چکر آنے لگے۔ میرے سامنے سجاد حیدر کا معصوم، بھلا مانس اور دوست چہرا ابھرا اور میری آنکھوں میں گڈمڈ ہونے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور کرسی میں ڈھے گیا۔ کئی سال بعد امرتا جی نے سجاد حیدر کے ساتھ اپنی دوستی کے بارے میں رسیدی ٹکٹ اور میں جمعے تو، میں بڑے احترام کا اظہار کیا تھا لیکن افسوس کہ رسیدی ٹکٹ کے پاکستانی اردو ایڈیشن میں سجاد حیدر کے بارے میں وہ تمام ذکر سنسر کر دیا گیا تھا۔ جب امرتا جی نے اس غیر اخلاقی حرکت پر احتجاج کیا تو پبلشر ادھر ادھر

ان کے خلاف بے پر کی ہانکنے لگا پاکستان میں امرتا پریتم کی کتابوں کی چوری بھی ایک علاحدہ موضوع ہے۔ یہاں صرف یہی کہنا کافی ہے کہ کچھ لوگ پیسہ کمانے کے لالچ میں اس قدر اندھے ہو جاتے ہیں کہ انھیں پاکستان کی عزت اور وقار کا خیال بھی نہیں رہتا۔

(۴۳)

بحران کچھ اور تیز ہو گیا تو مجھے آرام بہم پہنچانے کی خاطر پسِ دیوارِ زنداں چن دیا گیا۔ یہ ایّام بہت تکلیف دہ تھے۔ دیواروں کے اس پار مجھے صرف ایک ہی چہرا نظر آتا تھا، اپنے عہد کے سب سے قیمتی انسان کا چہرا۔ کچھ اور چہرے بھی تھے۔ امرتا پریتم، سکھبیر، سوہن سنگھ جوش، نوتیج سنگھ، پاش...... میرا سب سے محبوب چہرا ہر روز میرے پاس آ بیٹھتا تھا۔ مجھے تشفی دیتا تھا، لیکن خود آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ واپس لوٹتا تھا۔ ایک مرتبہ امرتا جی کا چہرا بھی میرے سامنے ابھرا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کہہ رہا ہو جتنے آزاد تم آج ہو شاید کبھی بھی نہ تھے۔ ان دنوں میرا نام بہت گونجا۔ ناگ منی، آرسی، پریت لڑی اور جانے کتنے ہی اخبار، رسالے میرے ذکر سے بھرے ہوتے تھے۔ سب آوازوں میں اونچی آواز امرتا جی کی تھی۔ پھر یہ دن بھی بیت گئے۔ اب ۱۹۷۲ کا عمل تھا۔ صورت حال معمول پر تھی۔ زخم مندمل ہو رہے تھے۔ لیکن شاعر کے مقدر کا نوشتہ ہمیشہ آنسوؤں سے تر رہتا ہے۔ اس بار ہندوستان سے بُری خبریں آنے لگیں۔ بڑے خوفناک ہندو مسلم فسادات اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی حالت بہت تشویشناک تھی۔ یہ خبریں پڑھ کر میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے گریہ وزاری کے لہجے میں امرتا جی کو خط میں لکھا، "...... کچھ کیجیے، لوگوں کو بچائیے ......" لگتا تھا وہ بہت دکھی اور نا امید۔ جلد ہی جواب ملا، "او نیک انسان! تمہارا خواب درست ہی تھا، تمہارا خط دیکھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ ہم سب بیچ میں اندھیرے غاروں میں سے گزر رہے ہیں۔ انسانی محبت کا احترام جانے کس دن روا رکھا جائے گا......" اسی خط میں ایک جگہ انھوں نے سجاد حیدر کے بارے میں لکھا تھا۔ "سجاد حیدر میرے بہت پرانے اور بہت پیارے دوست ہیں۔ اب تو انھیں دیکھے بھی صدیاں ہو گئیں۔ خدا کرے ایک بار جیتے جی ملاقات ہو جائے ...... مجھے ۲۲ اگست کو یوگوسلاویہ جانا ہے وہاں تین ہفتے پھر چیکوسلواکیہ، پھر فرانس۔ اکتوبر کے نصف میں لندن پہنچوں گی۔ وہاں تمہارے خط کا انتظار کروں گی۔ اپنی نئی نظمیں ناگ منی کے لیے ضرور بھجوانا۔

اب امرتا جی سے ملاقات آسان ہو گئی تھی جب میرا جی چاہتا سجاد حیدر سے ملنے چلا جاتا۔

جب جی چاہتا فہمیدہ ریاض سے فون پر بات کر لیتا۔ لندن میں امرتا جی نے فہمیدہ کو میرے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ فہمیدہ ان کی اپنی آواز میں ایک کیسٹ بھر کر لائی تھی اور مجھے خطوں کے ذریعہ لالچ دیتی کہ اگر میں کراچی آؤں تو وہ مجھے یہ کیسٹ سنوائے گی، اور میں سچ مچ کراچی چلا گیا تاکہ امرتا دیدی کی آواز سن سکوں۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"رات اُنگھلاندی پئی

کسے نے انسان دی چھاتی نوں سنھ لائی ہے

ہر چوری توں بھیانک ایہہ سپنیاں دی چوری ہے

چوراں دے کھُرے

ہر دیس دے، ہر شہر دی، ہر سڑک تے بیٹھے

پر کوئی اکھ نئیں تکدی، نہ چونکدی

صرف اک کُتّے دی طرحاں اک سنگلی دے نال بجھی

کسے ویلے، کسے دی، کوئی نظم بھونکدی،،

تے اک ہور نظم سی ———

"اک درد سی

جو سگریٹ دی طراں میں چپ چاپ پیتا

صرف کجھ نظماں ہین

جو سگریٹ دے نالوں میں راکھ وانگوں جھاڑیاں

نظمیں سنتے ہوئے میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، میں ٹیپ ریکارڈر کے قریب اپنا چہرہ لے جا کر زور سے چیخا، "دیدی! میں آپ کو سن رہا ہوں، کیا آپ بھی میری آواز سن رہی ہیں؟"

میں معجزوں پر ایمان نہیں رکھتا لیکن جب میں کراچی سے پنجاب لوٹا تو امرتا جی کا بہت پیار بھرا خط آیا رکھا تھا ——— "پیارے سلیم! تمہارے دل پر تمہارے خطوں پر قربان ہوتی ہوں' تمہیں میرا بہت بہت پیار، تمہاری نظم بڑے افتخار اور پیار کے ساتھ 'ناگ منی' میں شائع کی ہے۔ یوں ہی کبھی کبھی خط لکھتے رہا کرو، نظمیں بھجواتے رہا کرو۔ آج کل کس شہر میں ہو جب میں پنڈی میں سرکاری ملازم تھا، لاہور جاؤ تو سجاد حیدر سے میرا سلام ضرور کہنا...... لندن میں

بی بی سی نے پاکستان کے لیے میرے دو انٹرویو نشر کیے تھے، پتہ نہیں تم نے سنے ہیں کہ نہیں۔ میں یہ انٹرویو نہیں سن پایا تھا لیکن جب انھوں نے اپنا سفرنامہ "اکیس پتیوں کا گلاب" شائع کیا تو اس میں یہ دونوں انٹرویو بھی شامل تھے، ایک اور انٹرویو فہمیدہ ریاض کے ساتھ تھا جس میں فہمیدہ نے پاکستان میں نسوانی مسائل کی بات کی تھی۔ بی بی سی کے ان انٹرویوز میں پاکستان کے لیے جس اپنائیت کا اظہار کیا گیا تھا اسی محبت اور اپنائیت کا اظہار انہوں نے اپنے خط میں بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ تمھیں لاہور آکر ملنے کو جی چاہتا ہے۔ اور تم بھی ادیار، کاش وہ وقت آئے کہ دہلی آکر مجھ سے ملو......"

اور وہ وقت آگیا لیکن ہم جیسے بدقسمت لوگوں کے لیے نہیں آیا تھا۔ جن شاعروں اور مصنفوں نے عمر بھر نفرت کا پرچار کیا تھا وہ اب امن اور محبت کے مطرب بن کر ہندوستان جا پہنچے تھے۔ جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ساری زندگی مناقشت کا سم گھولا تھا اب وہ تریاق کے بنجارے بن کر میٹھے بول بول رہے تھے۔ ان کی نفرت بھی سیاسی احکامات کی تابع تھی اور وہ اپنے پیار کے گیت بھی سیاسی پراپیگنڈے کی طرح الاپ رہے تھے۔ دونوں طرف آؤ جاؤ شروع ہو گئی تھی۔ کتابیں اور جریدے بھی آنے جانے لگے تھے۔ یہاں سے جو بھی ہندوستان جاتا بعد میں وہاں کے جرائد میں اس کے بارے میں شرمناک کہانیاں چھپنے لگتیں۔ پاکستان کے پنجابی ادیب وہاں جا کے پاکستان کے نام کو مٹی میں ملا رہے تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہ وہاں جا کر فخر زماں اور احمد سلیم کے بارے میں جھوٹ بولیں۔ انھیں بدنام کریں۔ ان دنوں میرے بارے میں ہندوستان میں اتنی کہانیاں پہنچیں کہ میرے ایک خیر خواہ دوست نے مشورہ دیا کہ میں "آرسی" میں ایک مضمون کے ذریعے اپنی پوزیشن واضح کروں۔ میں نے زندگی میں کبھی اپنی صفائی پیش نہیں کی۔ یہ بات میں نے فیض صاحب اور امرتا جی سے سیکھی ہے کہ دلیل کا جواب تو دلیل سے دیا جا سکتا ہے پر گالی کا جواب نہیں دیا جا سکتا اور یہ بھی کہ دوستوں کے لیے صفائی کی ضرورت نہیں ہوتی اور دشمن اسے تسلیم نہیں کریں گے۔ سو میں نے کیچڑ کا ہر وار سہ کر صبر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ صرف مجھے ایک بات کا دکھ تھا کہ ہندوستان میں میرا نام میرے کچھ دوستوں سے منسلک کر کے گھٹیا انداز میں اچھالا گیا تھا۔ میں اپنے ان پیاروں سے تادم تحریر شرمندہ ہوں۔ کہانیوں کا یہ سلسلہ دوطرفہ تھا۔ ہندوستان سے جو پنجابی ادیب آکر یہاں امرتا جی پر بہتان تراشتے تھے وہ ہندوستان واپس جا کر میرے

بارے میں سکینڈل پھیلایا کرتے تھے۔ اسی طرح جو ادیب یہاں سے ہندوستان جاتے وہ بھی دو طرفہ عمل دہراتے۔ اس صورت حال کے نتیجے میں پاکستان کی بدنامی ہوئی کہ ہندوستان میں اس بات پر باقاعدہ بحث ہونے لگی کہ آیا پاکستان سے آنے والے ہر اہل قلم کی تواضع کی جائے یا اس سلسلے میں احتیاط برتی جائے۔ اور امرتا جی لکھ رہی تھیں

"پیارے سلیم! مجھے خوشی ہے کہ تمہارے لیے خط بھجوانے کا راستہ کھل گیا ہے...... تمہارے لیے ایک پیغام میں نے سجاد حیدر کے پتے پر بھجوایا تھا۔ ایک دن ٹی وی سے تمہاری نظمیں ٹیلی کاسٹ کی تھیں۔ احمد راہی اور فخر زماں کی بھی۔ خدا جانے تم نے سنی بھی تھیں یا نہیں۔

ان دنوں امرتا جی، "ناگ منی" میں جمیلہ ہاشمی کا ناول چھاپنا چاہ رہی تھیں۔
"ناگ منی" میں جمیلہ ہاشمی کا ناول "آتش رفتہ" ترجمہ کر کے چھاپنا چاہتی ہوں۔ میرے پاس ان کا ایڈریس نہیں۔ اس کا پتہ اور تصویر بھجواؤ تاکہ ناگ منی میں ان کا سکیچ چھاپا جاسکے"
آگے چل کر لکھا تھا، "فہمیدہ ریاض بہت یاد آتی ہے"
جب بھی امرتا جی، فہمیدہ کا ذکر کرتے میں خط لکھ کر فہمیدہ کو مطلع کر دیتا لیکن وہ اپنے جواب میں امرتا جی کے ذکر سے احتراز کرتی۔ اس بارے میں میں نے پھر اسے لکھا تو اس نے جذباتی ہو کر جواب دیا" ہاں تو نے امرتا جی کی یاد دلادی، ان کا پتہ میرے پاس نہیں، پلیز یہ خط انھیں بھیج دینا،"

۱۹۷۴ء بیت رہا تھا اور میری زندگی ایک خوفناک بحران سے دوچار تھی۔ شادی اور طلاق کا حادثہ ان ہی دنوں کی بات ہے۔ دو تین برس سے مجھے سینے میں درد کی شکایت تھی کبھی چار مہینے کے بعد کبھی چھ ماہ کے بعد، لیکن اب یہ درد کم اور مختصر وقفوں سے اٹھنے لگا تھا ۱۹۷۴ء کے آخری مہینے درد سے کراہتے گزرے۔ ملازمت سے جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ دسمبر میں استعفیٰ دے کر یکم جنوری کو لاہور واپس آگیا۔ اسلام آباد میں جن دوستوں کو میں نے بلا بلا کر دفتر میں جگہ دلوائی تھی ان ہی کی سازشوں کے ہاتھوں مجھے مستعفی ہونا پڑا تھا۔ میں جسمانی اور روحانی طور پر بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے گھبرا کر فہمیدہ ریاض کو لکھا۔

"خدا کا واسطہ ہے، لاہور آجاؤ، میں مر رہا ہوں"

فہمیدہ سب کو چھوڑ چھاڑ کر لاہور پہنچ گئی، اس وقت میں اور فوزیہ رفیق مل کر کونج نکالا کرتے تھے اور فہمیدہ اس رسالے میں بہت دلچسپی لے رہی تھی۔ گلبرگ کی سڑکوں پر فہمیدہ اور فوزیہ کے ساتھ پھرتے اور درد سے تڑپتے میرے ہونٹوں پر ایک گیت کے بول تھرک رہے تھے۔

میری چھاتی دا مگھور بیپا سو چدا

منہ لا کے اک چور بیپا سو چدا

ہندوستان اور پاکستان میں میرے خلاف گھٹیا سکینڈل اچھالے جا رہے تھے۔ پاکستان سے جانے والے ادیبوں نے وہاں جا کر انٹرویو دیئے تھے کہ احمد سلیم نے لکھنا چھوڑ دیا ہے اور سرکاری چاکری کرتا ہے۔ یہ سب سازشیں تھیں۔ انتہاؤں کا درد تھا، لیکن فہمیدہ اور فوزیہ بھی تھیں اور امرتا جی بھی۔ ایک دن میرے سینے میں بہت درد اٹھا۔ میں نے فوزیہ کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے امرتا جی کو خط لکھا۔

"دیدی! میری حالت بہت خراب ہے ...."

جب فہمیدہ لاہور میں ہی تھی کہ امرتا جی کا خط آگیا۔

"تیری صحت کی چنتا لگی ہے، پوری تفصیل کے ساتھ لکھنا کہ کیا تکلیف ہے ......

پھر آگے کچھ خفگی کے لہجے میں لکھا تھا

"تمہارے آنے کا راستہ کب کھلے گا، اُس دن کی منتظر ہوں، میرا دروازہ تمہارے لیے ہمیشہ کھلا رہے گا"

اور بھی بہت سی باتیں تھیں

تمہاری ایک نظم فہمیدہ ریاض کے نام جنوری کے "ناگ منی" میں چھپی تھی۔ پرچہ بھیج دیا تھا۔ گیت "میری چھاتی دا مگھور بیپا سو چدا" مارچ کے شمارے میں شائع ہو گا ٹی وی پر تمہارے گیت کی سطر پڑھی۔ شاید تم نے سنی ہو۔ اور دوستوں کے خطوں کے جواب بھی دیئے ہیں طاہرہ (مظہرہ) کا بہت پیار بھرا خط ملا تھا۔ فہمیدہ کا خط کبھی نہیں آیا کم بخت بہت پیاری لڑکی ہے ...... بہت دیر پہلے لندن کے پتے پر میں نے تمہیں خط

لکھا تھا کہ تمہاری تحقیق کی کتابیں میں ضرور چھاپنا چاہوں گی۔ کوئی کتاب تیار ہو تو مسودہ بھجوا دو"

امرتا جی کے اس طرح کے خطوط تھے اور اپنی زندگی کے سب سے قیمتی انسان کی سانسوں کا سہارا تھا کہ میں نے یہ درد سہہ لیا تھا۔ میری محبوب ترین ہستی اگرچہ میرے پاس نہیں تھی لیکن تھی تو۔ اس کا ہونا میری زندگی کی ضمانت تھی۔ اس کے ساتھ امرتا دیدی کے خطوط تھے اور ان کا پیار تھا۔ اگر حالات ایسے ہوں تو انسان کیوں کر مر سکتا ہے۔ لیکن یہ تسلی بھی بہت عارضی ثابت ہوئی۔

پچھلے دو برسوں میں ایک بہت ہی بڑا نام پنجابی ادب کے افق پر طلوع ہوا تھا ــــــ ملک ایم زمرد۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں دیسوں میں اس کی نظموں نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ ایسی قامت کا کوئی دوسرا شاعر پاکستان میں نہیں تھا۔ وہ پنجابی شاعری کے آسمان پر ہلال کی طرح طلوع ہوا اور اچانک گر کر چور چور ہو گیا۔ میں نے بہت دنوں سے امرتا جی کو خط نہیں لکھا تھا۔ اب لکھا بھی تو ایک منحوس خبر دینے کے لیے۔ زمرد ملک کی موت کا پڑھ کر امرتا جی کا فوراً جواب آیا، "کتنی ہی دیر سے تمہارے خط کا انتظار کر رہی تھی۔ خط آیا لیکن کتنی دکھ بھری خبر لے کر۔ ملک اے زمرد نے پنجابی بہت ہی پیاری تحریروں کے ذریعے نئے پنجابی ادب سے گہری دوستی قائم کر لی تھی۔ اس نے کچھ بہت ہی پیار بھرے خطوں سے دور دراز کے دوستوں کو اپنے دل کا قرب دیا تھا۔ آج اس کی موت کی خبر سن کر پنجابی ادب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں اور اس کے میرے جیسے کئی دوستوں کی آنکھوں میں بھی۔ یہ بڑی درد انگیز خبر ہے......

امرتا جی کا اصرار دن بدن بڑھتا جا رہا تھا کہ میں ہندوستان آؤں، سبھی لوگ آ جا رہے تھے، سبھی کے لیے راستے کھل گئے تھے۔ لیکن میں کیوں نہیں جا سکتا؟ اور کچھ نہیں تو پنجابی ادبا، دہلی کے مزاروں کی زیارت کے بہانے ہی جا سکتے تھے۔ اور وہاں امرتا جی اور دوسرے پنجابی ادیبوں سے ملتے تھے۔ الٹی سیدھی باتیں کر کے لوٹ آتے تھے۔ کئی لوگوں کے ہاتھ امرتا جی نے میرے لیے کتابیں اور رسالے بھجوائے جو مجھے آج تک نہیں مل سکے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے قلم سے عمر بھر امرتا جی کو گالیاں دی تھیں اور اب دہلی جا کر "ناگ منی" میں اپنے انٹرویو چھپوا رہے تھے، اور پاکستان کے پنجابی ادب کی غلط تصویر پیش کر رہے تھے ان ہی دنوں ملتان سے مشکور صابری عرس کے موقع پر دہلی گئے ــــــ ان کی واپسی

کے بعد امرتا جی کا خط آیا ـــــ ،، پچھلے دنوں یہاں عرس کے موقع پر ملتان کے مشکور صابری آئے وہ ناگ منی کے شمارے اور کئی کتابیں لے گئے تھے۔ وہ وارث شاہ نامی جریدہ شائع کرتے ہیں۔ بس ایک بار ملاقات ہوئی تھی ،،

اور مشکور صابری پاکستان میں لوگوں کو بتاتے پھرتے تھے کہ وہ جتنی دیر دہلی میں رہے امرتا جی کے مہمان تھے۔ آگے چل کر امرتا جی نے لکھا تھا ـــــ ،، تم کبھی عرس کے موقع پر آؤ نا " اور پھر آگے فہمیدہ ریاض کا ذکر تھا۔

مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ امرتا جی تو فہمیدہ کو اس قدر ٹوٹ کر چاہتی تھیں لیکن فہمیدہ کبھی ان کے سلام کا جواب تک نہ دیتی تھی، جیسے انھیں جانتی تک نہ ہو۔ میں نے کئی بار خطوط کے ذریعے اور فون پر بھی اس کا تذکرہ کیا لیکن اس کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ بلکہ ایک بار یوں ہوا کہ کونج پڑھ کر اس نے مجھے ایک تنقیدی خط لکھا اور کونج کی خامیاں گنواتے ہوئے کہا۔ ـــ ،،کونج میں ایک بات اور جو میں نے محسوس کی وہ یہ کہ تم امرتا پریتم کو مناسب سے زیادہ جگہ دیتے ہو،، اصل میں یہ صرف فہمیدہ ہی کی شکایت نہ تھی۔ بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی گلہ تھا کہ میں پاکستان میں امرتا پریتم کا پبلسٹی ایجنٹ ہوں۔ کیوں؟ اس لئے کہ میں ان کی کہانیاں اور بہت سی تحریروں کے اردو تراجم چھاپتا ہوں۔ ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے ان کی باتیں کرتا ہوں۔ اخبارات نے اس پر کئی بار میرا مذاق بھی اڑایا۔ گھٹیا سکینڈل چھاپنے والے لاہور کے ایک اخبار نے طنزیہ انداز میں یہ خبر شائع کی کہ :-

"دہلی یونیورسٹی نے امرتا پریتم پر برسوں کی تحقیق کے عوض احمد سلیم کو پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری دی ہے۔"

ایک اور جریدے میں ایک کالم ایسی خبروں پر مشتمل ہوتا تھا جن پر یقین نہیں کیا جاسکتا تھا گپ شپ کے اس کالم میں کراچی سے ایک لڑکی نے خبر بھجوائی کہ :-

"احمد سلیم نے امرتا پریتم کے بارے میں لکھنا بند کر دیا ہے۔"

جب امرتا جی کو ہندوستان کا سب سے بڑا غیر سرکاری ادبی انعام "گیان پیٹھ" ملا تو پاکستان میں اس ضمن میں میری تین تحریریں شائع ہوئیں۔ ایک پنجابی میں، دو اردو میں۔ ان تحریروں پر بھی لوگ تلملا اٹھے۔ صرف فخر زماں کو خوشی ہوئی اور اس نے مجھے

مبارکباد دی۔ یہ سلسلہ کئی برسوں سے چلا آرہا تھا۔ "کونج" کے پہلے شمارے میں جب میں نے امرتا جی کی وہ نظم چھاپی جس میں کتابیں کاغذ اور نقشے ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں اور ان سے لہو کے بجائے کالا زہر بہنے لگتا ہے تو احمد ندیم قاسمی جیسے محرّر نے مجھ پر الزام لگایا کہ اس نظم میں پاکستان کی سرحدوں کی بے حرمتی کی گئی ہے۔ سرحدوں کی بے حرمتی ضرور تھی لیکن دنیا بھر کی سرحدوں کی۔ پاکستان کی بے حرمتی کا سوال ہی نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو قاسمی صاحب سے پہلے امرتا جی سے میں پوچھتا، "آپ کو اس بے حرمتی کا حق کس نے دیا ہے۔"

لیکن جو کچھ بھی تھا، امرتا جی اس آمدورفت پر بہت خوش تھیں۔ "لگتا ہے ــــ پھر میرے خط تم تک پہنچ سکیں گے اور تمہارے خط مجھ تک آسکیں گے۔ فاصلے کچھ مہربان ہوتے محسوس ہو رہے ہیں۔"

اِدھر اُدھر سے خبریں اتنے بے بنیاد طریقے سے پہنچ رہی تھیں کہ یار لوگوں نے میری ایک "پیاری سی بیوی" بھی گھڑلی۔ ڈیڑھ سال پہلے میں شادی اور طلاق کے عذاب سے نکلا تھا لیکن مہربان دوست نئی نئی خبریں اڑا رہے تھے۔ جب امرتا جی نے اس سلسلے میں لکھا تو فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ ہنسوں یا رو دوں ــــ انہوں نے لکھا تھا "معلوم ہوا ہے ــــ تمہاری پیاری سی بیوی ہے۔ مجھے "ناگ منی" کے کالم "ذکرِ خیر" کے لیے اس کا انٹرویو درکار ہے۔ فخر زماں سے کہنا تمہاری بیوی کا انٹرویو لے کر بھیج دے اور تم فخر کی بیوی کا ــــ ایک کالم اور شروع کر رہی ہوں "میں اور میں" سیلف انٹرویو یعنی اپنے آپ سے ملاقات اپنا سوال، اپنا جواب۔ وہ بھی لکھ کر بھجواؤ۔ تم بھی اور فخر زماں بھی ــــ تم پرانے شعراء پر تحقیق کر رہے تھے، کچھ تحقیقی مضامین بھی بھجوا دو۔"

راستے کھل گئے تھے لیکن خط کئی بار اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے۔ یہ خط کبھی بھٹکتا اور لڑ کھڑاتا بیرنگ ہو کر واپس ان ہی کے پاس پہنچ گیا تھا اور امروز نے دوبارہ ٹکٹ لگا کر یہ خط مجھے پوسٹ کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں لیکن سیلنے کے درد کی شدت میں میں نے بہت دنوں تک خموشی اختیار کر لی اور خط لکھنے بند کر دیئے۔ مجھے احساس تک نہیں تھا کہ امرتا جی کے خطوط اِدھر اُدھر بھٹک کر واپس ان کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ سو امروز جی نے لکھا تھا۔

"پیارے سلیم! یہ خط لاہور سے واپس آیا ہے۔ راستے میں بیرنگ

ہوگیا اور لاہور میں اسے کسی نے وصول نہیں کیا (ہمیں ہمارے ڈاک خانے والوں نے جتنی ٹکٹیں بتائی تھیں ہم نے چسپاں کر دیں) اور ہمیں اپنا خط خود ہی چھڑانا پڑا یعنی واپس لینا پڑا۔ اب ایرمیل کی ٹکٹیں لگا کر بھیج رہا ہوں۔ غصہ کر لیا کرو لیکن خاموشی اختیار نہ کرو، ویسے دیکھا جائے تو غصہ کرنے کا حق بھی اپنوں ہی کو حاصل ہے۔"

۱۹۷۶ء میں، لاہور میں بیروزگاری کے کئی مہینے کاٹ کر میں پنجاب سے سندھ آگیا۔ سندھ یونیورسٹی جام شورو میں سندھی کے عظیم شاعر شیخ ایاز وائس چانسلر ہو کر آئے تھے اور چاہتے تھے کہ جس طرح میں نے ان کی شاعری کو سندھی سے پنجابی میں منتقل کیا ہے، اسی طرح سندھی کے سب سے بڑے شاعر شاہ لطیف کے کلام کو بھی پنجابی میں منتقل کروں میں نے اس پیشکش کو قبول کر لیا اور جام شورو میں مقیم ہوگیا۔ یوں لگتا تھا کہ دیدی امرتا سمیت پوری پنجابی دنیا سے میرا رشتہ منقطع ہوگیا ہے۔ ۱۹۷۶ء بھی بیت گیا۔ حالات کچھ بدل گئے تھے۔ نئے حالات میں کام کرنا مجھے بہت مہنگا پڑا۔ سو ترجمے کا کام چھوڑ کر میں کراچی آگیا۔ ایک طویل بیروزگاری سہنے کے لیے۔ جب تک شیخ ایاز کی پنجابی شاعری کا ترجمہ شائع ہو چکا تھا۔ ان ہی دنوں میرے ایک سندھی ادیب دوست نے امرتا جی کے ناول "بند دروازہ" کا سندھی ترجمہ شائع کیا تھا۔ میں نے امرتا جی کو کتاب بھی بھجوائی اور خطوط بھی لکھے —— جواب آیا —— خط تو ملے، کوئی کتاب نہیں ملی دوست! سندھی میں کتاب چھپی ہے تو کاپی تو بھیج دینی تھی .... اور آگے وہی پرانی فرمائش تھی —— دوست! کبھی تم اس طرف نہیں آتے؟ شیخ ایاز کی نظموں کا ترجمہ اگلے شمارے میں چھاپ رہی ہوں۔ یہ کتاب مجھے خشونت سنگھ نے بھجوائی تھی۔

رابطہ ایک بار پھر ٹوٹ گیا۔ پورا ۱۹۷۹ء بیت گیا، نہ دیدی کا کوئی خط ملا نہ کتاب نہ رسالہ، میں نے روہانسہ ہو کر گلے شکوے سے پُر خط لکھا۔ بیروزگاری کا تیسرا برس تھا اور گھر والوں سے بھی اَن بن تھی۔ نہ جانے ان ہی پریشانیوں کے سبب میں نے امرتا جی کو کیا کچھ واہی تباہی لکھ بھیجی۔ لیکن ان کا پیار بھرا نرم نرم خط آیا۔ ۵ جنوری ۱۹۸۰ء کو انھوں نے لکھا تھا۔

"تیری محبت سچی، اس کا حق اور دعویٰ بھی سچا لیکن الاھنا سچا نہیں۔ میں نے جسے بھی ناگ منی کے شمارے اور کتابیں لے جانے کو کہا اس نے وزن بڑھنے کے خوف سے نہ کردی۔ پچھلے برس میں نے پریتم سنگھ کے ذریعے پوری فائل بھجوائی تھی، جسے وہ پروفیسر شہباز ملک کو دے آئے تھے کہ اسے کراچی پوسٹ کردیا جائے۔ خدا جانے یہ بھی شمارے تمہیں ملے بھی ہیں یا نہیں"

کئی برس پہلے امرتا جی نے مجھے اجازت دی تھی کہ میں پاکستان میں ان کی کتابیں یا ان کے تراجم چھاپ سکتا ہوں لیکن یہاں صورت حال یہ تھی کہ ایک ادارہ بلا سوچے سمجھے، معیار کو ملحوظ رکھے بغیر کتابوں کے متن کو گھٹا بڑھا کر چھاپے جارہا تھا اور امرتا کی شہرت اور نیک نامی کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ میں نے سوچا، ان کی کچھ کتابوں کے درست تراجم کو خوبصورت انداز میں چھاپوں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کی اجازت طلب کی تھی۔ اس خط میں انھوں نے لکھا تھا۔

"میری کہانیاں یا دوسری تحریریں چھاپنے کا تمہارا حق فائق ہے"۔

میں خود بھی نہیں جانتا کہ خواہش رکھتے ہوئے بھی میں ہندوستان کیوں نہیں جانا چاہتا۔ وہاں کم از کم ایک ایسی چوکھٹ تو ہے جہاں میں بھی قیام کرسکتا ہوں۔ کیا میرے اندر کوئی خوف جاگزیں ہے؟ کیا مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اس چوکھٹ کا دروازہ نہ کھلا تو پھر شاید اور ٹوٹنے کی مجھ میں ہمت نہ رہی تھی۔ ادھر امرتا جی کو ایک ہی شکایت تھی، "کہ بہت لوگ ادھر آئے ہیں لیکن تمہیں، جسے سچ مچ آنا چاہیئے تھا، کیوں نہیں آتے؟ عرس کے دنوں میں ہی آجاؤ......... میں انھیں کیا جواب دیتا کیوں نہیں آرہا۔ بہتر ہے میں کچھ نہ لکھوں۔ یوں پورا ڈیڑھ برس بیت گیا۔ اس سال نومبر میں، میں نے خوشیاں اور غم ساتھ ساتھ بتائے۔ اپنی زندگی کے سب سے قیمتی انسان کو ملنے اور اس سے بچھڑنے کی سوگوار خوشی اور خوشگوار غم تو کتے ہی پر مجھے یوں لگا جیسے میرے ہاتھ خالی ہو گئے ہیں۔ شاید میں اس کی امیدوں پر پورا نہیں اترا۔ شاید میں نے اسے ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔ مایوسی کی اس حالت میں مجھے ہندوستان، امرتا جی اور دنیا کا ہر رشتہ بھول گیا تھا۔ دریں اثنا کراچی کی پنجابی اور اردو کی ایک شاعرہ ــــــ سارا شگفتہ

ہندوستان گئی اور بڑے ہنگامے مچا کر واپس آئی تھی۔ دلی میں اس نے امرتا جی سے گہرے روابط استوار کر لیے تھے۔ میرے ساتھ اس کی معمولی سی یاد اللہ تھی لیکن جب وہ ہندوستان سے واپس آئی تو کئی لوگوں سے میرا پتہ پوچھتی رہی۔ اس نے شہر میں جگہ جگہ یہ اعلان کیا کہ دنیا میں صرف دو ہی آدمی ہیں جن سے اس کا مکالمہ ہو سکتا ہے۔ ایک امرتا پریتم اور دوسرا احمد سلیم۔ اور یہی دو آدمی ہیں جن کو وہ اپنا سچا دوست سمجھتی ہے۔ جب یہ خبریں مجھے ملیں تو میں بہت حیران ہوا۔ امرتا جی کے دوست ہونے کی خبر تو سمجھ میں آتی تھی لیکن میں اس کا اتنا گہرا دوست کیسے بن گیا جب کہ ہم نے ایک بار بھی باہم گفتگو نہیں کی تھی۔ ایک دن سارا مجھے ایک دوست کے گھر مل گئی۔ میں نے کہا ــــــ "سارا! تمہارا شکریہ، تم نے مجھے بڑی عزت دی ہے لیکن کیا میں اس لائق بھی تھا۔"

"میں سب جانتی ہوں آپ کے بارے میں، میں دہلی سے آ رہی ہوں۔"

"لیکن میں دہلی تو نہیں رہتا......"

"وہاں زیادہ رہتے ہو، دلوں میں جاگزیں ہو کر"

مجھے یاد نہیں کہ اس کے بعد بھی ہم میں کوئی رسمی بات چیت ہوئی ہو۔ آہستہ آہستہ مجھے پتہ چلا کہ سارا کے حالات بہت خراب ہیں۔ تیسری طلاق کے بعد وہ گھبرا کر ہندوستان چلی گئی تھی اور اب اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھی۔ ملاقاتی "ہمدردوں" کی نگاہوں میں کیچڑ اور غلاظت تھے، لیکن وہ ہر چیز سے بے پروا اپنے راستے پر چلی جا رہی تھی۔ وہ بہت بیمار رہنے لگی۔ اسے دماغی امراض کے شفاخانے میں داخل ہونا پڑا۔ بجلی کے جھٹکے لگوانے پڑے، ایک بار، دوبار اور پھر جیسے یہ اس کا معمول بن گیا۔ ادھر میری لمبی چپ سے پریشان ہو کر امرتا جی نے ۱۸ جون ۱۹۸۱ء کو لکھا

"ایک مدت سے تمہارا خط نہیں آیا۔ سارا شگفتہ کم بخت بہت یاد آتی ہے۔ اس کی نظمیں رلاتی رہتی ہیں۔ اسے کہنا پانچ سات نظموں کا پنجابی ترجمہ بھجوا دے مگر جلدی۔ ایک کتاب مرتب کر رہی ہوں۔ اس کے لیے۔ ساتھ ہی سارا کی تصویر بذریعہ ڈاک بھجوانا...... سارا کو خدا سلامت رکھے۔"

لیکن سارا کی تکلیف بڑھتی گئی۔ اسے ہوش تک نہ رہتا کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور کہاں سے آ رہی ہے۔ میرے ساتھ میری دوست ثروت سلطانہ بھی بہت پریشان رہنے لگی۔ ہم

اس سے ملنے کی کوشش کرتے۔ ایک بات یہ تھی کہ میں نے امرتا جی سے کچھ نہ چھپایا۔ میں انھیں پل پل کی خبر دے رہا تھا۔ اسی برس ۵ر دسمبر کو انھوں نے بہت پریشان ہو کر لکھا "خط ملا، تم نے سارا کی حفاظت کرنی ہے۔ میرے جیسے دور بیٹھے دوست تم پر ہی یہ ذمہ داری ڈال سکتے ہیں۔ وہ بہت قیمتی روح ہے۔ منسلک خط سارا تک پہنچا دینا۔"

اس خط میں لکھا تھا۔

"میری بہت پیاری اور حسین دل سارا! تمہاری نظموں کے ذریعے میں نے تمہاری روح تک رسائی حاصل کی ہے۔ اس دل کا تمام پیار —— تمہیں بھیج رہی ہوں۔ تم نے زندہ رہنا ہے۔ ہر آگ سے گزر کر جینا ہے۔ تمہارے سُلگتے ہوئے لفظوں کے لئے یہی تمہارا عطیہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تم کہیں قریب ہو، تمہارے دکھوں کا زہر میں ہتھیلیوں سے دھو دوں۔ بس اقرار کر لو کہ تم نے جینا ہے۔

جانے کیا ہوا کہ میں امرتا جی کو جواب نہ دے سکا۔ یکم مارچ ۱۹۸۲ء کو انھوں نے لکھا: "میں نے پچھلے دنوں بھی ایک طویل خط لکھا تھا لیکن جواب نہیں آیا۔ جانے خط ملا تھا کہ نہیں...... سارا کے بارے میں فکر مند ہوں۔ کئی دنوں سے اس کا خط نہیں آیا۔ اس کی صحت کیسی ہے۔ میری محبتیں اس تک پہنچا دینا۔

اس عرصہ میں دو بڑے واقعات ہوئے جنہوں نے مجھے ایک بار پھر توڑ پھوڑ دیا۔ ۱۹۸۱ء میں کراچی کی ایک شیماں ہندوستان جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ اچھی خاصی شناسائی تھی مجھے کہنے لگی —— دہلی میں میرے قیام کا کوئی انتظام نہیں —— تم امرتا جی کے نام خط لکھ دو، میں نے خط دے دیا۔ وہ دہلی میں امرتا جی کے یہاں رہی لیکن جب واپس آئی تو اس کا رویہ عجیب سا تھا۔ میں نے پوچھا

"امرتا جی نے آپ کی تواضع کی یا نہیں"

"تواضع تو کی لیکن تمہارا خط پڑھ کر نہیں۔ میں نے ایر پورٹ سے تمہارا نام لے کر انھیں فون کیا لیکن وہ مجھے لینے کے لیے نہیں آئیں۔ کہنے لگیں ٹیکسی لے کر آجاؤ......"

"تو پھر کیا ہوا، اتنی رات گئے وہ نہیں نکل سکتی ہوں گی؟"

"یہی نہیں، تمہارا نام بھی وہ واجبی سا ہی جانتی ہیں۔ وہاں میں نے کبھی تمہارا ذکر نہیں سنا۔ تم تو بہت باتیں کرتے تھے........ اگر انھوں نے مجھے اپنے یہاں رکھا تو میری اپنی وجہ سے....

"آپ ان سے کتابیں اور رسالے لائی ہیں؟"

"انھوں نے نہیں دیئے"

خط کا جواب"

"انھوں نے کہا تھا جب ضرورت ہوئی لکھ دوں گے

شیماں کے ساتھ ہونے والی بات چیت نے مجھے اندر باہر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ پھر میں نے اِدھر اُدھر سے اور بھی بہت سی باتیں سنیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میری سانس رک رہی ہو۔ مجھے یہ سب مصنوعی باتیں لگتی تھیں۔ امرتا جی تو لوگوں کے ذریعے مجھے کتابیں بھجوایا کرتی تھیں خط لکھتی ہیں، میرے لیے دوسروں پر بوجھ لادنا چاہتی ہیں۔ جسے لوگ اٹھانے سے انکار کر دیتے ہیں، شیماں نے جو کچھ کہا ہے میں اس پر یقین نہیں کر سکتا۔ گو مجھے یقین نہیں تھا لیکن میں پھر بھی لرز کر رہ گیا تھا۔ ان ہی دنوں پانچ برسوں کے بعد پھر سینے میں درد اٹھا اور ساتھ ہی دھیما دھیما بخار رہنے لگا۔ آخر ایک دن امرتا جی کا خط آ گیا۔ سارا کے بارے میں اپنی پریشانی ظاہر کرنے کے بعد انھوں نے ایک جملہ لکھا تھا ——— ایک بات کہنا چاہوں گی ——— کسی کو ذاتی خط دے کر یہاں میرے پاس رہنے کا حکمنامہ جاری نہ کیا کرو۔ یہ تاکیدی خط ہے۔ ساری بات واضح ہو گئی تھی۔ یقیناً امرتا جی کو شیماں سے کوئی تکلیف پہنچی ہوگی۔ میں یہ سوچ کر بہت شرمسار ہوا۔ اس سے قبل لاہور سے ایک دوست اور ان کے بچے میرا خط لے کر گئے تھے لیکن امرتا جی نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ اس سے پہلے ایک انگریز دوست گیا تھا۔ پر کسی شکایت کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے امرتا جی کو لکھ دیا کہ میں ان کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ اصل میں شیماں کے رویے کو میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ انھیں میں اس لیے پسند کرتا تھا کہ سارا کے علاج کے سلسلے میں وہ اچھے ڈاکٹروں سے رابطہ قائم کرتی رہی تھی۔ سارا کے لیے وہ بہت پریشان تھی۔ یہی سوچ کر میں نے اسے خط دے دیا تھا۔ لیکن..... مجھے اب وہ ساری بات چیت یاد آ رہی تھی جو ہندوستان سے واپسی پر شیماں سے ہوئی تھی:

"تم کبھی ہندوستان گئے تو امرتا کے یہاں ٹھہرو گے"

"بلکہ نہیں"

مت ٹھہرنا۔ تمہاری ان سے لڑائی ہو جائے گی"
"لڑائی ہوگی کیوں؟"
ان کی کوئی کومٹ منٹ نہیں۔ صرف اندرا گاندھی ہی ان کی کومٹ منٹ ہے"
"میرا خیال ہے میں تم سے اتفاق نہیں کر سکتا۔"
"خود جا کے دیکھ لینا"
دوسرے امر تا جی نے تمہارے لیے ایک خاص پیغام بھیجا ہے"
"تم نے تو کہا تھا، کوئی پیغام نہیں"
"اس وقت بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا"
"کیا پیغام ہے؟"
"تم اور سارا شادی کرلو"

ابلتا ہوا لاوا میرے چہرے پر سے آ کر گزر گیا۔ میرے اندر کوئی بہت شدت سے رو دیا تھا۔ میں بہت مشکل سے کہہ سکا ــــــ

"سارا میری دوست ہے، اگر میں نے شادی کرنی بھی ہوئی تو کبھی کسی دوست کی طرف نہیں دیکھوں گا"

"پر اس میں حرج ہی کیا ہے؟" میں اب کچھ سن نہیں پا رہا تھا۔ دوستی کی اتنی بڑی توہین کی گئی تھی۔ دوست کی بھی اتنی بڑی توہین ہوئی تھی کہ اب میں مزید کچھ سننے پر تیار نہ تھا۔ میں وہاں سے نکلا تو ایک جوہڑ کے پاس ایک کوڑے کے ڈھیر پر گر پڑا۔ مجھے لگا کہ میری باہوں میں بڑی شدت کا درد ہے۔ اگر امر تا جی نے کہا بھی ہے تو وہ میرے یہاں کے حالات سے ناواقف ہیں۔ کیا شیماں انھیں یہ نہ کہہ سکی کہ میں ایسی تجویز سن نہیں سکوں گا۔

پھر کئی مہینے بیت گئے۔ سارا کے حالات بدستور خراب تھے مینٹل ہوسپٹل، الیکٹرک شاک وہ پہلے کی طرح ڈول رہی تھی۔ ایک دن ثروت ملی تو کہنے لگی۔ "تم نے سنا، سارا نے پھر شادی کر لی ہے، پچھلے مہینے"
"وہ خوش ہے؟"
"نہیں، کہتی ہے جب میں نے ہاں کی تو میں حواس میں نہ تھی"

"پیٹر"

"طلاق کے بارے میں سوچ رہی ہے"

پھر ایک دن دو خبریں ایک ساتھ ملیں۔ طلاق کی تصدیق اور اس کی ماں کی موت کی خبر۔

میں نے اسے بڑی دقتوں سے تلاش کیا اور پوچھا

"کیسی ہو؟"

"بہت تکلیف دہ صورت حال میں گرفتار ہوں، بتاؤ کیا کروں؟"

"میں مشورہ نہیں دے سکتا، ساتھ دے سکتا ہوں"

"امرتا جی کہتی ہیں ہندوستان چلی آؤ"

"چلی جاؤ، کچھ دن کے لیے، طبیعت بہل جائے گی"

۳۰ر نومبر ۱۹۸۲ء کو امرتا جی کا ایک اور خط ملا۔

"سارا کے لیے بہت فکر مند ہوں" سارا کو بھی انھوں نے دو خط لکھے تھے "میں کسی کے خط کا انتظار نہیں کرتی۔ صرف تمہارے خط کی منتظر رہتی ہوں۔ میری جان! تم بیمار نہیں ہو، تم میرے پاس ہندوستان چلی آؤ۔ اگر کوئی تکلیف ہے تو اس کا علاج کرواؤں گی۔ تمہیں اپنے پاس رکھوں گی۔ جتنی دیر تم چاہو گی...... تمہاری نظموں نے مجھے موہ لیا ہے۔ تمہاری جیسی زبان داں کبھی صدیوں میں جنم لیتی ہے۔ وقت اگر تمہیں شناخت نہیں کرسکا تو یہ وقت کا قصور ہے، تمہارا نہیں.....

امرتا جی کا خط تھام کر کھڑی سارا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔

(نوٹ) یہ مضمون دو ڈھائی سال پرانا ہے۔ پاکستان کی عظیم شاعرہ سارا شگفتہ ہماری اس نشتھر دنیا میں آج نہیں ہے۔ وہ ہندوستان آئی تھی، مگر یہاں بھی اس کے ساتھ اسی قسم کا سلوک ہوا جو اس کے ہموطنوں نے اس کے ساتھ روا رکھا تھا۔ محترمہ امرتا پریتم کی حال ہی میں چھپی کتاب "ایک تھی سارا" ایک ایسا دلسوز کفارہ ہے جس سے ہمارے گناہ جنت میں بیٹھی سارا یقیناً معاف کر دیگی، کیونکہ وہ اب بشر نہیں ایک فرشتہ ہے۔

دیو
سوئٹزرلینڈ

ایک مکتوبِ نما

امرتا اور امروز کے لئے

تیرا چہرہ
برکات اور تخلیق کے مابین
ساز کی آیت
جگمگاتی صدائے بازگشت

جس کے مشاہدے کا انداز ہم بھول گئے ہیں
تم نے اپنی مٹی پر رہے ہیں
ہر طرح کے بادگرد

ساز نشیں
ناٹک اور نقاب
جو مضحکہ خیز ہنسی ہنستے ہیں
چاقو، دہلیزیں، کفر، کھیلیں بنے ہوئے
جب تک ہم نفرت میں تبدیل ہو چکے ہوتے ہیں
تم نے محبت کو تشدد میں
اور چنگے بھلوں کو بربریت میں ڈھلتے دیکھا ہے
رشتے جب تاش کے پتے سے بن جائیں
تو جب تک جینے کے لیے کچھ باقی نہیں بچتا
تمہاری مسکراہٹ بہت دوری پر بھٹکتے لمحوں کی یاد

تمہاری چپ، گہرے کرب کے بیاباں سے گزر کر آئی متر ندی
تم اور الفاظ سب لکیروں سے عاری ایک رقص
تم نے ہوا کو انسان کی مٹی سے علیحدہ کر کے
خوابوں کے باغ میں اس کو ایک علیحدہ شناخت دی ہے
ہوا کو چھٹی پسلی کی تہمت سے بری کیا ہے
تم۔ جس نے مصر سے موہن جو داڑو تک
سیاہ فام صورتوں کو ہر طرح کی شکلوں میں
اتھل پتھل ہوتے دیکھا ہے
جو بیک وقت عمل بھی ہو اور ایک عارفانہ بے نیازی بھی
تم صبحوں کا عہد نامہ ہو
گزرے وقتوں کی پرچھائیاں نہیں
تمہاری سلطنتِ ابجد میں نہ دیواریں نہ منافقتیں
خوش آمدید کی مسرت ہے
قلوب کی نہ ختم ہونے والی بات
تمہارے دروازے پر دوستی ـــــ عبارت
علم، بدھ استوپا
تمہیں روشنی کے سوا کسی دوسرے نام سے مخاطب نہیں کیا جا سکتا
میری یادداشت میں تمہارا نام
تمہارا نام دوستی کی نیلگوں نقاشی
تم سے ملنا تمہاری خوشی نہیں ہو سکتا
تم جو تمہارے لفظوں میں ہو
دیا اور دریا ....

چار جاپانی شاعر

ادا کلی آباشید زے

۱۹۵۶ء

امرتا
آگ کا ملبوس

امرتا! تم سرتاپا سخن کا الاؤ
آگ کا ملبوس
میں تمہاری زبان کیسے سمجھوں
میں — جو طائروں کی بولی نہیں جانتا
میں جو فقط یہ جانتا ہوں کہ کبوتر کیسے غٹرغوں کرتا ہے
کوئل کیوں دیوانی ہوتی ہے
جب گرمیاں آتی ہیں
میں جانتا ہوں کہ ہم سب ایک طرح کی اداسی میں ڈوب جاتے ہیں
ایک ہی وظیفہ کرتے ہیں
اور طائر اور شاعر —— محبت کو گاتے ہیں
میں جو تمہاری زبان بس اسی قدر جانتا ہوں
جتنی کبوتر کی، اور جس قدر ایک کوئل کی
لیکن ایک ایقان ہے کہ تم بھی محبت کی مغنیہ ہو
کیا وہ کوئی خوش بخت ہے جس کے لیے تیرا
یہ نغمہ تخلیق کی اوڑھنی اوڑھتا ہے؟
وہ کون ہے جو تیری روح کی گنگناہٹ سنتا ہے؟
وہ کون فخر مند ہے جو ایک رقصاں روح کے لائق ہے؟
تم امرتا! جو سخن کی آگ میں پگھلی ہوئی ہو، اور سامنے ایک نظم بن کر جل رہی ہو
خدایا! میں چاہتا ہوں کہ یہ نظم کبھی ختم نہ ہو
مجھے خدا توفیق دے
اور تنہائی کا کوئی لمحہ نصیب کرے
ہندوستانی، ایرانی، ازبیک، ترک۔ کتنے ہی لوگ تمہارے قریب آئے ہیں
میں دہلی سے رخصت ہو رہا ہوں ایک خلش لیے
بس ایک درد پال لیا ہے جو میں تمہیں بتا نہیں سکا۔

زمبیائی شاعر

چیپا شلا

حرفوں کا گالا

امرتا پریتم کے لیے!

مجھے تم نے حرفوں کا گالا تر کر کے دیا
اور میں نے اسے حلق میں نچوڑ لیا
ہر آواز دیتا حرف، مخصوص برتاؤ کا خواہش مند
چوزے کی ٹانگ کی طرح، یا اس کے پروں کی طرح
میں نے اسے چیر چیر کر دیکھا
اور ہر شیریں نوالہ منھ میں پپولا
اتنا ___ کہ آخر وہ دہن میں
اک گیت بن گیا
ایک نظم ___ کہ جس پر میرا نام ابھر آیا ہے
وہ نظم لمحوں کی، کتر بیونت
میرے وجود کے سیاہ اور گھنے جنگل میں سرگرداں
مجھے، تم نے جو الفاظ دیئے، میں نے پی لیے
اور ان خاموش گلابوں کی میں حفاظت کروں گا
یہ چیپ اور تازہ......
رُت نے تیوریوں پر بل ڈالے اور دن مسکرایا ہے
محبت کی دھجیاں جوڑ کر، میں تمھاری گردن سجاؤں گا
اور سوچوں کے گھر میں
میرے احترام آلودہ ہاتھوں کی تلاوت ہوگی
میں تمھارے علم کی، اور سلیقے کی
گہرائی میں ڈوبنا چاہتا ہوں
اور ہم مشترکہ باہوں میں دنیا کو جوڑ کر
زندگی کا جام پی رہے ہیں

۱۹۷۸ء

انگریز شاعر
جارج گرفتھ

امرتا!
میں صدیوں کی رہ گزر طے کرتے تمہیں دیکھتا ہوں
جیسے پھول گرمائی گھاس پر کھلے
اور سورج تمہارے سائے کو متشکل کرے
یہ تمہاری ابجد ------
طلسمی تاروں کا غالیچہ بن رہی ہے
اور ہمیں پراسرار مقامات کی طرف لے جا رہی ہے
اڑتے ہوئے عقاب کی طرح
اب دبے قدموں تم ہم سے رخصت ہو رہی ہو
لیکن صدیوں کے آنسو تمہارے ہم سفر ہیں
وہ تمہارے بعد بھی امڈیں گے
میں جانتا ہوں کہ وہ پھر بھی برسیں گے
لیکن تم --- اب ان کے اسرار جانتی ہو
اور بہتے ہوئے پانی کا آخری مقام بھی

نومبر ۲ ۱۹۷ء

ہنگری کی شاعرہ

تئور فرینک

پانی کا ایک گھونٹ

امرتا! تم آس کی چمکتی بندیا ہو

تم نے آج میرے قلم کو ایک نغمہ دیا ہے

نغمہ ــــ جو گہرے جہنم سے دستیاب ہوا سچ کا ایک تکمہ

اور اس آگ سے روشنی پھیل گئی ہے

جس آگ کو میں نے خدا سے چرایا ہے

او میری اجنبی! آج مجھے ایک چشمے کی خبر دے

اور مجھے بتا کہ اس کا شفاف پانی کیسا ہوتا ہے؟

اور وہ پانی کیسے گاتا ہے

مجھے اپنی پیاس کے جام کو لبریز کرنا ہے

اس نیلے چھلاوے آسمان کے تلے

یہ ہوا دھول سے لدی ہے

اور میری پیاس دیر ینہ ہے، بہت پرانی

او میرے اجنبی! آج کسی چشمے کی خبر دے

اور مجھے بتا کہ اس کا شفاف پانی کیسا ہوتا ہے

اور سلگتے زخموں کو وہ کیسے دھوتا ہے

ہاتھ کا اشارہ کر! اور راستہ دکھا

راستہ ــــ جو کسی ذخیرۂ آب تک جاتا ہو

خواہ کوئی قیمت بھی ادا کرنی پڑے

یہ جیون کا موتی میں نچھاور کر سکتی ہوں

لیکن پانی ...... پانی ...... میں سیراب ہونا چاہتی ہوں

یہ میری زندگی لے لو اور پانی کا ایک گھونٹ دے دو!

ستمبر ۱۹۶۷ء
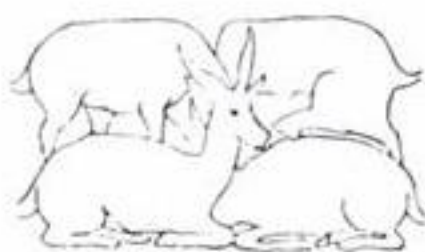
ازبیک شاعر

خیرالدین سالوہ

۱۹۶۱ء

اطلس بنارسی صبح

امرتا! تم نے آج ہمیں نظموں میں پرو لیا ہے
انسانی احساس کو، عقل اور علم کو
تیرا معیار ـــــ بھارت کا فلسفہ

امرتا! تم پنجابی مٹیار کی ملائم آواز
تم بنگال کی گہری خلیج سی
تم اطلس بنارسی صبح ہو
تمہارے اہل وطن ـــــ
خوب صورت کناروں کے مابین بے چینی سے بہتی
گنگا کی تال پر بھنگڑا ڈالتے

ایک بے پناہ غربت ہے
لیکن تم ـــــ کھجوروں کے باغات کی مہک میں بھیگی
نرم نرم ہلکورے لیتی ہوا
میں جن نظموں پر نچھاور ہوگیا ہوں
وہ نظمیں تم ہمیشہ گاتی رہنا

مطبوعہ "لینن نوجوان" یکم مئی ۱۹۶۱ء

ازبیک شاعر

خرمازار

۱۹۶۱ء

امرِتا
خوبصورت پنجابی ملکہ

ہمارے لوگ خوشی سے کھلے
اور ہندوستان سے آئی مہمان عزیز کو
آج خوش آمدید کہتے
او خوب صورت پنجابی ملکہ!
او پُرجوش دل والی بانو!
تمہارا مجسّم تفلسف دلوں پر امڈ رہا ہے
میری دعا ہے
کہ مستقبل میں تم پہلے سے زیادہ گیت گاؤ

مطبوعہ "ازبیک ثقافت" یکم مئی ۱۹۶۱ء

ازبیک شاعر

شکرادا

بہار جیسی ہندوستانی عورت

زلفیہ ادا امرتا کی دیرینہ دوستی
ازبیک شاعرہ کے پرسکون اور آراستہ گھر میں
شاہی پردوں کی اوٹ سے
صبح کی ہوا جھانک رہی ہے
اطلس کے لحاف میں سے اٹھ کر
امرتا نے آنکھیں کھولیں
بہار جیسی ہندوستانی خاتون!
سامنے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے
گئی رات کے مشاعرے کو، اور دوستانہ گفتگو کو
شاید تمہاری یادداشت اب تک دُہرا رہی ہے
تم دونوں یک جاں
آج سبز گھاس پر یوں چہل قدمی کر رہی ہو
جیسے ایک مدت کی شناسائی ہو
ابابیلیں محوِ پرواز ہیں
یہیں سے سخن طرازی آغاز ہوتی ہے
اور بات آگے بڑھتی ہے ــــ عہد کے مقدر کی
پھولوں اور رنگوں کی
تم دونوں ــــ بے پرکی پرواز کر رہی ہو
انسان دوستی کے پر، دِلوں سے جوڑ کر
زندگی کو دوستی کا جھونٹا دیتی ہو

مطبوعہ کزل ازبیک ۱۳ مئی ۱۹۶۱ء

آذربائیجان کی شاعرہ

مرواریدخانم

دو نظمیں

امرتا تم آئیں تو ہندوستان کی آواز آئی
بیجو کا نغمہ آیا، میری سماعتوں میں سوز بھر گیا
تمہارے ہنر کے ساز پر
آج ہماری حسرتیں نغمہ سرا ہوئیں

(۲)

دل کا سورج یوں طلوع ہو، جیسے نصف النہار
گیتوں بھری آواز ــــ جیسے گنگا میں تلاطم
جیسے بیجو نے کوئی گیت چھیڑا ہو، اور درد آگر ہم آغوش ہو جائے
تمہارا فن جیسے اکتارہ بجتا ہے، اور میری محبت نغمہ چھیڑ رہی ہے
دونوں آنکھیں جیسے سوچوں کے دو چشمے
دو ملکوں کے گیت جوڑ دے او چاند کی کرن!
عوام کے درد کی کٹھالی میں تمہارے گیت پک گئے
ہماری زلیخہ مشترک ہے اور دلوں کی سنگت گہری ہے
ہوا محبت چھڑک رہی ہے اور مٹی مہک رہی ہے
میری تمنا ہے کہ تمہارے دل کے ہونٹوں پر ہمیشہ تبسم چھایا رہے

۱۴ر اگست ۱۹۶۱ء

PERKINS
CHIT FUND PVT. LTD. 16-A PEAREY LAL MOTOR MARKET KASHMERE GATE DELHI-110 006

PHONE 2518309

Regd & Head Office,
First Floor Pearly Lal Motor Market,
Kashmere Gate,
Delhi-10006
Telephone: 2518309

پرکنز چٹ فنڈ پرائیویٹ لمیٹیڈ

رجسٹرڈ ہیڈ آفس فرسٹ فلور پیارے لال موٹر مارکیٹ کشمیری گیٹ دلی ۶
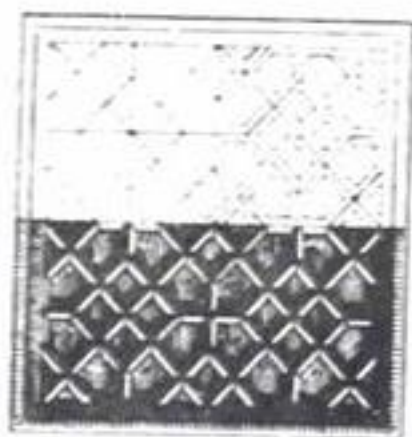
Messers Attree Associates
Engineers & Contractors

279, Masjid Moth,
New Delhi

Telephones : 6443699
6448865
6448610

میسرز اتری ایسوسی ایٹس

انجنیرز اینڈ کنٹریکٹرز ۲۷۹ مسجد موٹھ نئی دلی۔

بلراج ورما

یہ کہانی نہیں

سڑک کی حالت دو روز کی مستقل برفباری کی وجہ سے بہت خراب تھی۔ رام پور بوشہر اور نارکنڈا کا راستہ جو بارڈر روڈ کے ڈرایوروں کے لیے صرف دو گھنٹوں کی مار تھی اس روز چھ گھنٹوں میں طے ہوا۔ شام ہو چلی تھی اور دھندتے آس پاس کی ساری فضا اندھی کر رکھی تھی۔ سویلین افسر وکرم اور میجر دلیپ سنگھ نے رات وہیں ریسٹ ہاؤس میں رہ جانے کا فیصلہ کیا اور بخشی کو بھی چوکیدار سے کہہ کر ایک الگ کمرہ دلوا دیا۔

چوکیدار بازار سے کلو بھر آلو پیاز اور ٹماٹر وغیرہ لے آیا۔ دلیپ سنگھ نے مکھن کا پورا ٹن اسے تھما کر بھاجی اور پراٹھے بنانے کو کہا اور وہ لوگ ریسٹ ہاؤس کے اس ونگ کا سب سے بڑھیا کمرہ لے کر رات گذارنے کا اہتمام کرنے لگے جسے سرکٹ ہاؤس کے نام سے پکارا جاتا تھا اور جس میں صرف بڑے بڑے افسر ہی ٹھہرائے جاتے تھے۔

چوکیدار نے کمرہ میں لکڑی جلاتے ہوئے اطلاع دی کہ گئی رات ویسٹرن کمانڈ کے بھی آرمی کمانڈر وہاں ٹھہرے تھے۔ اور وکرم کے پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اسی بیڈ پر سوئے تھے جس پر آج وہ براجمان ہے۔

دلیپ نے دوسرے ٹن سے مکھن کا ایک خاصا بڑا کور کاٹ کر نگل لیا اور اولڈ مانک کھول کر ایک دم دو تین پیگ پیٹ میں انڈھیل لیے۔ کھانے کی تیاری میں چوتھا بھر کر بولا۔

وکرم تم سالے سویلین ہو مگر تم کو شراب پینے کی پوری تمیز ہے. جو پیس دے کر گھونٹ لیتے ہو جبکہ میں جب کبھی بھی پیتا ہوں. شریفوں کی طرح پینے سے پہلے دو تین اسی طرح اندر بھجوا دیا کرتا ہوں تاکہ عقل کو قفل لگ جائے اور میں ذرا بہک سکوں. شراب پی کر آدمی بہکے نہیں تو لطف نہیں آتا۔

وکرم مسکرایا. زیادہ اور تمہاری طرح پینے سے بھوک مرجاتی ہے اور میرا آج بھرپور کھانے کا ارادہ ہے. یہ چوکیدار باقاعدہ ایک منجھا ہوا آرٹسٹ ہے اور تم دیکھنا کہ اس کے آلوؤں اور پراٹھوں میں جو جان ہے. تمہارے میس کے کک میں بھی نہیں۔

کھانا واقعی بے حد لذیذ تھا. سندھ مکھن میں بنا اُبلے آلوؤں اور انڈوں کا شوربا. ہری مرچ اور لیموں کا اچار، پیاز ٹماٹر اور پہاڑی کھیرے کا سلاد، اور کُرکُرے سرخ پراٹھے. دونوں کھانے پر ڈٹ گئے. اور چوکیدار کو باقی بوتل جو آدھی سے کچھ زیادہ ہی تھی تھماتے ہوئے ہدایت دی کہ وہ اس میں سے ایک دو پیگ اور کھانا ڈرائیور کو بھی دے دے. دلیپ جو لمبے سفر کی وجہ سے کافی تھک گیا تھا کھانا ختم کرتے ہی لڑھک گیا اور پل بھر میں زوردار خرّاٹے اڑانے لگا. اب وکرم بیچارہ کیا سوتا تو یوں ایسی ان گونجوں میں ـــــ

اس بیڈ پر جرنل مانک شاہ سوئے تھے اور بھی جانے کون کون کب کب سویا یا سوئی ہوگی، وکرم سوچ رہا تھا۔

اچھی بھلی پیس فُل نوکری کر رہا تھا دلّی میں اور بیوی بچوں کے ساتھ مزے سے دن گذر رہے تھے مجھے اس طرح کی بے ڈھنگی نوکری کرنے سے کیا ملا یہی کوئی چھ ایک سو ہی تو ان میں سے آدھے سے زیادہ اس روز روز کے آنے جانے میں ہی اڑ جاتے ہیں. گھر میں تھوڑی خوشحالی بھی آئی ہے مگر کس قیمت پر. گذر بسر تو ہو ہی رہی تھی. اب کہاں میں کہاں میرے چھوٹے چھوٹے بچے اور کہاں بھرپور پیار کرنے والی میری بیوی ـــــ اور میری بیوہ ماں۔

ماں کا خیال آتے ہی اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

ہم تھوڑا کھا پہن لیں گے مگر تو اپنی بیوی کو اس بھرپور جوانی میں یوں چھوڑ کر نہ جا. تیرے یہ فرشتوں ایسے معصوم بچے رُل جائیں گے۔

باپ کا سایہ بڑی چیز ہوتی ہے بیٹے تجھے اس کا تجربہ نہیں کیوں کہ تو نے تو پیدا ہوتے ہی اپنا باپ کھو دیا تھا. میں جانتی ہوں کہ مجھے کن کن مراحل سے کیسے کیسے جتن کر کے گذرنا پڑا ہے۔

ماں ــــ اس کی ماں کتنی خوبصورت عورت تھی مگر کتنی بدنصیب پتی کے ساتھ پانچ چھ سال بھی نہ رہنے پائی تھی کہ ۔

اس نے میز پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی ۔لائیٹر اٹھایا اور جلانے کی کوشش کی مگر لائیٹر کی گیس ختم ہوچکی تھی ۔اسے یاد آیا کہ لائیٹر کی گیس آخری دموں پر پہنچ چکی تھی اور اسے دو تین ماچس خرید لینا چاہیے تھیں ۔اب اس موسم میں اتنی رات گئے ماچس کہاں ملے گی ۔

اچانک سامنے لکڑیاں سلگتی دیکھ کر اس کا چہرہ جگمگا اٹھا ۔ساتھ میں پڑی اخبار کا ایک پنا پھاڑ کر اس نے سگریٹ جلائی باقی کا کاغذ آگ میں پھینکنے ہی والا تھا کہ اس پر لکھی اس عجیب و غریب خبر نے اسے چونکا دیا ۔خبر کی سرخی اور تین چوتھائی حصہ جل چکا تھا جو بچا تھا وہ اس طرح تھا ۔

" وہ آدمی ہے یا کوئی بھٹکتی ہوئی آتما ۔لوگوں سے ملتا ہے ان سے باتیں کرتا ہے ان کے ساتھ کھاتا پیتا ہے اور پھر اچانک ایسے روپوش ہوجاتا ہے جیسے فضا میں تحلیل ہوگیا ہو ۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ کوئی آدمی نہیں ان پہاڑوں میں بھٹکتی پھرتی کوئی دیو آتما ہے ۔"

وکرم کے جسم میں جھرجھری سی آگئی اس نے پوری اخبار اٹھائی تاریخ دیکھی ۔پورے دو ہفتے پرانی ۔وہ اخبار پڑھنے کا عادی تھا اور یہ اخبار اس نے پہلے سے ہی دیکھ رکھی تھی ۔اکثر سرخیوں سے وہ مانوس تھا مگر یہ خبر کیسے اس نے پہلے نہیں دیکھی ۔ہر شام میس میں خبروں کی چرچا ہتی تھی حیرت ہے کہ کسی دوسرے افسر نے بھی اس قسم کی سنسنی خیز خبر کا ذکر نہیں کیا تھا ۔

اخبار کا تیسرا ورق ہم لوگ اکثر نہیں دیکھتے جب میرے جیسے اخبار نچوڑ کی نظر اس پر نہیں گئی تو ان افسروں کی کہاں گئی ہوگی جو دن بھر سڑکوں پر بھٹکتے پھرتے ہیں اور شاموں کو نہا دھو کر دن بھر کی تکان کو شراب میں انڈیلنے میں مست رہتے ہیں ۔اب اس دلیپ کے بچے کو ہی لو ۔کیسے خراٹے بھر رہا ہے گویا گھوڑے بیچ کر سویا ہو ۔

گھوڑے کا لفظ ذہن میں ابھرتے ہی اسے یاد آیا کہ دراصل ان کمبخت گھوڑوں نے ہی اسے یہاں بھجوایا تھا ۔ہر مہینہ تنخواہ کا ایک چوتھائی وہ ریس میں ہار جاتا تھا ۔دلی چھوٹی تو یہ لت بھی چھوٹ گئی ۔جوئے کی لت بُری ہوتی ہے یہاں آکر اس نے تاش تک کھیلنا بند کر دیا تھا ۔

چلو کچھ تو اچھا ہوا ہی ۔یہاں چلے آنے کی وجہ سے بڑے مزے کی زندگی ہے ان فوجیوں کے ساتھ رہنے میں ۔کتنے مست رہتے ہیں ۔دن بھر جی جان سے کام کرتے ہیں اور شام کو

بڑے اہتمام سے پیتے کھاتے ہیں۔ اور ہمارا کمانڈر کرنل سوریہ دیو۔ کیا آدمی ہے۔ کیسا بانکا اور تیکھے دماغ والا فوجی۔

اس روز بیوی نے پوچھا۔ ڈارلنگ تم اتنی کیوں پیتے ہو پہلے کہتے تھے کہ ہمارے ادھر نہ ہونے کی وجہ سے پیتے تھے مگر اب کیوں ـــــ اور میرے یار نے چمک کر جواب دیا تھا۔ سویٹ ہارٹ پہلے تم لوگوں کی یاد میں پیا کرتا تھا آج کل تم لوگوں کی آمد سیلی بریٹ کیا کرتا ہوں ـــــ مسز دیو اتنی پڑھی لکھی عورت ہونے کے باوجود شوہر کے اس تعریفی جملے ہی سے مطمئن ہو گئی تھی۔ عورتیں بھی کیا چیز ہوتی ہیں۔ تعریف کی بھوکی۔ مرد کا لمس انہیں موم کی طرح پگھلا دیتا ہے اور اس کے منہ سے اپنے گنوں کا بکھان سن کر تو وہ ایکدم پانی ہو جاتی ہیں۔

اسے لگا کہ کمرہ بہت گرم ہو گیا ہے۔ اٹھ کر گاؤن پہنا تیسرے سگریٹ کے بٹ سے چوتھا سلگایا اور کواڑ کھول باہر آگیا۔ باہر موسم خوشگوار تھا۔ ہوا بند تھی اور سردی بھی کوئی ایسی نہ تھی۔ دور کوئی پہاڑی بنسری بجا رہا تھا جو پروفیشنل سٹینڈرڈ کی نہ ہوتے بھی بڑی من موہک تھی۔

موسیقی کی دھن کتنی خوبصورت چیز ہے اس طرح کا شانت ماحول ہو تو کیسے ابھر کر دلوں کو چھو لیتی ہے۔ جس طرف سے بنسری کی آواز آرہی تھی وہ اسی طرف دیکھے جا رہا تھا گویا اس کی آنکھیں بجانے والے کو ڈھونڈ رہی ہوں۔

ایکا ایک اسے محسوس ہوا کہ برآمدے کے دوسرے کنارے پر کوئی اور بھی کھڑا اُسی کی طرح بنسری کی آواز کا منبع ڈھونڈ رہا ہے۔ موسیقی میں واقعی بڑی کشش ہوتی ہے۔

اسے بارڈ کا وہ جملہ یاد ہو آیا۔ جو موسیقی سے متاثر نہیں ہوتا وہ آدمی نہیں گدھا ہے۔ موسیقی آدمی کے علاوہ ہر چرند پرند کو بھاتی ہے ایک بس گدھا ہی اس لذت سے محروم و بے نیاز ہے۔

کسی دوسرے مفکر نے گدھے کو سادھو اور کتے کو بے جھولی کا فقیر بتایا ہے اور مشورہ دیا ہے کہ آدمی کو دونوں میں سے کسی کو دھتکارنا نہیں چاہیئے۔

بارڈر روڈ میں ان دنوں گدھوں اور خچروں کی بڑی اہمیت تھی کیونکہ سڑک نہ ہونے کی وجہ سے سامان لانے لیجانے کا کام انہیں کے دم سے تھا افسران کے درمیان ایک جوک بڑا پاپولر تھا۔ ایک خچر والے کو وہ سیکنڈ اور دو والے کو لیفٹیننٹ کہتے تھے۔ اسی طرح تین خچروں والا کپتان ہوتا چار والا میجر اور پانچ والا لیفٹیننٹ کرنل۔ دیکھتے دیکھتے کتنے ہی کپتان بریگیڈیر اور جنرل تک بن گئے تھے کیونکہ ایک خچر ایک مہینہ میں ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ جتنا کما لیتا تھا۔

غالباً آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں. موسیقی میں واقعی بڑی کشش ہوتی ہے۔ نوارد غالباً وہی تھا جسے کچھ لمحے پہلے وکرم نے ریسٹ ہاؤس کے لمبے برآمدے کے دوسرے کنارے پر کھڑا دیکھا تھا

سگریٹ کی طلب مجھے آپ کے پاس کھینچ لائی ہے. میرے پاس آج نہ سگریٹ ہے نہ ماچس اور ہیں۔

وکرم مسکرایا. میں آپ کی حالت کا اندازہ کر سکتا ہوں اس قسم کی کیفیت سے ہر سموکر کو کبھی نہ کبھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ دونوں نے ایک ساتھ سگریٹ سلگائے اور باتیں کرنے لگے۔

آپ کا ساتھی بڑا خوش نصیب آدمی ہے۔ اس طرح سو سکنا واقعی بڑی نعمت ہوئی ہوگی۔ خود مجھے تو اس کا رتی بھر تجربہ نہیں. میں کبھی اس طرح نہیں سو سکا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مرا وہم ہو اور میں بھی سوتے میں اسی طرح خراٹے بھرتا ہوں مگر ایسا ہوتا تو میری بیوی کم از کم ضرور بتاتی۔

اچھی بیویاں شوہروں کے خراٹوں سے اتنی مانوس ہو جاتی ہیں کہ خراٹوں کا نہ آنا ان کے لیے خراٹوں کے آنے سے کہیں زیادہ عجیب ہو جاتا ہے۔

آپ کی بیگم۔

جی ہاں میری بیگم بھی۔ شاید ہر مطمئن آدمی خراٹے بھرتا ہے. خراٹا اطمینان یعنی زندگی سے سمجھوتے کی نشانی ہے۔

وہ مسکرایا۔ آدمی کا ذہن بھی کتنی پرتوں سے بنا ہے۔ ابھی ابھی موسیقی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ خچروں والا لطیفہ ابھر آیا دماغ میں۔ اور اب یہ نیا رفیق۔ سمجھوتا شکست کا سمبل ہے زندگی میں ناکامی کی نشانی یعنی دھارے میں کٹے پیڑ کے مانند بہے جانے کا دوسرا نام ہے۔

دھارے کے خلاف چلنا بھی ظاہر ہے کوئی ایسی عقلمندی نہیں یہ دنیا البتہ انہیں لوگوں کے دم سے آگے بڑھتی ہے جو زندگی سے سمجھوتا نہیں کرتے بلکہ زندگی کو اپنی پسند کی راہوں پر چلنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

میں آپ کی بات کی سچائی کو سمجھتا ہوں مگر اس قسم کے لوگ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

وہ ہیں۔ جہاں کہیں بھی ہیں آدمی کی ترقی اس کا مستقبل انہیں کے دم سے ہے۔

آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔

نام جاننے کے بعد آپ دھام اور کام جاننا چاہیں گے۔ جو ظاہر ہے کہ غیر ضروری ہے۔ میں ایک آوارہ راہی ہوں نہ کسی ایک جگہ ٹکتا ہوں نہ کبھی جم کر کوئی ایک دھندا کرتا ہوں. میں دھارے کے

خلاف بہنے والا آدمی بھی نہیں ہوں۔ میرا مقصد زندگیوں کو سجانا سنوارنا ہے نہ بگاڑنا ہی۔ یعنی ایک دم معمولی آدمی۔

آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔

ہر غیر معمولی آدمی بور اور ہر معمولی آدمی دلچسپ ہوتا ہے۔

مجھے آپ ایک سگریٹ اور دیں گے ؟

ایک کیا آپ پوری ڈبیا لیجئے۔

وکرم لپک کر کمرے میں گیا اور بریف کیس سے ایک نئی ڈبیا لے آیا۔ باہر آکر البتہ وہ ایک دم چکرا گیا کیونکہ وہ شخص اب وہاں نہیں تھا۔ اس نے دلیپ کو جگانے کی بات سوچی مگر رک گیا۔ کمرے میں لوٹ کر اخبار کے اس ٹکڑے کو دوبارہ جانچنا چاہا مگر خود اس نے ہی غالباً اسے آگ میں پھینک دیا تھا۔ کب اور کیوں اب اسے یاد نہ آ رہا تھا۔

وہ دیر تک پلنگ پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اپنے اس بریف انکاؤنٹر کے بارے میں سوچتے سوچتے بالآخر وہ سو گیا۔ صبح وہ دونوں جاگے تو مطلع کافی صاف تھا اور بخشی نے جیپ کو اچھی طرح سے صاف کر کے مزید سفر کے لیے تیار کر دیا تھا

چوکیدار نے ان کے لیے آلو کے پراٹھے اور چائے بنائی اور راستہ کے لیے بھی ایک پیکٹ تیار کر دیا۔ رم کی آدھی بوتل کے علاوہ اسے انعام بھی ملا تھا لہٰذا وہ صاحب لوگوں کو خوشی خوشی بھیجنا چاہتا تھا۔ چلتے وقت وکرم نے رات والی پرانی اخبار احتیاطاً بریف کیس میں رکھ لی مگر رات والی اس انوکھی ملاقات کا ذکر اس نے دلیپ سے نہیں کیا۔

رات تم بہت دیر سے سوئے، باہر کس سے باتیں کر رہے تھے ؟

تو تم نے ہماری باتیں سنی تھیں۔

باتیں نہیں آوازیں۔ مگر وہ کون تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں ہم دونوں کے علاوہ دوسرا تو کوئی بھی نہ تھا۔

تھا ایک۔

کون ؟

ایک آوارہ بے فکرا مفلوج۔ وہ ہوا سے وارد ہوا تھا اور ہوا ہی میں تحلیل ہو گیا۔ کون اور کیا تھا پوچھنے پر بھی اس نے نہیں بتایا۔

ہو گا کوئی سالا شرابی۔

وہ شراب پیے ہوئے نہیں تھا۔

تم تو پیے ہوئے تھے۔ پی کر نہ سونے سے آدمی کا ذہن عجیب قسم کی خرافات سوچنے لگتا ہے۔

بخشی نے بتایا کہ گئی رات ایک آدمی ان لوگوں کے پاس بھی آیا تھا اس نے ان کے ساتھ کھانا کھایا ادھر ادھر کی باتیں کیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کہیں غائب ہو گیا۔ گاڑیوں کے بارے میں اس کی جانکاری سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کوئی منجھا ہوا موٹر مکینک یا انجینئر تھا۔

میں سمجھتا ہوں وہ کوئی فلسفی تھا۔

چوکیدار کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی بھوت ہے جسے اکثر لوگوں نے دیکھا ہے مگر وہ جب بھی اس سے دوسری بار ملے ہیں پہلی ملاقات کی یاد انہیں تب تک نہیں آتی جب تک کہ وہ اسی پہلے کی طرح روپوش نہیں ہو گیا ہوتا۔

شملہ پہنچ کر انہیں پتہ چلا کہ آرمی کمانڈر مانک شاہ پچھلے ہفتہ بھر سے دلی میں فوجی کمانڈروں کی کانفرنس میں مصروف تھے وکرم نے پراجیکٹ کی لائبریری سے وہ پرانی اخبار منگوا کر دیکھی تو اس میں وہ خبر کہیں نظر نہیں آئی جسے اس نے رات خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پڑھا تھا۔

پہاڑوں پر دیو آتماؤں کا باس اکثر سننے میں آیا ہے مگر وہ آدمی تو دیوتا تھا نہ شیطان۔

میجر دلیپ سنگھ نے سکھی فیصلہ سنایا۔ وہ تمہارا واہمہ تھا میاں۔ میں نے تمہیں کتنی بار مشورہ دیا ہے کہ اچھی طرح کھا پی کر ایک دم سو جانا چاہیے۔

وکرم نے جملہ پورا کیا، پی کر نہ سونے سے آدمی کا ذہن عجیب قسم کی خرافات سوچنے لگتا ہے۔

تم نے وہ کہانی سنی ہے دلیپ۔

کون سی کہانی؟

ایک بار دو آدمی گاڑی میں اکیلے سفر کر رہے تھے۔ ایکا ایک ان میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ کیوں صاحب آپ بھوت پریت کو مانتے ہیں۔

دوسرے نے سر ہلا کر کہا نہیں اور غائب ہو گیا۔

ظ۔ انصاری

نہرو اور ابوالکلام

جواہر لال نہرو کو گھر سے جو ادب آداب ملے تھے ان کا تقاضا تھا کہ حفظِ مراتب کا خیال رکھیں کس حد تک خیال رکھا یہ خود نہرو ور آزاد کی تحریروں کے علاوہ دیکھنے والوں کے بیانات سے بھی ظاہر ہے۔

جواہر لال نے اپنے مراسم میں یہ پہلو نظر میں رکھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد پہلے کے سینئر سیاستدانوں کے ساتھ اٹھ بیٹھ چکے ہیں، چترنجن داس، حکیم اجمل خاں اور موتی لال نہرو سے ان کے برابر کے تعلقات تھے ۱۹۱۹ء میں جب جونیر نہرو عملی سیاست میں منہمک ہوتے، تب تک ابوالکلام صفِ اول کے کانگریسی رہنماؤں میں شمار ہونے لگے تھے اور ان کی شہرت ہندستان سے باہر عرب ممالک تک پہنچ چکی تھی۔ جواہر لال کو اکثر مسائل میں مولانا سے اتفاق رائے رہتا تھا، جب اختلاف کی نوبت آتی تب بھی آنکھ کا لحاظ رکھتے اور نہ صرف لحاظ بلکہ اوروں پر اس کا اظہار بھی کردیتے تھے۔

اوّل، ہم خود مولانا کے حوالے سے اختلاف رائے کا ایک واقعہ دہراتے چلیں:

...... کبھی جواہر لال سے اختلاف نہ ہوا۔ ہم دونوں ہمیشہ پکے دوست رہے ایک دوسرے پر تکیہ کرتے آئے۔ نہ کبھی رشک وحسد نے ہمارے درمیان سر اٹھایا، نہ غالباً آئندہ اس کی گنجائش ...... تاہم جواہر لال طبیعت کے تیز اور پرجوش آدمی ہیں۔ عالی ظرف ہیں ذاتی عداوت ان کے دل میں جگہ نہیں بناتی۔ ..... مگر ان کے کچھ رشتہ داروں اور دوستوں کو ہم دونوں کے باہم یہ خلوص کا رشتہ پسند نہ تھا، وہ اختلاف کا شوشہ چھوڑتے رہتے تھے، وہ اختلاف کا شوشہ چھوڑتے رہتے تھے۔ جواہر لال کو نظریاتی (اصولی) مسائل پر زیادہ توجہ رہتی ہے۔ اسی کی آڑ میں انھیں مجھ سے بدگمان کیا گیا.....

میں نے جب پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کو کانگریس کے سپورٹ سے قلمدانِ وزارت

دلوادیا (۱۹۴۵ء) توجواہرلال اس پر خفا ہوگئے ان کا کہنا تھا کہ پنجاب میں مسلم لیگ ایک عوامی پارٹی ہے۔ کانگرس اقلیت میں ہے۔ اب اگر کانگرس کسی پارٹی سے مخلوط وزارت بناتی تو وہ مسلم لیگ کے ساتھ بناتی کہ یہ جمہوری حکومت سازی کا اصول ہے... جواہرلال نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ میں نے (ابوالکلام نے) یونینسٹوں سے معاملہ کر کے غلط پالیسی اختیار کی..... آخر گاندھی جی نے کھلے لفظوں میں زور دے کر جو میرے عمل کی تائید کی اس کی بدولت جواہرلال ٹھنڈے پڑے......

"ان کی فطرت ہے کہ اگر کوئی خیال ان کے دماغ میں جگہ پا گیا تو کسی بھی آنا کانی کے بغیر اس کا اظہار کر ڈالیں گے اور بعد میں پتہ چلے کہ ان سے غلطی ہوئی ہے تو اپنی غلطی مان لینے میں ہچکچائیں گے نہیں.....“ (INDIA, WINS FREEDOM A.K.AZAD)

مولانا نے جواہرلال کا ذکر اس تصنیف میں کوئی چالیس بار کیا ہے اور اس میں ایک درجن سے زیادہ مواقع پر بڑے بھائی کا سا مشفقانہ لب ولہجہ رکھا ہے تین موقعے البتہ ایسے ہیں جب مولانا اور جواہرلال میں سخت اختلاف رائے ہوا۔

ایک۔ یوپی میں پہلی کانگرس وزارت سازی کے وقت جواہرلال نے ضد کی کہ مسلم لیگ کو جو حکومت میں شریک کرنے کا وعدہ تھا اسے صرف اسی صورت میں پورا کیا جائے گا کہ لیگ کے نمائندے کانگرس میثاق (PLEDGE) پر دستخط کر دیں اور اس کے پابند رہیں۔ اگر یہ وعدہ خلافی نہ کی جاتی تو لیگ رفتہ رفتہ کانگرس میں ضم ہو جاتی (۱۹۳۷ء)

دوسرے جب وزارتی مشن پلان کو منظور کر چکنے کے بعد (۱۰ جولائی ۴۶ء کو) جواہرلال نے بمبئی کی پریس کانفرنس میں اعلان کر دیا کہ کانگرس دستور ساز اسمبلی میں داخل ہوگی تو کسی عہد نامے یا صلح نامے کی پابند نہ ہوگی۔ صورت حال دیکھ کر آزادانہ فیصلہ کرے گی اور ایک سوال پر تو یہاں تک دو ٹوک کہہ ڈالا کہ کانگرس نے دستور ساز اسمبلی میں شرکت قبول کی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ پلان کی ہر ایک شرط کو جوں کا توں قبول کر لیا جائے ہم اس میں حسب موقع ترمیم واضافہ بھی کر سکتے ہیں۔

"مجھے صاف طور سے ریکارڈ کرنا ہے کہ جواہرلال کا بیان غلط تھا.....“

مسٹر جناح جو وزارتی مشن کے پلان پر بادل ناخواستہ راضی ہو گئے تھے، اس بیان پر اکھڑ گئے

اکتوبر ۴۶ء کا قصہ ہے جب جواہرلال نے عارضی حکومت کے وزیراعظم کی حیثیت سے اچانک فیصلہ کیا کہ شمالی مغربی صوبہ سرحد کا دورہ کریں جہاں پہلے بھی اور اب بھی کانگرس گورنمنٹ قائم تھی۔ انگریزوں نے وزیرستان پر بمباری کرائی اور اب یہ افواہیں پھیلائیں کہ پٹھان جرگے کانگریس وزارت کے خلاف ہیں۔ قومی عارضی حکومت نے اختیار سنبھالتے ہی بمباری بند کرادی اور جواہرلال نے لارڈ ویول کے سامنے دعوٰی کیا کہ پٹھان جرگے ان کے حمایتی ہیں، مخالف نہیں۔

"........ نہرو کی فطرت ایسی ہے جو سوجھ گئی وہی کر بیٹھیں گے نتیجہ یہ کہ انھیں سمجھا بجھا کر منایا تو جا سکتا ہے لیکن بعض اوقات اونچ نیچ دیکھے بغیر جی میں ٹھان لیتے ہیں پھر قدم اٹھا دیتے ہیں اور انجام کی پروا نہیں کرتے........" ص ۱۶۹ ۲۰۰

مولانا لکھتے ہیں کہ لارڈ ویول (وائسرائے) اور میں نے جواہرلال کو روکا، منع کیا کہ وہ سرحدی علاقے میں نہ جائیں مگر وہ اٹل رہے۔ گاندھی جی تک کی نہ سنی اور روانہ ہو گئے .... وہاں جواہرلال پر سنگباری ہوئی، حملے ہوئے اور ان کی جان کے لالے پڑ گئے مگر نہ ان کے ارادے میں کمزوری آئی نہ خوف طاری ہوا...... بعد میں انھوں نے مخالفانہ مظاہرہ اور حملہ کرنے والوں کو معاف کر دیا۔

۳۵ برس کے ساتھ میں یہ تیسرا موقع تھا جب مولانا اور جواہرلال میں سخت اختلاف رائے رہا لیکن انھی موقعوں پر مولانا نے جواہرلال کے ذاتی کردار کی خوبیاں اجاگر کی ہیں، ان کی نیک دلی، صاف باطنی ہمت، سرفروشی، بے غرضی اور بلند نظری۔ جسے کسی قسم کی فرقہ پرستی چھو نہ سکی۔ نہرو کی ان صفات کے ساتھ وہ ان کی عادات پر بھی ریمارک کرتے جاتے ہیں۔

- جواہرلال سوتے میں بڑبڑاتے ہیں، انگریزی میں اسی تقریر کے حصے دہرانے لگتے جو دن کے وقت درپیش تھی۔
- مٹھائی پر گرتے ہیں، کچھ نہیں تو گڑ سہی۔
- چائے کا شوق ہے، یوروپی طرز پر دودھ کے بغیر چائے پئیں گے لیکن خوب سی مٹھاس ملا کر۔
- غصے میں کچھ بھی اول فول بک جائیں، دل میں کینہ نہیں رکھتے۔
- مردوں میں کرشنا مینن کا اور عورتوں میں لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا اثر بہت ہے اور بعض اوقات فیصلہ کن (اور نقصان دہ) ثابت ہوتا ہے۔

مولانا نے احمد نگر جیل سے لکھے گئے خطوط (مجموعہ غبار خاطر) میں جواہرلال کی خوبیوں اور خصلتوں کا کئی بار ذکر کیا ہے جو وہیں پڑھنے اور لطف اٹھانے کے قابل ہے۔

ریپبلک کی صدارت

ہندستان کی تقسیم سے چھ مہینے پہلے ملک میں مرکزی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا۔ چلتا رہا۔ گاندھی کی تجویز تھی اور نہرو اور پٹیل کی تائید کہ مولانا کو صدارت کی مسند سونپی جائے۔ آزاد ہندستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں میر مجلس کا عہدہ جلیلہ۔

مولانا اس سے پہلے مرکزی عارضی حکومت میں قلمدان وزارت قبول کرنے سے انکار کر چکے تھے مجوزہ صدارت کے سوال پر بھی قیل وقال کرنے لگے آخران کی تجویز اور پر زور سفارش پر راجندر پرساد کو راشٹرپتی بنانا طے پایا۔ نہرو کو ان کی دور اندیشی اور سیاسی بصیرت پر وہ اعتماد نہ تھا جو مولانا کی ان صفات پر تھا لیکن مولانا کے کہنے سننے پر آمادہ ہو گئے۔

دوسرا اس سے بھی نازک مرحلہ تب آیا جب صدارت کی پہلی پنج سالہ مدت پوری ہوتے ہوتے نائب صدر، سروپلی رادھا کرشنن نے اشارہ دیا کہ اب ان کی باری ہے۔

ایک تو رادھا کرشنن کا علمی وقار، پھر وزیر اعظم شمال کا ہو تو صدر جمہوریہ کا جنوب سے ہونا بہتر۔ تیسرے یہ کہ رادھا کرشنن کا کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہ تھا اور صدر کو اسی ماضی اور مرتبے کا ہونا چاہیے کہ کوئی پارٹی اسے اپنی مٹھی میں نہ لے سکے۔

سارے اسباب مہیا تھے۔ نہرو بھی اس انتخاب یا "پروموشن" کے حق میں تھے لیکن مولانا نے راجندر بابو کا عندیہ پالیا کہ وہ ابھی پانچ سال اور دربار لگانا چاہتے ہیں۔ مولانا نے نہرو کو راضی کرنا چاہا، وہ نہیں مانے۔ علاوہ اور مصلحتوں کے خاص دلیل یہ دی کہ راجندر بابو کی عمر زیادہ ہو گئی۔ وہ کب تک یہ ذمہ داری سنبھالیں گے۔ اس پر مولانا کسی قدر برہم ہو گئے۔ نہرو سے ذرا اونچی آواز میں کہا۔ ہماری تمہاری عمریں اسی لپیٹ میں آتی ہیں۔ پنت جی کی تو گردن تک ہلتی ہے۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ ہے پہلے ہم لوگ ریٹائر ہو جائیں، پھر راجندر پرساد کی جگہ خالی کرائیں۔

کانگرس پارٹی کے سبھی لیڈروں نے نہرو کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر گھٹنے ٹیک دئے اور راجندر پرساد کی مسندِ صدارت کو پانچ سال اور مل گئے

(حالانکہ ہمیں کئی ذریعوں سے معلوم ہے کہ مولانا اور جواہرلال دونوں انھیں ایک راستباز آشرمی سے زیادہ کچھ نہ سمجھتے تھے)

مولانا آخری بار ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک کانگرس کے صدر رہے۔ پوری تاریخ میں کوئی

اتنے زمانے تک ۱۹۴۱ء کا صدر نہیں رہا۔ گمان گزر سکتا ہے کہ وہ ہر ایک کو خوش رکھتے ہوں گے اور تو اور خود گاندھی جی کو، جن کی وہ تعظیم کرتے تھے، ہمیں خوش نہیں رکھا۔ ان سے کھلے عام اختلاف بھی کیا اور سرِ عام نکتہ چینی بھی، نہرو کا نمبر تو بہر حال گاندھی جی کے بعد ہی آتا ہے پنڈت جی ان کے مزاج داں تھے، نزاکتوں کا خیال رکھتے تھے۔ راجندر پرساد کے انتخاب کے معاملے میں نہرو نے مولانا کی رائے کو بہر حال مان لیا۔

آج نہیں ۔ کل

اس سے نازک تر موقع آیا اس شام جب شیخ عبداللہ (شیرِ کشمیر) اور کشمیر کی اندرونی سیاسی اتھل پتھل پر ناگہانی فیصلہ ہونا تھا۔ مولانا کے سکریٹری اجمل خاں نے سنایا کہ ایک شام ذرا دیر سے پنڈت جی کے سکریٹری کا فون آیا کہ براہِ راست مولانا سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ ملنے آرہے ہیں۔ اجمل خاں اندر خواب گاہ میں گئے مولانا اپنے محویت کے عالم میں تھے کتابیں بھی کھلی رکھی تھیں۔ اطلاع دی کہ پنڈت جی آرہے ہیں۔ جواب ملا اس وقت نہیں ۔ کل!

اجمل خاں نے معاملہ فہمی اور ہوشیاری سے کام لیا۔ پھر فون ملایا اور دریافت کیا کہ یوں تو مولانا آرام میں ہیں میں آنکھ لگ گئی ہے آپ کہیں تو اٹھادوں!

جواب ملا: آرام کرنے دو، کل صبح سہی!

اردو کانفرنس میں

میں نے آخری بار آل ہند اردو کانفرنس میں نہرو جی اور مولانا کے ایک ساتھ دیدار کیے جب وسط فروری ۱۹۵۸ء میں اردو پارک جامع مسجد کے سامنے دو روزہ یادگار اجلاس ہوئے تھے۔ ان میں اختلافی نقطۂ نظر کے نمائندے شریک تھے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو پہلے اجلاس کی صدارت کرنی تھی اور مولانا کو افتتاح مگر مولانا ذرا دیر سے پہنچے تب تک پورا ڈائس رہنماؤں سے اور اُن کے ساتھ تصویر نکلوانے کے شائقین سے بھر چکا تھا۔

جواہر لال آگے بیٹھے۔ باڈی گارڈ پیچھے اور سامنے وہ بھی گویا حاضرین میں شریک تھے، الگ نہیں۔ اتنے میں مولانا کی سواری آئی۔ وہ ڈائس پر چڑھے تو جواہر لال اپنی جگہ سے دو قدم اٹھے جگہ بنائی اور مولانا کو بازو کا سہارا دیے ہوئے صدر کی جگہ لاکر بٹھایا۔ وہ چپ چاپ سامنے بیٹھ گئے، تب جواہر لال ذرا پہلو دبا کر زانو سمیٹ کر بیٹھے۔

یہ جواہر لال نہرو کا اپنے سے بڑے تھا ان کے ہم عصروں اور ہمسروں کے بعد شاید ہی کسی کو حفظِ مراتب کا یہ چلن نصیب ہو۔

مسعود منوّر

نور جہاں

غیر منقسم آواز کا لمس

محبت ایک عجیب طلسمی وظیفہ ہے۔ میں جب کسی بھولے بھٹکے نام کو یاد کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ کوئی اپنی نرم اور گداز انگلیوں سے میرے ہونٹ سہلا رہا ہے۔ میں اپنے عقیدوں اور عبادت گاہوں کے خاصے فاصلے پر بھٹکتا رہتا ہوں تاکہ دوری میرے اندر لگن اور وابستگی کی شمع روشن رکھ سکے۔

ان دوریوں کے سفر میں آوازیں میرا پیچھا کرتی ہیں اور روشنیاں میری راہ روک لیتی ہیں۔ اُسی طرح جیسے کسی سنسان گلی میں کوئی تنہا لڑکی کسی محبوب سے ہم آغوش ہوجائے۔ ہم آغوشی کی لذت، خوشبو، آنکھ اور لہجے میں پوری طرح عریاں ہوتی ہے دلّی کے سفر کے دوران جب کافی ہاؤس میں چانن گوبند پوری نے ترنّم کی ملکہ نور جہاں کو یاد کیا تو مجھے اس نفیس پنجابی شاعر کے لہجے میں ہم آغوشی کا حسن پوری طرح سمٹتا دکھائی دیا۔ کہنے والے لفظ زندہ ہوں تو وہ ہونٹوں کے طاقچوں پر شمع کی طرح روشن ہوتے ہیں اور تصویر کی طرح مزین۔ چانن گوبند پوری کی یادوں میں کوئل کی کوک کا ملہار تھا۔ وہ نور جہاں کو یاد کرتے کرتے ایک لمحہ کے لئے نور گوبند پوری ہوگئے اور آواز کی ملکہ چانن جہاں بن گئی۔

نور جہاں، سیتا کے بیٹے کُش کے شہر قصور میں پیدا ہوئی۔ اس کے محلے کا نام کوٹ مراد ہے۔ جب وہ اپنے شہر قصور کو یاد کرتے ہوئے

میرا سوہنا شہر قصور نی

جدھیاں دھماں دور دور نی

کہتی ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے کوئی گھر سے بچھڑی ہوئی بچی محبت کے مارے اپنی

ماں کو پکار رہی ہو۔

نورجہاں کی پکاریں۔۔۔۔ بجھے ہوئے لفظوں کی تجارت نہیں بلکہ وہ جس لفظ کو اپنے گلے کی فونڈری میں ڈھالتی ہے، وہ ایک مرصع زیور بن کر کسی گوری کے ماتھے پر جھومر کی طرح جگ مگ کرنے لگتا ہے۔ اس کا ترنم ایک ایسا رسیلا بوسہ ہے کہ اس کی گنگناہٹ کی ایک سو ایک ویں کاربن کاپی سے لڑکیاں اپنی کنواری آشنائیوں کو مہمیز دیتی ہیں۔ وہ نورجہاں کے بول الاپ کر کاغذ پر لب سٹک سے ہونٹوں کی قوسیں بناتی ہیں اور یہ کاغذ لفافے میں بند کر کے اپنے محبوب کے نام پوسٹ کر دیتی ہیں۔

کاغذی لوسے

سمندر پار، یاروں کے لئے۔

میں پچھلے تیس برسوں سے اس آواز کو سن رہا ہوں۔ یہ آواز جواب چار دہائیوں کی سرحدوں تک ہر سماعت میں شہد کی طرح گھُلی ہوئی ہے، ہماری زمینوں کی ایک امٹ سندرتا ہے۔ نورجہاں کی گائیکی کے معیار کا تعین موسیقی کی انتھرویالوجی کا مسئلہ ہے۔ یعنی موسیقی کی اپنی انتھرویالوجی ہے جو میوزیکالوجسٹوں اور انتھرویالوجسٹوں کی گرفت میں ہے۔ میوزیکالوجسٹوں کے نزدیک یہ علم گلے سے نکلنے والے سروں کے لئے ایک بیس لائن یا بنیادی خط وضع کرتا ہے لیکن میں اس مضمون میں انسانی رویے کے طور پر موسیقی کے معالعہ کے لئے کوئی تانا بانا بننے کے موڈ میں نہیں ہوں تاہم اتنا عرض کروں کہ گائیکی انسانی رویے کا وہ تسلسل ہے جو ایک مخصوص ثقافت رکھنے والے لوگوں کی قدروں، عقیدوں اور دلوں سے مرتب ہوتا ہے۔ موجودہ معاشرت میں موسیقی، اظہارِ ذات کے لئے نہیں بلکہ دوسرے لوگوں سے سماجی تعلقات کے لئے موزوں کی جاتی ہے۔ ہماری موسیقی کسی سرد خانے یا تاریخ کے کسی عجائب گھر سے برآمد نہیں ہوتی بلکہ یہ ہماری زرعی قبائلی زندگی کی پرخلوص روایات اور ذاتی کاوشوں سے پیدا ہوئی ہے

یہ موسیقی بے روح ، بے خیال یا منفعل نہیں بلکہ ہمیشہ توانا ، نامیاتی اور مقرب رہی ہے ۔ بلاشبہ ہم اسے پرشکوہ قرار دے سکتے ہیں ہم اپنی مقامی موسیقی کے بارے میں جو کچھ کر سکے ہیں وہ اس سے بھی سوا ہے۔ ثقافت کے ایک لاینفک اور قیمتی حصے کے طور پر یہ احترام کی روادار ہے اور احترام کا تقاضہ ہے کہ اسے محفوظ کرنے میں مدد دی جائے۔

نورجہاں کی کنواری آواز کا رشتہ متحدہ ہندستان کی معاشرت سے ہے ۔ آواز جو غیر منقسم ہے ۔ جیسے کسی نظرے کے آرے سے چیر کر دو نیم نہیں کیا جاسکتا اب بھی اپنے اسی آغاز کے طلسم سے مربوط ہے ۔ "جگنو" کی بے بی نورجہاں اداکارہ بھی تھی اور گلوکارہ بھی ۔ جگنو اور انمول گھڑی کے گیتوں کی بازگشت ہمیں آج بھی سنائی دیتی ہے ۔ چنانچہ ۱۹۸۰ کے وسط میں دلی کا کافی ہاؤس میں نورجہاں کو یاد کرنے والا چانن گوبند پوری جگنو اور انمول گھڑی کے گیتوں کے حوالے سے ابھی تک اسی کنواری آواز کی شیرینی سے مسحور ہے وہ آواز جوان سماعتوں کے لئے لہو کے لمس اور ہونٹوں کے گداز کی طرح ہوتی ہے ۔

نورجہاں کی آواز میں ایک تنوع آمیز ہم آہنگی ہے ۔ اس کے مختلف گیتوں میں ایک اضافی حسن کا جوہر موجود ہے جو اس کی آواز کے تہہ در تہہ امنوں کو منکشف کرتا ہے لیکن " جگنو " اور انمول گھڑی کے بعد پاکستان کی ابتدائی فلموں کے گیتوں میں اس کی آواز ایک نئے عہد کے نقوش ابھارتی ہے وہ نقوش جن کی بنیاد مقامی وجود اور مقامی رنگ پر ہے ۔ چنانچہ منڈیا سیالکوٹیا " اور " نچ جا منڈیا موڑلوں " ۔ جیسے گیتوں کی دھنیں پنجابی لوک گیتوں کے رچاؤ سے نورجہاں کو وہ بنیاد مہیا کرتی ہیں جس پر اس کے سٹائل یا اسلوب کی عمارت تعمیر ہوئی ہے ان گیتوں سے ایک آواز نِتھر کر میدانی بہاؤ میں آتی ہے اور پنجاب کے دریاؤں کی طرح کھل کر بہتی ہے ۔ پاکستان کے ابتدائی سال دشواری اور صعوبت کے سال تھے لیکن اس کے باوجود تعمیر کی اور جہدِ للبقار کا جذبہ ایک بھرپورتا کے ساتھ

روبہ عمل تھا۔ تعمیر کے ان ہی موسموں اور جہد کی ہواؤں کے درمیان نور جہاں کی آواز
نے نشوونما کے نوع بہ نوع قرینے سیکھے۔ شوکت حسین رضوی کے عشق نے اس
آواز کو میقل کیا تو ونجھلی کی تان کسی باطنی کرب میں بجھ کر امر ہو گئی۔ عشق آواز کے
حسن کے لئے سواری کی طرح ہوتا ہے جو اپنے جوگی کو اڑتے ہوئے لمحوں کی
پرفانی میں سدرۃ المنتہیٰ تک لے جاتا ہے۔ اسی محبت کی یادگار لاہور کا شاہ نور سٹوڈیو
منٹو کی کہانیاں اور اصغر اکبر اور ظلِ ہما ہیں۔

پاکستان میں پہلی فوجی آمریت کے علم اڑ رہے تھے۔ ایوب خاں نے ابھی جنگ
کا طبل نہیں بجایا تھا۔ معیشت کی ہڈیوں میں فاسفورس کی وافر مقدار موجود تھی۔
نور جہاں کی ازدواجی زندگی پرسکون تھی، انتظار کے گیت فضاؤں میں گونج
رہے تھے جن کی نغمگی نے ایک لمحے کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی مضطر
کر دیا شاید پنڈت جی فاسٹلجیا میں مبتلا ہو گئے تھے۔ انتظار کے
گیتوں میں نور جہاں کی آواز سندرتا اور بھرپورتا کا شاندار سنگم بن کر ابھری
اب بھی راتوں کو مجھے اس کے گیتوں کے وہ بول سسکیاں بن کر سنائی دیتے ہیں
جو پاکستان سے آنے والی ہوائیں اپنے ساتھ لاتی ہیں۔

جس دن سے پیا دل لے گئے
دکھ دے گئے

اس دن سے گھڑی پل ہائے
چین نہیں آئے

اس گیت کی درد بھری دھن میں جدائی کا وہ کا بوس بند تھا جو بالآخر سقوط بنگال
پر منتج ہوا۔ آواز نے رابطے کے جنوں میں سب دیواریں ڈھا دی تھیں۔ ہم
ایک ثقافتی چوراہے پر کھڑے تھے، چوراہے پر سے پھوٹنے والے چاروں
راستے راست ہوتے ہیں۔

نور جہاں کی آواز کے میں ہماری غیر منقسم معاشرت اپنے ماضی کو دہرا رہی

تھی۔ علامتی درد کے اظہار میں موسیقی اپنے مشترک سروں سے رابطے کا خواب بن رہی تھی۔ کمیونی کیشن۔ ہماری معاشرت میں گائیگی کی تربیت بہت مختلف ہے ہم اپنے جذبوں کو بڑی مہارت سے بیان کرتے ہیں۔ اتنی مہارت سے کہ علامت ایک ہی الاپ میں عریاں ہو جاتی ہے۔ اس کا لباس اس کے وجود سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور موسیقی جو ایک عالمگیر انسانی مظہر ہے، انسان کے سامنے اس کی اپنی خواہشوں کی تجسیم بن کر رونما ہوتی ہے۔

بھولی بسری خواہشوں کی شمعوں کو من میں روشن کرنا، گلوکارہ کا ایک ابتدائی وظیفہ ہے۔ وہ اپنے گلے سے ایک سریلی تان اڑاتی ہے تو اس کے سرگموں میں ایک پیغام مضمر ہوتا ہے، جسے سامعین اپنے آپ شناخت کر لیتی ہیں یعنی گیت کے بولوں سے قطع نظر، دُھن کی امنوں گری میں علم کی ترسیل کا جوہر پنہاں ہوتا ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائیہا شکایت می کند

اب سوال یہ ہے کہ فن کار یہ پیغام کہاں سے لاتا ہے تو اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ سارے غیر لسانی فنون کا محور ایک ہے یعنی ثقافت

ہر عہد کے ضمنی مذاق میں جو تبدیلی رونما ہوتی ہے وہ ایک ایسی قلمز میں نشود نما پاتی ہے جو فن کار کے دماغ سے بہت دور ہے۔ چنانچہ نورجہاں کی آواز میں جس گداز اور جس درد کا اظہار ہوتا ہے اس کا محرک ہمیں ثقافتی وجود میں تلاش کرنا پڑتا ہے یہ ایک خالص تہذیبی ذمہ داری ہے۔ لیکن اپنے تہذیبی مسائل سے نابلا حکمراں طبقے لوگوں پر ایک مصنوعی نفرت اور کینہ طاری کر کے محبتوں کے مابین کمیونی کیشن کو ایک بحران سے دوچار کر دیتے ہیں۔ منظم سُریں ایک بے ہنگم شور میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ انتظار کے گیت کسی معصوم پرندے کی طرح زخم کھا کر پھڑ پھڑاتے ہیں اور آخری ہچکی لے کر دم توڑ دیتے ہیں لیکن

اس بحرانی کیفیت میں جو گیت گائے جارہے ہیں وہ مقامیت سے زیادہ میل شاونزم کے ضمن میں ہیں۔ گیت علامتوں کی بکلوں سے نکل آئے ہیں اور برہنہ ہوگئے ہیں یعنی زیادہ واضح ہیں یہ اچھی بات ہے موسیقی کو ہمیشہ اتنا ہی دل کش ہونا چاہیئے کہ بھدا پن حسن میں تبدیل ہو جائے لیکن ایسا حسن نقصان دہ بھی ہوتا ہے۔ لفظ کوئی بھی ہو اسے سروں میں موزوں کیا جا سکتا ہے اور اگر لفظوں کو سلیقے سے مرتب کیا جائے تو ہماری مقامی زبانیں گیتوں کے لئے بہت ہی موزوں ثابت ہوتی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ نفرت کی زبان کو راگوں میں موزوں کرنے سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ یہ حکمرانوں کا مسئلہ نہیں ایک تہذیبی الجھاؤ ہے جسے وہ حل نہیں کر پائیں گے۔ لہذا نور جہاں کو نفرت کی زبان میں گانا پڑتا ہے۔ اور وہ اس ریڈیو سٹیشن پر واپس آتی ہے جہاں سے اس کے رابطے برسوں پہلے ٹوٹ چکے ہیں، سلولائیڈ کے شہر کی رانی، ریڈیو پر پراپیگنڈسٹ بن کر آئی ہے۔ یعنی وسیع ترکمیونی کیشن کی خاطر آواز اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف لوٹ آتی ہے۔ جنگ اور زوال کی گھڑی۔

میریا ڈھول سپاہیا تینوں اب وہاں رکھناں

یہ وہ صورتِ حال ہے جو موسیقی پر مسلط کر دی گئی ہے تاکہ انتظار کے گیتوں کا طلسم توڑا جا سکے۔ نور جہاں گاتی رہتی ہے۔ غیر منقسم آواز کے شکستہ بال و پر پھڑپھڑا کر ٹوٹ رہے ہیں، پریم کی گنگا بہلانے والے اب خون کی ندیاں بہانے والوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ اس خانہ جنگی جیسی جنگ کے بعد نور جہاں کے ازدواجی رشتے بھی جنگ کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ شوکت حسین رضوی سے علیحدگی اور اعجاز سے عشق ــــ جب آدمی مطمئن ہو تو گاتا ہے لیکن جب وہ ناراض ہو تو شور مچاتا ہے۔ نور جہاں شور مچانے کے بعد تھک گئی تھی۔ جب کوئی شخص چیختا ہے تو وہ سوچ نہیں رہا ہوتا۔ جب وہ گا رہا ہو تو وہ سوچتا ہے، ایک نغمہ، سکون کی علامت ہے، شور نہیں۔ جب کوئی چیختا ہے تو

اس کی آواز اس پر مسلط کر دی جاتی ہے لیکن جب وہ گاتا ہے تو آواز کو دل دریا کی تہوں سے غوطہ زن کی طرح نکال کر لاتا ہے یہ ہے موتی۔ نورجہاں کی آواز کے موتی جب بازار میں کنکروں کے مول بکنے لگے تو اُسے ایک نئی توانائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ نغمہ نے سنگت کے لئے اعجاز کو چنا جو بعد کی نسل تھا، خوبصورت تھا، جوان تھا۔ تازہ ہونے نورجہاں کو سرور کا ایک نیا موسم دیا۔ وہ پھر گانے لگی۔ "دوستی" کے سارے گیت اسی سنجوگ کی نشانیاں ہیں۔

یہ وادیاں یہ پربتوں کی شاہزادیاں
پوچھتی ہیں کب بنے گی تو دلہن
میں کہوں جب آئیں گے مرے سجن

اس گیت میں ایک بار پھر سے جوان ہوتی ہوئی نورجہاں کی آواز کی کھنک سنائی دیتی ہے۔ حیاتِ نو کی جھلک۔ اسی عہد میں "ہیر رانجھا" کے گیت "ونجھلی والڑیا" اور "سن ونجھلی دی مٹھڑی تان وے" اس کی حیاتِ نو کے شاہد ہیں۔ اعجاز سے ناچاکی کے بعد نورجہاں کے گیتوں پر پھر ایک عمر رسیدگی کا احساس طاری ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ وہ آواز جو پچھلی تین دہائیوں سے نغمے کی قلمرو پر حکمراں تھی اپنا تخت سازشوں میں گھرا پا رہی ہے۔

کہے حسین فقیر سائیں دا تخت نہ ملائے منگیاں

نورجہاں آواز کی ملکہ ہے لیکن کبھی اس کی شہرت اسے اقتدار کے دروازے تک لے جاتی ہے اور اس کے لئے رسوائی کا باعث بنتی ہے ایوب خاں کے جانشین یحیٰ خاں کے عہد میں اسے لاہور کے گورنر ہاؤس میں طلب کیا گیا۔ آرکسٹرا ساتھ تھا۔ حسن لطیف مرحوم میوزک ڈائرکٹر تھے یحیٰ خاں کو نورجہاں کا گایا ہوا گیت، "سن وے بلوری اکھ والیا" اتنا پسند آیا کہ ایک ہی نشست میں پچیسوں بار سنا گیا۔ یحیٰ خاں کی درباری محفلوں

سے نور جہاں کو ایک ربطِ خاص تھا۔ چنانچہ یحییٰ خاں کے اقتدار سے ہٹنے کے بعد کتنی ہی مضحکہ خیز کہانیاں اور سکینڈل نور جہاں کا تعاقب کرتے رہے کئی تصویریں بھی چھپیں جن میں نور جہاں، جنرل رانی کے ہمراہ یحییٰ خاں کی شبانہ محفلوں کی رونق بڑھا رہی تھی۔

ان قصے کہانیوں سے قطع نظر، وہ تنہائی پسند اور انا کی مریض ہوتے ہوئے بھی، ایک سوشل خاتون ہیں۔ محفل آرائی اور خوش سلیقگی میں اس کا ثانی نہیں۔ لاہور کے شاعروں اور ادیبوں سے اس کو ایک تعلقِ خاطر ہے۔ بادہ نوشی کی محفلوں میں وہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم مرحوم سے اس قدر بے تکلف ہو جاتی کہ ان کے گنجے سر پر بوسے بازی کی مشق شروع کر دیتی وہ صوفی صاحب کو جن القابات سے نوازتی وہ کسی معشوقۂ دل نواز کے بس کی بات تھی۔ صوفی بھی اس سے بڑی محبت کرتے اور اس کے عشووں اور غمزوں کو صمیم قلب سے برداشت کرتے۔

نور جہاں جب بیرونی ممالک سے اپنے لئے شاپنگ کر کے واپس آتی ہے تو وہ کسٹمز کے اصولوں کو ہر گز خاطر میں نہیں لاتی۔ شاید وہ یہ سمجھتی ہے کہ اس کے پاس کسٹم والوں پر ڈکلیئر کرنے کے لئے خوبصورت آواز کے سوا کچھ نہیں، جیسے ایک مرتبہ آسکر وائلڈ نے امریکا کے کسٹم حکام سے کہا تھا۔

نور جہاں اب بوڑھی ہوتی جا رہی ہے مگر وہ اب بھی پوری شدت سے گا رہی ہے۔ عمر کی ان منزلوں میں نور جہاں روبہ سوال سہی لیکن اب بھی اس کے تیوروں پر ایک سدا بہار گلوکارہ کا روپ چڑھا ہے۔ وہ گاتی ہے کہ گیت اس کی زندگی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ وہ اپنی آواز

کے ماورا معدوم ہو جائے گی۔ وہ وہیں تک ہے جہاں تک اس کی آواز جاتی ہے اور وہ اس دن کا انتظار کر رہی ہے جب اس کا پورا وجود آواز میں تحلیل ہو جائے گا۔

ڈاکٹر مست رام کپور

آدم و حوّا ازلی ناط

ایک سماجی لعنت

ہندی کے مشہور و معروف ناول نگار اور ڈرامہ نویس جناب وشنو پربھاکر کا کہنا ہے کہ زنا بالجبر عورتوں کے ساتھ تشدد کی سب سے ذلیل ترین حرکت ہے۔ وشنو پربھاکر جی آج کل اپنے نئے ناول پر کام کر رہے ہیں۔ جو زنا بالجبر کے مسئلے سے تعلق رکھتا ہے۔ وشنو صاحب پچاس سے بھی زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں جن میں بنگالی زبان کے نامور ناول نگار شرت چندر چٹو پادھیائے کا سوانحی اور ادبی مطالعہ آوارہ مسیحا بھی شامل ہے۔ اس کتاب کو ایک ہندوستانی کلاسیک کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ وشنو جی کا خیال ہے کہ عورتوں کے ساتھ تشدد کے واقعات عام تشدد کے واقعات کے برابر ہی بڑھے ہیں

وشنو پربھاکر

اگرچہ اسے ایک بین الاقوامی معاملہ کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے۔ تاہم ہندوستان میں اسے مہاتما گاندھی کے نظریات کی منصوبہ بند اور منظم تردید کا رنگ دیا گیا ہے کیوں کہ وہ عدم تشدد کے بڑے حامی تھے۔ ان کا خیال ہے کہ جواہر لال نہرو گاندھی جی کے طریق کار میں اعتقاد نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی مسز اندرا گاندھی اور موجودہ حکمراں کے لیے تو گاندھی جی محض عجائب گھر کا فن پارہ ہیں۔

عورتوں کی طرف سے مساوی حقوق کے لیے جدوجہد کے بارے میں سٹری پربھاکر کا خیال ہے کہ اقتصادی خود مختاری عورتوں کی آزادی کے سلسلے میں اچھا خاصا کردار ادا کرے گی لیکن ثقافتی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ذہنیت جو ہمیں منو سے ودیعت ہوئی ہے عورتوں کو مساوی حقوق دینے کے سلسلے میں بڑی سخت رکاوٹ ہے اور اسے مصنفین اور فنکاروں کی طرف سے سوچ وچار کو سطح پر سلجھانے کی ضرورت ہے ویر بھوگیہ وسوندھرا (دھرتی کا لطف بہادر لوگ ہی اٹھاتے ہیں) جیسے گھسے پٹے مقولوں

نے عورتوں کو بڑا نقصان پہنچایا ہے کیونکہ تقریباً تمام قدیم کتابوں میں دھرتی کو عورت سے مماثلت دی گئی ہے۔ اس سے یہ تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ دھرتی کی طرح عورت کو بھی بہادروں اور قوم کے مردوں کی تفریح کے لیے تخلیق کیا گیا ہے جس سے مردوں کو زنا بالجبر جیسے جرم کرنے کا حوصلہ ہو گیا ہے۔

جناب وشنو پربھاکر کہتے ہیں کہ ہم ادب میں بھی عورتوں کے تئیں درست برتاؤ کا دعوا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ بیشتر ادب کے مصنف مرد ہیں۔ لیکن اس المیے کا بدنصیب پہلو وہ عورتیں بھی ہیں جو مصنفین کی حیثیت سے خاصی اچھی تعداد میں آگے آرہی ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر نہ اپنے آپ کو آزاد کرانے کے لیے کچھ لکھ رہی ہیں نہ اپنے قارئین کو وہ زیادہ تر مردوں کے ذوق کی تشفی کے لیے لکھ رہی ہیں تاکہ انھیں مرد کی دنیا میں امتیاز حاصل ہو۔

محبت عورت کی سب سے بڑی قوت ہے

ہندی کے مشہور ناول نگار، کہانی کار اور گاندھی ازم کے جانے مانے فلسفی شری جینندر کمار کا اعتقاد راسخ ہے کہ عورتیں مردوں پر فوقیت رکھتی ہیں اس کے باوجود کہ انہیں مردوں کی جانب سے تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ مرد اور عورت کے رشتے کو وسیع تناظر میں لیتے ہیں، جس میں انسانی زندگی کی تمام سرگرمیاں شامل ہیں۔ ان کے حالیہ ناول "دشارک" میں انہوں نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرد روپے پیسے، مارکیٹ، مقابلے تضادات اور تشدد کے کلچر کی ترجمانی کرتا ہے۔ کہ عورت گھر، محبت، ایثار اور امن واماں کا سمبل ہے اس ناول کی ہیروئن سرسوتی، اپنے خاوند کی بدسلوکی کے باعث اسے چھوڑ دینے کے بعد رنجنا بن جاتی ہے اور وہ ایک امداد باہمی کا مشاورتی ادارہ چلاتی ہے جہاں گوناگوں اخلاقی معیار کے مرد اس کے پاس آتے ہیں۔ بڑی بڑی رقمیں ادا کرتے ہیں اور جذباتی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ مغرور، گستاخ، تشدد پرست مردوں کو ان کی جسمانی تشفی کی بدولت نہیں بلکہ انہیں خود اپنے آپ کو سمجھنے کے قابل بنا کر سدھایا جاتا ہے۔

شری جینندر اس خیال پر اتفاق نہیں کرتے کہ عورت کو خود مختار ہونا چاہیے کیونکہ ان کا اعتقاد ہے کہ مرد اور عورت اس حد تک لازم ملزوم ہیں جیسے کہ وہ ایک ہوں، ان کا

متحد ہونا وقت اور خلاء کے ابدی رشتے کی طرح ہے۔ مرد کا عورت سے آزاد ہونا اور اسی طرح عورت کا مرد سے آزاد ہونا محض خام خیالی ہے۔ مرد اس وقت تکمیل پاتا ہے جب وہ نصف عورت یعنی اردھ ناریشور بن جاتا ہے۔

جینندر جی کا خیال ہے کہ روپیہ پیسہ اور مارکیٹ کا کلچر ایسے دو پہلو ہیں جو عورتوں کے مفادات کے خلاف کام کرتے ہیں۔ روپے کا دیوانہ مرد یقینی طور سے عورت کو ایک قابل فروخت جنس تصور کرے گا اور اس لیے عورتوں میں یہ بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ ان رسم و رواج کے خلاف بغاوت کریں جو کسی روپ میں بھی روپے پیسے سے تعلق رکھتے ہیں۔ صرف جہیز کے رواج کے خلاف ہی سرکشی کرنا کافی نہیں، بلکہ عورتوں کو زیورات

جینندر کمار

چنگاری ابھی بھی ہے

ڈاکٹر مست رام کپور
کا بھی بائیکاٹ کر دینا چاہیے۔ اگر سونے کو ٹھکرا دیا جائے تو روپے پیسے کے اوپری ڈھانچے کا تہہ و بالا ہونا لازمی ہے۔ شری جینندر کمار نے اپنی بیٹی کی شادی کی مثال پیش کی۔ پنڈت رام دھن جو شادی کی رسومات ادا کر رہے تھے۔ ان کو انہوں نے کہا کہ وہ کسی دھات کو رسومات میں لے آنے کی اجازت نہ دیں۔ رسومات پوری ہو چکیں تو دلہن کے سسرال والوں نے اپنے حقوق اختیار کر لیے اور دلہن کو گہنوں سے لاد دیا جس سے جینندر کمار ہکا بکا رہ گئے۔

عورت اروشی، رنبھا، مہارانی لکشمی ہی نہیں اس کی شخصیت کا اہم ترین پہلو اس کا وہ وراٹ روپ ہے جسے ماں کہتے ہیں۔ ماں یعنی ایثار و محبت کی دیوی۔ بقول گاندھی جی۔

"عورت اہنسا کی دیوی ہوتی ہے۔ اہنسا کا مطلب ہے بے انتہا محبت، اور محبت سے مراد ہے مصائب برداشت کرنے کی بے انتہا صلاحیت عورت انسان کی ماں ہے ایسی صلاحیت ماں کے علاوہ دوسرے کسی رشتے میں ممکن نہیں۔"

ڈاکٹر قمر رئیس

پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی

احمد فراز

اور اُن کی نظمیہ شاعری

لکھنؤ کی طالب علمی کے دور میں مجھے گاہے گاہے مجاز کی محفلوں میں شریک ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس وقت میں کیا میری عمر کے سارے لڑکے لڑکیاں مجاز کی شاعری اور اس سے زیادہ ان کی شانِ محبوبی کے دلدادہ تھے۔ ان کی بے نیازی، لاابالی طبیعت، آوارگی، بے پناہ ذہانت، بذلہ سنجی، فقرہ بازی اور مے نوازی ایسی صفات تھیں جن کی عجیب و غریب ترکیب سے مجاز کی شخصیت کے گرد ایک طلسمی ہالہ سا بن گیا تھا۔ ان کے شعری لہجہ کے بانکپن کے علاوہ شعر خوانی کا ان کا ایک اپنا منفرد اسلوب تھا۔ اس وقت یہ یقین سا ہوگیا تھا کہ ایسے سحر آفریں کردار کا شخص اردو شاعری میں دوسرا نہیں ہے۔ لیکن ۱۹۶۶ء میں جب فیضؔ صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور ان کی شاعری کے پیچھے چھپے ہوئے شخص نے آہستہ آہستہ مگر بے محابا طور پر اپنے کرشماتی وجود کو کھولنا شروع کیا تو یوں لگا جیسے فیضؔ مجاز مرحوم ہی کا ایک نسبتاً سنبھلا ہوا اور متحرک روپ ہوں۔ مجازؔ کے بعد فیضؔ صاحب اردو کے دوسرے شاعر تھے جن کی شاعری اور شخصیت دونوں کا میں گرویدہ ہوگیا۔ اور پھر موجودہ دہے میں دہلی، لکھنؤ، لندن اور کناڈا کے کئی شہروں میں احمد فراز کو ذرا پاس سے دیکھنے کا موقع ملا تو محسوس ہوا جیسے مجازؔ اور فیضؔ کی سیرتیں ایک ہی وجود میں ہم آغوش ہوکر دو آتشہ ہوگئی ہوں۔ مجازؔ اور فیضؔ کی شائستہ کم سخنی اکثر ان کی ذہانت اور فطانت کے برجستہ اظہار میں مانع ہوتی تھی۔ احمد فرازؔ کی روانیِ طبع نہ صرف اس پردہ کو برداشت نہیں کرتی بلکہ اس میں شوخی کے انوکھے رنگ بھی بھر دیتی ہے۔ اس کی صرف ایک مثال پیش کروں گا۔

دہلی میں سفارت خانہ کی ایک بے تکلف محفل میں اردو کے بزرگ شاعر آنند نرائن ملاؔ بھی شریک تھے۔ ہم سب کے انتہائی اصرار کے باوجود وہ آب نشاط انگیز سے پرہیز کر رہے تھے۔ احمد فرازؔ نے

اپنے مخصوص شگفتہ اور برجستہ انداز میں فقرہ کسا :

"مُلّا صاحب! کم سے کم اپنے تخلّص کی تو لاج رکھ لیجئے!"

یہ سنتے ہی ملا صاحب نے سپر ڈال دی اور پیالہ اٹھالیا۔

مجاز اور فیض کی مے گساری، حسن پرستی اور عاشقی کے کتنے ہی قصے زبان زد عام ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ احمد فراز اس میدان میں ان دونوں سے بازی لے گئے۔ فراز کی انانیت بھی ان سے زیادہ توانا اور متحرک ہے۔ البتہ ان کی ہوشیاری میں اگر مستی اور عاجزی تھی تو فراز کی مستی میں ہوشیاری اور خود نگہداری کا انداز غالب رہتا ہے۔ شاید یہ پیڑھیوں کا فرق بھی ہے۔

میرا مقصد موازنہ نہیں ہے ورنہ ان تینوں باکمال شاعروں کی شخصیتوں میں بہت سے دوسرے عناصر بھی مشترک ہیں۔ اور سب سے بڑا اشتراک ان کے رومانی تخیل کے ارضی، انسانی اور انقلابی پہلو ہیں جو ان کی ہمہ گیر مقبولیت کا سبب ہوئے۔

آزادی کے کوئی دس سال بعد جن دو پاکستانی شاعروں کی آوازوں نے اچانک چونکایا اور جن کی ضرب سے اردو شاعری کا جمود ٹوٹا وہ 'چاند نگر' کے ابن انشا اور احمد فراز کی آوازیں تھیں۔ نوعمر قارئین کا ایک بڑا حلقہ ان کا گرویدہ ہوگیا۔ ابن انشا رنگِ میر میں کچھ غزلیں کہنے کے باوجود بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ ان کی نظموں میں لہجہ کا دھیما پن مترنم بحروں کا آہنگ، خود کلامی کا انداز اور ڈرامائی تاثر آفرینی ایسے عناصر تھے جو دلوں کو چھوتے تھے۔ پھر ان کی فکری وسعت جو ساری انسانیت پر محیط تھی (افسوس کہ بعد میں ابن انشا ایک کالم نگار اور سفر نامہ نگار کی حیثیت سے پہچانے گئے) احمد فراز ابتدا ہی سے نظم اور غزل دونوں کے نئے امکانات کے متلاشی تھے۔ وہ فیض اور احمد ندیم قاسمی دونوں سے بچ کر اپنے لیے ایک نئی راہ بنانے کی تگ و دو کر رہے تھے۔ انھوں نے فیضؔ کے محبوب شعری اظہارات اور نیم روشن، رواں دواں پیکروں سے محفوظ رہنے کے باوجود فیض کے لہجہ کے بانکپن سے استفادہ کیا اور احمد ندیم قاسمی کے سادہ و شفاف اظہار اور صداقت شعاری سے فیض اٹھا کر اپنے لیے ایک منفرد شعری آہنگ کی طرح ڈالی۔ یہ شعری آہنگ آٹھویں دہے کے آخر تک ایک مانوس اور شیریں آواز کی شکل میں پہچانا جانے لگا۔

احمد فراز کی آگہی اور ذہانت اپنے عہد کے نت نئے تقاضوں سے پوری طرح باخبر رہی ہے۔ انھوں نے ظلم و جبر اور استحصال کی سفاک طاقتوں کے مقابلے میں اپنے وطن کے اور ساری دنیا کے دبے کچلے انسانوں کی طرف داری کا عہد کیا ہے اور اس ستم کیش کو جد میں مجاہدانہ بانکپن سے آگے بڑھتے

ہوئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ قیدِ تنہائی کے اذیت ناک دن بھی گزارے اور فیض کی طرح جبری ہجرت اور آوارگی کے ایام بھی بسر کیے۔ عہدِ اسیری ہی کی ایک نظم میں وہ ندیم کی زبانی اپنے آپ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فرازؔ ہم تم تو وہ ہیں

جن کے نصیب میں زندگی کی ساری اذیتیں ہیں

کہ جس مسافت پہ ہم چلے ہیں

وہ حرفِ حق کی مجاہدت ہے

ہمیں نہ حرصِ حشم نہ مال و منال کی آرزو رہی ہے

نہ ہم کو طبل و علم نہ جاہ و جلال کی جستجو رہی ہے

بس اک قلم ہے کہ جس کی ناموس

ہم فقیروں کا کل اثاثہ ہے۔ آبرو ہے

بس ایک سچ ہے

کہ جس کی حرمت کی آگہی سے

مرے بدن میں ترے بدن میں

مرے قلم میں، ترے قلم میں

وہی لہو ہے

کہ جس سے عرفان کی نمو ہے

کہ جس سے انسان کی آبرو ہے

قلم کی ناموس اور انسان کی حرمت کا تحفظ ہی احمد فراز کی شاعری کا دستور العمل رہا ہے۔ لیکن اپنے شعری لہجہ کے امتیازات کو پانے کے لیے انھیں بڑی ریاضت کرنا پڑی ہے۔ غزل ہو یا نظم شعری پیکروں کی نرمی اور سبک روی ان کے یہاں تازگی اور تاثر کی ایک نئی فضا پیدا کرتی ہے اور اس لطیف گھنی فضا میں قاری شاعر کے تجربوں میں، اس کی یادوں، دکھوں، آرزومندیوں اور محرومیوں میں اپنے آپ کو پوری طرح شریک پاتا ہے۔ ''بن باس'' میں وطن اور ابنائے وطن سے جبری جدائی کا داغ لو دینے لگتا ہے جب شاعر واپس آتا ہے اور پہرہ داروں سے شہر میں داخل ہونے کی استدعا کرتا ہے۔

مجھ کو شہر میں

میرے شہر میں جانے دو

لیکن تنے ہوئے نیزوں نے

میرے جسم کو یوں برمایا

میرے ساز کو یوں ریزایا

میرا ھمکتا خون اور میرے سسکتے نغمے

شہ دروازے کی دھلیز سے

رستے رستے

شہر کے اندر جا پہنچے ہیں

اور میں اپنے جسم کا ملبہ

ساز کا لاشہ

اپنے شہر کے شہ دروازے

کی دھلیز پر چھوڑ کے

پھر انجانے شہروں کی شہراہوں پر

مجبور سفر ہوں

جن کو تج کر گھر آیا تھا

جن کو تج کر گھر آیا تھا

اس سلسلہ کی دوسری نظموں 'اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں' یا 'قاصد کبوتر' میں بھی درد و کرب کی ایسی ہی دھیمی دھیمی لہریں قاری کے وجود میں ارتعاش پیدا کرتی ہیں۔ لیکن یہ کرب "ایک بدنما صبح کی نظموں" میں احتجاج کی ایک طویل چیخ بن جاتا ہے۔

جم گیا ہے آنکھوں میں ایک بدنما منظر

اب تو سب کے سب چہرے قاتلوں سے لگتے ہیں

لیکن احمد فراز کی نظموں کا موضوع صرف سیاسی آشوب و ابتلا نہیں ہے۔ غزلوں کی طرح ان کی نظموں کی داخلی فضا میں بھی بڑا تنوع ہے۔ بعض مختصر نظموں میں محزونی کا احساس نشتر کی طرح چمک اٹھتا ہے۔ مثال کے طور پر گئی رات۔ تخلیق اور آئینہ جیسی نظمیں۔

'نایافت' کی نظموں میں "روزنا جرمن نژاد" اور "کشن بی بی" ایسی تخلیقات ہیں جن میں ایک طرف شاعر کے رومانی احساس کی تزئین کاری ہے تو دوسری جانب عورت کے تئیں اس کے حقیقت پسندانہ، جدلیاتی تصور کی تعمیر نمایاں ہو جاتی ہے۔ روزنا جرمن حسینہ جو اپنے وطن سے ہزاروں میل دور تنہائی اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ تجسس کا جذبہ ہی اس کائنات میں اس کا ہم سفر ہے۔

روزنا، جرمن نژاد

اور اس کا دل زخموں سے چور

اپنے ہمدردوں سے، ہمسایوں سے دور

گھر کی دیواریں نہ دیواروں کے سایوں کا سرور

جنگ کے آتش کدے کا رزق کب سے بن چکا

ہر آہنی بازو کا خوں

ہر چاند سے چہرے کا نور

وادیٔ کافرستان کی کافر دوشیزہ کشن بی بی بھی قدرت کے بے کراں حسن کا مجسمہ بن کر سامنے آتی ہے اس کا وجد آفریں رقص اور نغمہ عورت کے تخلیقی وفور اور نسوانی وقار کی علامت بن جاتا ہے۔

سحر دم

جب پرندوں کے چہکنے کی صدا آئی

کشن بی بی

سیہ ملبوس میں لپٹی

جبیں پر کوڑیوں کا تاج

گالوں پر گھنی زلفیں

کنیزوں کی طرح اپنی رفیقوں کے لیے

رخصت ہوئی ہم سے

بصد انداز استغنا و دارائی

تو ہم سارے تماشائی تھے پتھر

اور پتھر تھے تماشائی

'میرے خواب ریزہ ریزہ' کی طویل تمثیلی نظموں میں عورت کا وجود ہی مرکزی کردار ہے۔ وہ حسن

کا افسوس ہی نہیں، امن، آشتی اور تخلیقی جولانی کی تابندہ علامت بھی ہے۔ وہ اس کائنات میں محبت اور ایثار کا لازوال سرچشمہ ہے۔ 'آخری شب کے ہم سفر' میں عورت جنگ کی تباہ کاریوں کے ایک آسیب زدہ گوشہ ہیں، جہاں وہ اپنے شوہر کی لاش تلاش کرنے آئی ہے۔ دشمن سپاہی سے کہتی ہے:

اگر تو نہیں تو کوئی تیرا ہم جنس ہوگا

کہ قاتل تو سب ایک ہیں

ایک سے ہیں

مجھے اس سے کیا

کس کے خنجر سے گھائل ہوئی ہوں

مجھے اس سے کیا

کس کی مشعل کے شعلے نے میرا جہان پھونک ڈالا

وہ خنجر تیرا ہو کہ تیرے رفیقوں کا ہو

میں تو گھائل ہوئی

آگ تو نے لگائی ہو یا تیرے ہمراہیوں نے

میرا تو آشیاں جلا

یہی عورت تمثیل کے آخر میں جب دشمن سپاہی پر مصیبت آتی ہے تو اسے بچانے کے لیے مثالی قربانی دیتی ہے اور اپنے محبوب شوہر کی لاش اس کے حوالے کر دیتی ہے:۔

ان نظموں کے مکالمے تخلیقی اظہار اور محاکاتی منظر کشی کی توانائی سے معمور ہیں۔ ان کے ذریعہ شاعر عمل اور تجسس کی کیفیت بھی ابھارتا ہے اور تصادم اور کشمکش بھی پیدا کرتا ہے 'موم کے پتھر' جس کا موضوع ایک فنکار فریدوں اور عالیہ کی جانگداز محبت ہے۔ عورت کے جذبۂ ایثار کی معراج دکھاتی ہے۔ اس نظم کا یہ مکالمہ دیکھیے:۔

مگر تم اس شہر کو لوٹ جانے کو کہتے ہو بابا

جہاں سے مجھے

عالیہ   اسی سکوں بخش بستی میں لائی تھی

تاکہ میرا فن

جو شہروں کی مسموم تہذیب

مصنوعی تابندگی

اور بیمار اقدار کی مجلسوں میں

مقیّد تھا

آزاد ہو کر

نئی زندگی سے لہو لے

نئی زندگی جو پہاڑوں کی صورت

توانا ہے

چشموں کی صورت رواں ہے

چناروں کی مانند

آتش بجاں ہے

اسے میرے فن سے مری شاعری سے

پرستش کی حد تک محبت تھی ۔ بابا !

اسی نظم میں فریدوں فلسفۂ غم پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتا ہے :

عجب بات ہے عالیہ

ہم بظاہر جسے دکھ سمجھتے ہیں جاں کا زیاں جانتے ہیں

اسی دکھ کی شدت

ہمارے شب و روز کے آئینوں کو جلا بخشتی ہے

یہی دکھ اگر جسم کا جز و ہو

تو نتیجہ فنا ہے

مگر روح میں رچ سکے تو

اسی پیکرِ آب و گل کو پیمبر بنا دے

امٹ بیکراں جاوداں

اس نظم میں عالیہ اپنے ابو کے لیے ایثار کی آگ میں جل جاتی ہے اور فریدوں سے جدا ہو جاتی ہے

'ساحل کی ریت'، وجودی احساس و فکر کی نظم ہے ۔ آج کے پُر آشوب حالات نے حساس انسانوں

کو کتنا تنہا بنا دیا ہے ۔ وہ کیسی اذیت ناک بے گانگی کے عالم میں زندگی بسر کرتے ہیں ۔ وہ اپنے داخلی عمل

میں ایجاب و انحراف کے کیسے صبر آزما مرحلوں سے گزرتے ہیں۔ احمد فراز نے اس نظم میں اسی کیفیت کو اس کی پوری شدت اور شدت داری سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وجودیوں کے نزدیک انسانوں کے درمیان حقیقی رشتہ وہ ہے جو ریاکاری، بے اعتباری اور حرص و طمع کی بندشوں سے آزاد ہو۔ روحانی قربت کا یہی رشتہ۔ خواہ اس کی میعاد کتنی ہی ہو۔ حقیقی روحانی قربت کا رشتہ ہوتا ہے۔ سلیمان اور نبیلا کے درمیان یہی عظیم رشتہ پروان چڑھتا ہے اور پھر وقت کی ریت میں فنا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں بھی شاعر تنہائی کے مارے سلیمان کو مانجھیوں کی زبانی بے گانگی کے بجائے سماجی ارتباط کا پیغام دیتا ہے:

جیون اک طوفانی ساگر ہردم موج کے ریلے

تنہائی کا سفر کڑا ہے ساتھ کسی کو لے لے

کس نے اکیلے صدمے جھیلے کون ہوا ہے پار

اے مانجھی ہشیار

احمد فراز نے حریت پسند افریقی شاعروں کی نظموں کا جو ترجمہ "سب آوازیں میری ہیں" کے نام سے شائع کیا ہے ان میں خود فراز کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ یہ نظمیں احمد فراز کی نظموں کی طرح اس زمین پر انسان کی تذلیل اور غلامی کے خلاف احتجاج کرتی ہیں۔ احمد فراز کی نظمیں آج کی مجروح انسانیت کا ایسا جانفزا نغمہ ہیں جو آرزوؤں، امیدوں اور حوصلوں سے معمور ہے۔

محمد یوسف مینگ

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی شخصیت

ابوالکلام آزاد پر بات کرتے ہوئے ان کی گہری علمیت سب سے پہلے سامنے آجاتی ہے۔ اور اس کے مرعوب کن سائے میں ابوالکلام کی ادبی شخصیت کچھ دب کر رہ جاتی ہے۔ ادب علم سے کیفیتاً الگ شے ہے اور اس کا سلسلۂ نسب سائنس سے ملتا ہے۔ اس میں لکھنے والے کے باطن کی زبان تاک جھانک ایک عیب بن جاتی ہے۔ لیکن ادب اس کے برعکس انسانی شخصیت کے اس ظلمات سے آب و تاب حاصل کرتا ہے جہاں خون کے ذروں میں ایٹمی دھماکوں کے انار چھوٹتے ہیں اور خون کی شیریانوں میں کئی کہکشانوں کے ستارے چمکتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد کے یہاں اگر ادیب، عالم کی اوٹ میں کھڑا ہونے پر مصر ہے تو اس کی وجوہات کا سمجھنا دشوار نہیں ہے۔ ان کا خاندانی اور ذاتی تقدس اور ان کی سیاسی وجاہت و نزاکت نے پہلے تو خود انہیں اور پھر ان کے عقیدتمندوں کو یہ پردے گرانے پر مائل کر دیا۔ لیکن ان کے اندر چھپے ہوئے ادیب نے بار ہا ان کی اجازت کے بغیر بے اختیارانہ طور پر اپنا وجود ظاہر کیا ہے۔ ان کی ادبی شخصیت کو اجاگر کرنا ہو تو ان کے ادبی مزاج کی پرتیں کھولنے میں کوئی چارہ نہیں رہتا۔

ابوالکلام کا تذکرہ یوں تو ان کے بزرگوں کے حوالے سے چند پاک نہاد اسلامی مجاہدین کی سرگذشت ہے۔ لیکن اپنے آخری اوراق میں ایک شدید قسم کی جذباتی آپ بیتی بن جاتا ہے۔ اس حصے میں ابوالکلام تذکرے اور تواریخ کی تفصیلات سے اپنے قلم کو جھاڑ کر ایک ادبی پیرایہ اختیار کرتے ہیں اور یہی اس بہت ہی عجیب و غریب کتاب کا نقطۂ عروج ہے۔ جس کی صنف بھی ابھی تک متقرر نہیں کی جا سکی ہے۔ محمد مجیب کے مطابق یہ جذبے کی آندھی اور آگ ہے۔ یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جو ایک خیال (IDEA) بنتی ہے۔ پھر یہ خیال اپنی شکل تبدیل کر کے گوشت و خون کا پیکر دھار لیتا ہے۔

ابوالکلام نے اس میں اپنے شباب کے کچھ ایسے معاملات و مشاغل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو انہیں فرشتوں اور دیوتاؤں کے عرش سے ہم مٹی کے انسانوں کے فرش پر لے آتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے قلم کو احتیاط کی لگام میں بہت سختی سے تھام رکھا ہے۔ لیکن جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ابوالکلام کا ادبی خمیر کس طرح ان کی جوانی کی گل گشتوں میں پلا بڑھا اس کا اندازہ کرنے کے لئے اس اقتباس کو ذہن میں رکھئے۔

"جنونِ شباب نے ہاتھ پکڑا اور ولولوں اور ہوس کے تقاضوں نے جو راہ دکھائی۔ دل کی خود فروشیوں نے اسی کو منزلِ مقصود سمجھا ۔۔۔ جس طرف نظر اٹھائی ایک صنم آبادِ الفت و پرستش نظر آیا"

ابوالکلام کے اشاروں کی چلمن سے کسی عورت کا آنچل، رخسار یا پیراہن ایک کوندے کی طرح لپکتا ہے۔ لیکن اس کے رنگوں کی شناخت بقول قاضی عبدالغفار بہت مشکل مرحلے پیش کرتی ہے اور ہر محراب کے نیچے اور ہر منبر کے اوپر ایک شدید زلزلہ آجانے اور قدامت کے قلعوں میں بے پناہ شعلے بھڑکنے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ لیکن ابوالکلام حسن شناسی کا کیسا ذوق رکھتے تھے۔ وہ انہوں نے اس بیان کے کوئی پچیس برس بعد غبار خاطر میں کسی اور پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ وہ موسیقی کے باب میں اورنگ زیب کی خشک مزاجی کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن ایک جھٹکے کے ساتھ بات اس کی جوانی کی لغزشوں اور لرزشوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ اورنگ زیب برہان پور کے باغ آہو خانہ میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ ایک دلربا و رعنا خواص زین آبادی اپنی ہمجولیوں کے ساتھ آئی۔ بے باکانہ اچھلی اور آم کے درخت کی اونچی شاخ سے پھل توڑ لیا۔ اورنگ زیب کے میزبان خان زماں کی بیوی، جو اس کی خالہ تھی۔ پر یہ شوخی گراں گذری۔ اس نے ملامت کی تو زین آبادی نے ایک نگاہِ غلط انداز شہزادہ پر ڈالی۔ اور پشواز سنبھالتے ہوئے آگے نکل گئی۔ بقول ابوالکلام "یہ ایک غلط اندازِ نظر کچھ ایسی قیامت تھی کہ اس نے شہزادہ کا کام تمام کر دیا" ابوالکلام نے بعد میں اورنگ زیب کے اس رقصِ بسمل کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے اور اس پر یہ تبصرہ کیا ہے۔

"اورنگ زیب کے اس معاشقہ کی داستان بڑی ہی دلچسپ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اولعزمیوں کی طلب نے اُسے لوہے اور پتھر کا

بنا دیا تھا۔ لیکن ایک زمانے میں گوشت و پوست کا آدمی بھی رہ چکا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ

ع "گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی"

اس بیان سے ابوالکلام آزاد کے کسی معاشقے کی صحافتی تفصیل تیار نہیں ہوسکتی لیکن تذکرہ کی ہوس کاریوں کے الفاظ کو اگر رنگوں کے پردوں میں اتارنا ہو تو اس 'حدیث دیگراں' میں آپ بیتی کے بہت سے نقوش روشن ہوں گے۔

"تذکرہ' کی اس غیر فانی تصویر کی کچھ اور پرتیں 'غبارِ خاطر' میں کہیں نیم وا اور کہیں صفائی کے ساتھ کھلی ہیں۔ چوڑیوں کی جھنکار اور پائل کی چھم چھم کا رسیا سنگیت کے سُر ساگر سے بھی ایک سیدھا ربط رکھتا ہے۔ ابوالکلام موسیقی کے رمز شناس اور مشتاق ہی نہیں بلکہ اس کے اسیر بھی تھے' اور اپنے دردِ وحشت کو یاد کرتے ہوئے وہ 'غبار خاطر' میں لکھتے ہیں۔

"اسی زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ آگرہ کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اپریل کا مہینہ تھا اور چاندنی کی ڈھلتی راتیں۔ جب رات کی پچھلی پہر شروع ہونے کو ہوتی۔ تو چاند پردہ شب ہٹا کر یکایک جھانکنے لگتا۔ میں رات کو ستار لے کر تاج چلا جاتا۔ اور اس کی چھت پر جمنا کے رخ بیٹھ جاتا۔ پھر جونہی چاندنی پھیلنے لگتی۔ ستار پر کوئی گیت چھیڑنے لگتا۔ اور اس میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریبِ تخیل کے کیسے کیسے جلوے اپنی آنکھوں کے سامنے گذر چکے ہیں ...... رات کا سناٹا' ستاروں کی چھاؤں' ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ بُرجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے دُھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس وحرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اُوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے ..... بارہا تاج کی بُرجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں اور کتنی ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ ستارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ رُوک سکے آپ باور کریں یا نہ کریں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے بُرجیوں سے باتیں

بھی کی ہیں!"

ابوالکلام اس ذہنی اور جذباتی پس منظر کے ساتھ اُردو ادب میں ایک آندھی کی طرح آئے۔ ان کے اس مزاج کا سب سے عمدہ مظاہرہ ان کی تحریروں میں اشعار کا استعمال ہے۔ فارسی اور اُردو ادب میں عبارت کو برمحل اشعار سے سجانا ایک پارینہ اور طاقتور روایت رہی ہے۔ لیکن ابوالکلام نے اسے جتنے بڑے پیمانے پر اور جس نفاست و لطافت کے ساتھ برتا۔ اس کی نظیر ان زبانوں میں کبھی نہیں ملتی۔ اس سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے اس کو ایک تخلیقی فن کا درجہ دیا۔ ان کے اشعار کے استعمال کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ معنی اور مطلب کی توسیع یا تغیر اور کئی حالتوں میں تاویل کرتے ہیں۔ علی سردار جعفری نے لکھا ہے کہ دراصل ان کی عبارتیں بیشتر انہی اشعار سے مستعار ہوتی ہیں۔ لیکن یہ ابوالکلام کے خاص فن کا بڑا سرسری مطالعہ ہے۔ ابوالکلام نے دین اور دنیا کے کتنے ہی معاملات میں اپنے آپ کو الجھا دیا تھا۔ لیکن اپنی تحریروں میں اُن کے اندر کا ادیب ان گورکھ دھندوں کو ذرا سا موقع ملتے ہی ٹال دیتا ہے۔ اور کسی خوبصورت رومانی شعر کے دھنک کو اپنی عینک بنا لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی شوخ مگر جکڑی ہوئی حسینہ نگہبانوں کی آنکھ بچا کر اپنے عاشق سے آنکھوں ہی آنکھوں میں انس و الفت کا وائرلیس پیغام دے اور لے لیتی ہے۔ اس بات کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے کہ ابوالکلام نے اپنی سنجیدہ سے سنجیدہ تحریروں میں جن اشعار کو والہانہ شیفتگی سے برتا ہے۔ ان میں فلسفہ، حکمت، معرفت، تصوف اور تفکر سے زیادہ مست عاشقانہ اشعار کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ابوالکلام اشعار اپنے حافظے کے قلزم سے تقریباً فی البدیہہ چنتے تھے۔ یہ اشعار انہوں نے اپنے لڑکپن اور آغاز شباب میں پڑھے تھے۔ ان کی رنگین پھلجھڑیاں ان کے ذہن میں چھوٹتی رہتی تھیں اور ان کے باطنی نگار خانے کو آراستہ کرتی رہتی تھیں۔ لیکن عبارت کے توسط سے ان کے ذہن میں ان کا دھنک مارگ روشن ہو جاتا تھا اور وہ ایک اعلیٰ تخلیقی فنکار کی طرح انتہائی ذہانت و ذکاوت سے ان کا برجستہ استعمال کر کے نہ صرف اپنے مطلب کو پر عطا کرتے تھے بلکہ اپنے اندر کے ادیب کو اظہار کا اذن بھی بخشتے تھے۔ انہوں نے جس سلیقے فنکاری اور کثرت

سے اشعار کا استعمال کیا ہے۔ وہ انہیں نہ صرف اس پیرائے میں اس وقت تک اردو کا سب سے اعلیٰ ادیب بناتا ہے بلکہ یوں لگتا ہے کہ مستقبل میں بھی ان کے اس خاص مقام کو شاید کوئی ماند کر سکے۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ صرف ایک عالم اور ایک صحافی یہ کارنامہ انجام نہیں دے سکتا تھا۔ یہ ان کی ادبی شخصیت کا ایسا اظہارِ ثبوت اور شناخت منواتا ہے کہ شاید ان کا کوئی اور تحریری کارنامہ ایسا نہیں کرتا۔

ان اشعار کے چراغاں کا مفصل نظارہ کرنے کے لئے تو بہر حال ان کی تحریرات کا آسمان ہی اصل دیدگاہ ہے۔ لیکن چند مقامات پر نظر ڈالنے سے واضح کیا جا سکتا ہے کہ وہ کیسے کھلی دھوپ کے تمازت خیز منظر کو ابر بہار کی شگفتگی اور خوبصورتی عطا کرتے ہیں۔

تذکرہ کی طوفان خیز اٹھان ہے۔ عالموں اور زاہدوں کی نفس پرستیوں، باطل نوازیوں اور بداعمالیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس معاملے کو واضح کرنے کے لئے تواریخی مقامات کے فانوس روشن کر کے ایک خاص ذہنی منظر تیار کیا گیا ہے۔

ابوالکلام ایک آہِ سرد بھر کر کفِ افسوس ملتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد کے جملے کے ساتھ ایک دلنواز شعر کی بجلی چمکتی ہے اور زہد و اتقا کے لق و دق صحرا میں رنگ کی بوچھاڑ کوئی دوسرا ہی منظر ابھارتی ہے۔

" افسوس ہر عہد اور دور میں جس قدر بربادیاں ہوئیں۔ علماء سُو کے ہاتھوں ہی ہوئیں۔ وقت اور زمانے کی شکایت بے سُود ہے۔ ؎

" تا کے ملامتِ مژہٗ اشک بارِ من
یک بار ہم نصیحتِ چشم سیاہ خویش "

اِس سے بدرجہا بہتر مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اور ان کی تعداد سینکڑوں میں ہو سکتی ہے۔ اصل میں ابوالکلام کے یہاں شعر کا استعمال روایت کی پاسداری نہیں ہے۔ بلکہ ایک ادبی پینترے (Werery Device) کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسے غالبؔ کے اس شعر سے بھی زیادہ شاعرانہ منطق کی حیثیت میں تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ ؎

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

ابوالکلام کے بہت سے ملنے والوں جن میں جواہر لال نہرو اور استاد نفیس جیسے لوگ شامل ہیں، نے ان کی شاعرانہ حسیت (POETIC SENSIBILITY) کا بار بار ذکر کیا ہے اور اس حسیت کا سب سے بڑا بہتر اظہار ان کے اشعار کے استعمال میں نظر آتا ہے۔ ان کا یہ استعمال اتنا تخلیقی ہے ان کے بہت سے اشعار صرف اس وجہ سے زندہ رہیں گے کیونکہ ان کو ابوالکلام نے چھوا اور ان کے شیشوں میں رنگوں کی ایسی کرنیں جھلملا دیں کہ جب تک وہ ان کی عبارت میں ٹنگے رہتے ہیں۔ وہ کرنیں بکھیرتے ہیں لیکن ان سے الگ ہو کر خالی کنکر بن جاتے ہیں۔

ابوالکلام کی شخصیت ایک الگ تھلگ (ARISTOCRAT) کی شخصیت بنی رہی اور ان کا ادب بھی ایک خاص سطح کا ادب بنا رہا ہے۔ محمد اجمل خان نے اسے اُردو میں فرانس کے ادبیات عالیہ سے متصل سب سے قدیم چیز قرار دیا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ یہ اُردو کے بڑے دھارے سے کچھ اوپر اوپر ہی رہتا ہے۔ محمد حسین عسکری نے جب کہا تھا کہ وہ اپنے سے کم تر درجے کے آدمیوں کی تحقیر کر کے دراصل ایک قسم کے ذہنی (APARTHEID) کا ارتکاب کرتے ہیں تو وہ موٹے لفظوں میں ابوالکلام کے اس طبعی رجحان کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ جس اقتباس پر عسکری نے اعتراض کیا ہے۔ اس میں عبداللہ سے دراصل ان کا خادم مراد ہے جو سفر میں ان کو چائے بنا کر دیتا تھا۔ ابوالکلام کو افسوس ہوتا ہے کہ جو باد نسیم سحری ان کو سحر خیزی کا عرفان عطا کرتی ہے۔ وہی عبداللہ کی نیند کو کیوں زیادہ بوجھل بنا دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ عسکری حسیت کی لطافت کو انسانوں کی طبقہ وارانہ تقسیم سے خلط ملط کرتے ہیں۔ دنیا میں گلاب کے بدلے گل قند کو پسند کرنے والے لوگوں کی کمی نہیں رہی ہے لیکن ذوق کی (ARISTOCRACY) بہر حال ان فارمولاں میں مذموم نہیں کہی جا سکتی۔ یہ خالصتاً روحانی ہے اور اس کی تخصیص ہر عہد اور ہر سماج میں ملے گی۔

"غبارِ خاطر" ابوالکلام کی آخری باقاعدہ تصنیف ہے۔ لیکن اس میں ان کی ادبی شدت پسندی پر ان کی ادبی مصالحت پسندی غالب آگئی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ

نے اس پر بڑا زوردار حملہ کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اس میں ابوالکلام کا قلم بیمار اور ضعیف معلوم ہوتا ہے یہ جوان ابوالکلام کی تصنیف نہیں کہن سالہ ابوالکلام کی تصنیف ہے۔ بمبئی میں ایک مرتبہ کانگرس نے جب امتناع مسکرات کی مہم جاری کی تو بہت سے مے فروشوں نے شربت اور سوڈا واٹر کا کام شروع کر دیا تھا۔ غبار خاطر میں بھی ابوالکلام کی عظمت اسی طرح گھٹی ہوئی ہے"!

سید عبداللہ کا اصل اعتراض یہ ہے کہ "غبار خاطر" میں ابوالکلام نے غیر آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش پر عمل کیا ہے۔ یہ ابوالکلام کی اصل فطرت کے خلاف ہے اس میں شک نہیں کہ 'غبار خاطر' کی عبارت میں وہ زجز اور رزم' وہ زور اور جوش موجو نہیں جس کو دیکھتے ہوئے خواجہ احمد فاروقی نے لکھا تھا۔

"فقروں میں مسلح اور خوش ترتیب فوج کا سا جلال اور شکوہ ہے۔ الفاظ میں نقارہ و ڈھول کا شور و ہنگامہ ہے۔ جملوں میں آتش خانوں کی سی گرمی ہے۔ جس نے مصلحتوں کی برف کو پگھلا دیا۔"

'غبار خاطر' ایک سنبھلے ہوئے ذہن اور ایک وقار پسند قلم کا نغمہ ہے۔ ابوالکلام نے جب غبار خاطر لکھی تو ان کی شریانوں میں لہو کی طغیانی اترنے لگی تھی۔ لیکن اس کتاب میں بھی گاہ گاہ کی تقریروں کے باوصف ابوالکلام کے ادبی مزاج اور میلان کے کتنے ہی خیابان نظر آتے ہیں۔ اس میں تو وہ خط جس میں انہوں نے اپنی رفیقہ حیات زلیخا بیگم کی وفات کا ماجرا بیان کیا ہے۔ ان کے ضبط آمیز ادبی اظہار کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ اس میں ظاہری اور باطنی سطح پر ان کے کیفیات کے درمیان ایک عجیب کھینچا تانی ملتی ہے۔ جو ان کے اسلوب کو بہت دلاویز بنا دیتی ہے۔ ان کا دل جذبات کے سمندر میں ہچکولے کھا رہا ہے۔ مگر ان کے قلم پر ان کے ظاہری ضبط اور شخصی احتساب کا بھاری پتھر موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے بظاہر جذبات سے عاری جملے قاری کے دل میں پیوست ہو جاتے ہیں اور اس طرح سے جذباتی رقت سے معرا اسلوب کے باوجود وہ قاری کو بھی اس گہرے حزن کی کی کیفیت میں شریک کر لیتے ہیں۔ جو ان کے دل کو آتش خانہ بنائے ہوئے تھا۔ 'غبار خاطر' میں ابوالکلام نے اپنی عادت کے برعکس فطرت اور اس کے جلوؤں پر بھی

مشتاقانہ نظر ڈالی ہے۔ ہم ان کو میلکم میکڈانلڈ کی طرح طیور شناس (ORNITHOLOGIST) تو نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اقتباسات میں ایک شاعر اور تخلیق کار ادیب کا ذوقِ جمال پوری طرح سے جھلکتا اور چھلکتا ہے۔

"بعض قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو۔ جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو۔ جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جہاں تاب رہتی ہوں جہاں ہر روز دوپہر چمکے، شفق ہر روز نکھرے۔ پرند ہر صبح و شام چہکیں اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے کیوں خالی سمجھ لیا جائے؟"

اور سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ 'غبارِ خاطر' میں ابوالکلام کے شعروں کے استعمال کا قرینہ اور بھی نکھر گیا ہے۔ یہ بات سیّد عبداللہ بھی مانتے ہیں کہ یہاں اشعار کا استعمال بہترین ہے۔ لیکن اس میں کچھ اور اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ ابوالکلام کے بوڑھاپے کی کتاب ہے۔ جب انہیں یہ شعر پڑھے ہوئے چالیس پینتالیس سال کا زمانہ گذر چکا تھا۔ اب ان کے شعور کا ہی نہیں بلکہ تحت الشعور کا بھی حصّہ بن چکے تھے اور وہاں ابوالکلام کے ہی محاورے کے مطابق مور کی طرح پنکھ پھیلا کر اپنا گلستاں سجا لیتے تھے۔ زمانہ کہیں سے کہیں نکل آیا تھا۔ لیکن ابوالکلام کو اپنی کلاسیکی افتاد پر اب بھی اسرار تھا۔ اسی لئے 'غبارِ خاطر' کے عصری مطالب کو سنوار لینے کے لئے بھی انہوں نے ہم عصر شعراء کی طرف نظر نہیں اٹھائی۔ انہوں نے نہ اقبال اور نہ جوشؔ، فانیؔ اور نہ جگرؔ۔ کسی کو بھی توجہ کے قابل سمجھا۔ یہ ان کی اشرافیت یعنی (ARISTOCRACY) کا ایک بالواسطہ مگر یقینی طور پر متکبّرانہ (ARROGANT) اظہار ہو تو ہو، لیکن ان کے شعر میں پناہ ہونے کا یقینی ثبوت ہے۔ انہیں کلاسیکی شعراء کا دامن تھامتے ہوئے کسی کمی یا کوتاہی کا احساس نہیں ہوتا اور یہ ظاہر ہے کہ جو اشعار انہوں نے موقع و محل کی مناسبت سے پیوست کئے ہیں ان کی عبارت کی خود مختار سلطنت میں ان سے بہتر نعم البدل تصوّر میں نہیں آسکتے۔ یہ بات انہیں شعراء کا طفیلی نہیں بلکہ ان کے شریک   کے روپ میں پیش کرتی ہے۔

ابوالکلام کی ادبی شخصیت کو اس وقت تک آزادی کے شعلہ نوا خطیب، شمشیر بکف صحافی، عالم و فاضل مفسر اور ایک فلسفیانہ مزاج کے رہنما کی عینکیں لگا کر دیکھا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان حیثیتوں میں ان کا امتیاز بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے خطابت کو مسحور کرنے اور دل دہلا دینے کے آلۂ صوت الجہر کی طرح برتا۔ انھوں نے صحافت اور ادب کے ڈانڈے ملا دیئے۔ انہوں نے تفسیرِ قرآن میں اپنی مدلل تحریر اور روانی سے نیا لطف اور رنگ پیدا کیا ہے۔ ان کے فلسفیانہ افکار میں پُرانے حکیموں کی دانشمندی کا جوہر پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن ان کے ادب کی ایک الگ الگ صورت بہر حال موجود ہے۔ جس کو ابھی اپنی تمام و کمال خوبیوں اور امتیازات کے ساتھ نہیں پرکھا گیا ہے۔ وہ اُردو کے ایسے صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ جیسا اور کوئی نہیں ہے۔ مہدی افادی جیسے خوش قلم انشا پرواز نے ان کی تحریر پر رشک کیا۔ حسرت موہانی کو ان کی نثر کے آگے اپنی نظم بے لطف معلوم ہوئی۔ سجّاد انصاری نے لکھا کہ اُردو میں اگر قرآن نازل ہوتا تو ابوالکلام کی نثر اس کا وسیلہ ہوتی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ان کی نثر اُردو کی نثری روایت میں ایک رُومان انگیز بغاوت ہے۔ یہ اپنے رنگ کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ انہوں نے ایک جگہ نپولین کا قول بڑی شیفتگی کے ساتھ نقل کیا ہے۔ جو ان کے ادبی اسلوب کی کہانی بھی ہے۔ نپولین الما نیہ کی فتح کے بعد فریڈرک اعظم کی قبر پر گیا۔ وہاں عظیم فاتح کی تلوار لٹکتی دیکھی تو اس نے اتارنے کا حکم دیا اور کہا کہ اسے عجائب گھر میں رکھوں گا۔ ایک شریک کار نے حسرت سے کہا۔

"میں ہوتا تو ایسے عظیم فاتح کی تلوار صرف اپنے لئے رکھتا۔"

نپولین نے اس پر ایک حقارت آمیز نظر ڈالی اور کہا۔

"کیا میری اپنی تلوار نہیں ہے؟"

ابوالکلام نے بھی اپنے قلم سے کبھی تلوار کا کام لیا اور کبھی مضراب کا جس کے سینۂ ساز سے ہزاروں کنوارے نغمے نکلے اور ابھرے۔ تلوار اور مضراب کا یہ سنگم اُردو میں اتنی کامیابی کے ساتھ شاید ہی پھر کبھی پیدا ہو

کہ اب حالات کی وہ میزان ہی بدل گئی ہے۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریریں ان کی زندگی اور ادبی شخصیت اپنی ندرت اور سطوت کی وجہ سے ابھی تک اسرار کے مہیب کہرے سے پوری طرح اجاگر نہیں ہو سکیں

ابوالکلام نے اردو نثر میں رومانی وفور کا بارودی سرنگ چھپا کے اس میں زورِ بیان کا فتیلہ لگایا اور اس طرح سے اس ایوان میں جہاں کان عام طور پر گھنگھروؤں کی چھنک کو ہی آواز کا طوفان سمجھتے تھے دھماکوں کا ساز بجا دیا۔ اردو نثر میں یہ مردانہ وجاہت اور شجاعت ابوالکلام سے پہلے موجود نہ تھی۔ نظم میں اس کا نمونہ ہمیں اقبال کے یہاں ملتا ہے، اور کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ ابوالکلام اور اقبال ایک ہی وجود کے دو پہلو ہیں، اور ان کے اظہار کے پیرایے دو اصناف میں ہونے کے باوجود ایک ہی تاثیر کے حامل ہیں۔ سنسکرت میں لفظی اظہار کے نو رسوں میں اس رنگ کا نام ویر رس ہے۔ اردو میں سب سے پہلے ابوالکلام نے اسے جس کڑک کے ساتھ استعمال کیا، ان سے پہلے کسی نے نہ استعمال کیا تھا اور ان کے بعد بھی کوئی ان کے زورِ قلم کو نہیں پہنچ سکا ہے۔ ایک مختصر افسانہ میں سے، بات کی وضاحت ہو سکے گی:

> "اس اژدہے کو دیکھو جو جنوب سے منھ کھولے بڑھ رہا ہے، اس ہاتھی کو دیکھو جس کی مستک غرورِ طاقت سے جھوم رہی ہے اور جس کے دانت ہلاکت کے دو نیزوں کی طرح نکلے ہوئے ہیں، اس بھیڑیے کو دیکھو جو مشرقی یورپ کے کلب سے چیختا ہوا اٹھا ہے اور اس خونناک چیتے کو دیکھو جو لاماؤں کے اور روسیوں کی سرزمین میں خون اور گوشت کے لیے پلا ہے۔ یہ کیسے مہیب ہیں۔ یہ کیسے خوفناک آلات سے مسلح ہیں۔ ان سب کا باہم ایک دوسرے پر گرنا اور چیرنا پھاڑنا کرۂ ارض کا کیسا ہولناک بھونچال ہوگا۔ جو کبھی نہیں آیا، ایسا طوفان جو کبھی نہیں اٹھا، ایسا آتش فشاں جو کبھی بھی نہ پھٹا اور خداوند کا ایسا غصہ جو اب تک زمین پر کبھی نازل نہ ہوا۔"

اردو کے زنار خانے میں یہ للکار میدانِ جنگ کا سماں پیدا کر دیتی ہے، اور اس نوع کے ادب کا سلسلہ فارسی کے رزمیہ اور انگریزی کے ایپک سے جڑ جاتا ہے۔ یہ ابوالکلام کے ہاتھوں اردو میں ادب کے رنگ و آہنگ کی توسیع کا وہ کارنامہ ہے جس کے لیے وہ ہمیشہ اس کے رہنماؤں میں تسلیم ہوں گے۔

خالد علوی

حیات اللہ انصاری کی تنقید نگاری

اردو ادب کے متعدد افسانہ نگاروں نے تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض کی اہمیت بحیثیت تنقید نگار بھی مسلّم ہے۔ اس ضمن میں مجنوں گورکھپوری، نیاز فتحپوری، حسن عسکری، علی عباس حسینی اور انتظار حسین کے نام بلا تکلف لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان ادیبوں نے کسی خاص موضوع یا کسی خاص شخصیت کو ہدفِ تنقید نہیں بنایا، بلکہ مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی۔ بزرگ افسانہ نگار حیات اللہ انصاری کی تنقید کا اولین نمونہ "ن م راشد۔ حیات اور شاعری" کی شکل میں ملتا ہے۔ اس کتاب کے منظر عام پر آنے کے تقریباً چالیس سال بعد انصاری صاحب کی دوسری تنقیدی کتاب "جدیدیت کی سیر"، شائع ہوئی ہے۔ "جدیدیت کی سیر" میں بھی "ن م راشد۔ حیات اور شاعری"، شامل ہے۔ غالباً تنقید نگار اپنے اس کارنامے کو اہم تصوّر کرتا ہے۔ ورنہ ایک معمولی درجہ کی کتاب کو چالیس سال کے بعد دوبارہ شائع کرانا چہ معنی دارد۔ اس تنقیدی کتاب پر گفتگو سے قبل بہتر ہوگا کہ "ن م راشد۔ حیات اور شاعری" کے شانِ نزول پر روشنی ڈالی جائے۔

غلام عباس اپنے مضمون "راشد۔ چند یادیں"، میں رقمطراز ہیں کہ "راشد مزاجاً سخت گیر تھے۔ کسی سے انھیں تکلیف پہنچے تو آسانی سے معاف نہیں کرتے تھے۔ اپنے خلاف بے جا معاندانہ تنقید کی چبھن انھیں عمر بھر رہتی تھی۔ ہمارے معاصرین میں ایک افسانہ نگار تھے۔ حیات اللہ انصاری۔ انھوں نے راشد کی شاعری پر ایک تنقیدی مقالہ لکھا۔ اور دِلّی کی ایک مجلس میں پڑھا جس میں، میں بھی موجود تھا۔ تنقید شروع سے آخر تک ترقی پسند مصنّفین کا نظریہ لئے ہوئے تھی۔ کہیں کہیں راشد کی تعریف بھی کی گئی تھی مقالہ بہ حیثیت مجموعی راشد کے زیادہ خلاف نہیں تھا۔ میں نے راشد سے اس کا ذکر کیا۔ وہ

بہت جز بز ہوئے اور بغیر مقالہ پڑھے حیات اللہ انصاری کے نام ایک سخت خط انگریزی میں لکھ ڈالا۔ انصاری صاحب کو یہ خط پڑھ کر یقیناً غصہ آیا ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے مقالے میں سے تمام تعریفی جملے تو حذف کر دیئے اور اس میں بہت سے اعتراضات شامل کر کے اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔''.....

یہ امر طے شدہ ہے کہ اس مضمون میں بعض حصّے حذف کر دیئے گئے ہیں۔ محذوفہ جملوں میں راشد کی شاعری کو یقیناً پسند کیا گیا ہوگا، یا کم از کم اس کے ادبی اجتہاد پر کسی نئی صبح کی بشارت دی گئی ہوگی۔ چوں کہ یہ قطعی ناممکن ہے کہ " لہو کے پھول " اور " گھروندہ " کے فن کار کو بے حسی اس معراج پر پہنچا دے جہاں راشد جیسے فن کار میں کوئی تخلیقی جوہر، کسی فن کارانہ قوت اور کسی تازہ کاری کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نظر نہ آئے۔

" ن۔م راشد۔ حیات اور شاعری " بے حد معمولی گٹ اَپ پر شائع کی گئی ایک سو دو صفحات کی معمولی سی کتاب ہے۔ کتاب ظاہری حُسن سے بالکل محروم ہے۔ پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ بغض معاویہ میں شائع کی گئی ہے۔ اگرچہ کتاب کے نام کے مطابق راشد کی حیات کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ معلومات ضرور بہم ہونی چاہئیں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ پہلا عنوان ہے۔" ن م راشد پر "۔

خدا کی شان تنقید نگار کو " ماورا " میں کچھ جاذب نظر بھی نظر آتا ہے۔ جس کا اعلان وہ ابتدائی سطروں میں کرتا ہے۔ لیکن وہ " ماورا " کی لکھائی، چھپائی، سرورق، قیمت، کرشن چندر کا سولہ صفحات کا تعارف اور کتاب کے انتساب کو جاذب نظر سمجھتا ہے۔ تنقید نگار کی رائے ہے کہ فیض اور کرشن چندر اس پائے کے ادیب ہیں کہ کسی ایک کا ہی نام کتاب کو اونچا درجہ دلانے کے لئے کافی ہے۔ اس ایک جملے سے ہی تنقید نگار کی قوت انتقاد ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو محض ناموں اور شخصیتوں کے ذریعہ کتاب کو اونچا درجہ دیتا ہے۔ بہر حال " راشد پر " عنوان کے تحت راشد کی نظموں پر تبصرہ شروع ہوتا ہے۔

ابتدا راشد کی نظم " انتقام " سے ہوتی ہے۔" ماورا " میں کل سینتیس ۳۷ نظمیں ہیں لیکن تنقید نگار ابتدا ءپینتیسویں نظم " انتقام " سے کرتا ہے۔ شروع کی چونتیس نظمیں قابلِ

اعتنا رہی نہ ہوں ایسا نہیں بلکہ شاید ان نظموں کی تنقید میں وہ شہوت انگیز نثر نہ لکھی جا سکتی تھی جو "انتقام" کے سلسلے میں رقم کی گئی ہے۔ "انتقام" اٹھارہ مصرعوں کی ایک خوبصورت سی نظم ہے۔ جس میں ایک دشمنِ فرنگ کسی فرنگی حسینہ سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام لیتا ہے۔ پوری نظم میں کوئی غیر فصیح لفظ یا رکیک و مبتذل جذبہ سامنے نہیں آتا۔ لیکن اس نظم کی تنقید میں، جو دو صفحات پر محیط ہے نو دفعہ لفظ "مباشرت" استعمال کیا گیا ہے۔ نہ صرف مباشرت لفظ استعمال کیا گیا ہے بلکہ مباشرت کے عمل کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ے

"مباشرت میں مرد اضطراری طور پر عورت کو دبانے اور کچلنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ عام حالات میں وہ ایسی سختیاں صرف دشمن کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اور بعض مرد مباشرت میں تصوّر بھی یہی کرتے ہیں کہ میں دشمنی برت رہا ہوں اور ان کو اپنی ہر سختی میں جنگجو یانہ شان نظر آتی ہے۔ یہ دشمنی کا جذبہ اکثر اتنا بڑھ جاتا ہے کہ مرد کاٹ کھاتا ہے۔ یا اسی قسم کی اور حرکات کر بیٹھتا ہے۔ اور اس سے تسکین محسوس کرتا ہے۔"

میرا دعویٰ ہے کہ یہ اقتباس کسی کو بھی سنا دیجئے۔ شبہ تک ظاہر نہ کرے گا کہ کسی تنقیدی مضمون کا حصّہ ہے۔ پوری نظم "انتقام" میں، جس پر یہ شہوت انگیز خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ ایک بار بھی لفظ مباشرت استعمال نہیں ہوا۔ پہلے صرف وہی ٹکڑا دیکھئے جس کا حوالہ تنقید نگار نے دیا ہے۔

اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے حسی کا انتقام

تنقید نگار کی دلیل یہ ہے کہ مباشرت کو انتقامی کاروائی سمجھنا درست نہیں ہے۔ بلکہ یہ "ایذا دہی" ہے۔ حالانکہ علم نفسیات کی رُو سے "ایذا دہی" کی تعریف میں جنسی عمل کے دوران فطری حرکات نہیں آتیں۔ اب دوسرا پیرا ملاحظہ کیجئے۔

"مباشرت میں ہوتا یہ ہے کہ مرد کی ہر سختی عورت کو لذت دیتی ہے۔ جس کا اظہار اس کی حرکات

وسکنات سے ہوتا ہے۔ مردان حرکات وسکنات کی مدد سے اس لذّت کو جو وہ محسوس کر رہی ہے۔ اپنے تخیل میں محسوس کر سکتا ہے۔ جس سے اس کی سرشاری اور بڑھتی ہے اس طرح مرد کی ہر سختی خود اس کے دماغ میں لذّت کی شکل میں منتقل ہو کر واپس آجاتی ہے۔ یعنی مرد کا دماغ بیک وقت اپنی اور عورت کی دونوں کی لذتیں محسوس کرتا ہے اور ساتھ ساتھ دونوں لذتوں کے اتحاد کو۔"

تنقید نگار نے اس معمولی سی بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ زمانۂ جاہلیت سے آج تک دوسرے قبیلے یا فرقہ کی خواتین کو ہوس کا ہدف بنانا ایک انتقامی جذبہ ہے۔ جو آج بھی پوری دنیا میں جاری و ساری ہے۔ اگر تنقید نگار اسی نظم کے ایک اور ٹکڑے کو ملاحظہ فرما لیتے تو شاید بات واضح ہو جاتی ؎

اجلی اجلی اونچی دیواروں پہ عکس
ان فرنگی حاکموں کی یادگار
جن کی تلواروں نے رکھا تھا یہاں
سنگِ بنیاد فرنگ

شاعر کو فرنگی سیاست دانوں کی تصویروں اور مجسموں سے بھی نفرت ہے۔ لیکن وہ اس کے ماحول میں شامل ہیں۔ انہی تصویروں اور گوشۂ دیوار میں ہنستے ہوئے دھات اور پتھر کے فرنگی بتوں کے درمیان وہ انہی کے فرقہ کی ایک خاتون سے ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام لیتا ہے۔

اس کے بعد تنقید نگار "راشد میں ایذا دہی کی علّت" کے عنوان سے راشد کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح غالب کے مصرعہ ؎

مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

کو سامنے رکھ کر غالب "برہمن سبھا" سے متعلق ثابت کیا جا سکتا ہے۔ یا اقبال کے مصرعہ "مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں" کو سامنے رکھ کر فتویٰ دیا جا سکتا تھا کہ اقبال میں احساسِ کمتری بہت تھا۔

"محبوبہ کا تخیل" کے عنوان سے تنقید نگار کو شکایت ہے کہ راشد کی محبوبہ محض جسم ہے۔ اس میں دل و دماغ نظر نہیں آتا۔ افسوس تنقید نگار پہلی نظم "میں اسے واقفِ الفت نہ کروں" کی دنیا سے سرسری گزرے، ورنہ راشد کی ہر نظم کی طرح اس نظم میں بھی معنی کا ایک جہان دیگر آباد

ہے۔ اسی نظم میں ایک مصرعہ ہے ؎

سوچتا ہوں کہ بہت سادہ و معصوم ہے تو

سادگی اور معصومیت دل و دماغ کی ہی ایک کیفیت ہے جسمانی نہیں۔ لیکن تنقید نگار کو شدتِ ہوش نے اس درجہ دیوانہ بنا یا ہے کہ وہ سادہ کے معنی احمق سمجھتا ہے اور سند میں ناسخ کا یہ مصرعہ پیش کرتا ہے۔ ؎

زاہدِ بے رس بھی کتنا سادہ ہے

اول تو سادگی اور حمق میں بُعد المشرقین ہے۔ لیکن ناسخ کے اس مصرعہ کے ساتھ اگر میرؔ کا یہ مصرعہ بھی یاد کر لیا جائے ؎

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب

تو سادہ کے معنی احمق نہیں رہتے۔ کم از کم میرؔ جیسا نازک مزاج آدمی خود کو احمق نہیں کہے گا۔ "راشد بے مفہوم الفاظ" استعمال کرتا ہے" ۔ "راشد لہجے کا خراب نباض ہے" ۔ "راشد لفظ کا خراب نباض ہے۔" جیسے نعروں کے بعد تنقید نگار ایک مصرعہ کی گرفت کرتا ہے ؎

روح کا اظہار تھے بوسے مرے

تنقید نگار کے خیال میں یہاں اظہار EXPRESSION کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ غلط ہے۔ اس کی بجائے ترجمانی کا لفظ ہونا چاہیئے۔ اول تو بوسہ روح کی ترجمانی نہیں کرتا، بوسہ محض اظہار ہے۔ اس لئے راشد کا مصرعہ مکمل ہے۔ لیکن تنقید نگار کا اعتراض اس لئے بھی بے بنیاد ہے کہ EXPRESSION کا ترجمہ اظہار ہی صحیح ہے۔ ترجمانی REPRESENTATION کا اردو ترجمہ ہے۔ اس وقت تک تو شمس الرحمٰن فاروقی کی بوطیقا بھی شائع نہیں ہوئی تھی، جنہوں نے کا اردو ترجمہ "ترجمانی" کیا ہے۔ یہاں تنقید نگار کو زبردست تسامح ہوا ہے، غرض ساری تنقیدی کتاب اسی طرح کے بے معنی اعتراضات، ذاتی رنجشوں سے پیدا شدہ کدورتوں اور لذت انگیز اسلوب سے بھری پڑی ہے۔ جس پر اس مختصر سے مضمون میں روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔

کتاب کا آخری باب کرشن چندر کی تذلیل میں ہے۔ جس کا جرم یہ ہے کہ اس نے "ماورا"

کا دیباچہ لکھا تھا۔ اس باب میں ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کرشن چندر میں وہ فہم و فراست نہیں ہے جس سے شاعری کی پرکھ کی جاسکتی ہے۔ اس باب میں تنقید نگار راشد پر دھوکے بازی کا الزام لگاتا ہے۔ اعصابی تکان، ذہنی جمود، شکستہ ایمان اور حد سے بڑھی ہوئی احساس کمتری کا مارا ہوا ثابت کرتا ہے۔ لیکن تنقید نگار کی تسلّی محض راشد اور کرشن کی عیب جوئی سے ہی نہیں ہوئی، بلکہ اب وہ اپنی تعریف پر اتر آتا ہے۔

"لیکن نقاد اور ہوشیار نگاہیں اس کی باتوں کی تہ میں اتر کر ان عیوب کو دیکھ لیتی ہیں۔"

"اگر غیر نقاد اس کے کلام کو پڑھے تو اس کے ناقص جذبات کے بہاؤ میں بہہ جائے گا۔"

"صرف گہری نگاہ کا شخص جو اپنا ذاتی پختہ معیار رکھتا ہو۔ راشد کے عیوب کو پکڑ سکتا ہے اور ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔" خدا کا شکر تنقید نگار نے یہ نہیں کہا کہ ایسا شخص صرف ایک ہی ہے۔"

اسی باب میں تنقید نگار نے ایک جملہ اس طرح شروع کیا ہے۔ "اردو کے سب سے پرانے شاعر ولی ......" تعجب ہے کہ فاضل تنقید نگار ولی کو اردو کا سب سے پرانا شاعر مانتے ہیں۔ جس تنقید نگار کی علمیت کا یہ حال ہو، اس سے اسی طرح کی تنقید کی امید کی جاسکتی ہے۔

تنقید نگار نے اپنے مضمون کی ابتدا میں لکھا تھا۔ کہ :۔

"ہم جس عبوری دَور سے گزر رہے ہیں وہ کچھ ایسا عبوری دَور ہے کہ پرانی قدریں ناکارہ ثابت ہو چکی ہیں اور نئی قدروں نے ابھی اتنی وقعت نہیں حاصل کی ہے کہ ان کی جگہ لے سکیں۔ ایسی حالت میں کسی چیز کے بارے میں قطعی رائے دینا مشکل ہے۔ پھر تجزیہ نفسی اور مارکسی کا ادب میں جو دخل ہونے لگا ہے۔ تو لوگ اپنے ذوق پر بھروسہ کرنے سے ڈرتے ہیں۔"

قطع نظر اس اہم بات سے کہ شروع کا پورا جملہ انگریزی قول کا ناقص ترجمہ ہے تنقید نگار کی رائے کم از کم ان کے بارے میں پوری طرح صحیح ہے۔ وہ پرانی قدروں کی شکستگی سے دل برداشتہ ہیں۔ اور ادب میں انھیں راشد کی دَرّانہ آمد بے حد ناگوار گزری ہے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ راشد آئے تو اس انداز سے کہ چھوٹے موٹے تنقیدی قلم سہم گئے، اور ان کی شاعری تجربہ نہیں دعویٰ بن گئی۔

یہ سچ ہے کہ "ن۔م راشد حیات اور شاعری" کسی نو آموز تنقیدی قلم کا بچکانہ تجربہ محسوس ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ہر قدم پر یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ تنقید نگار اس اسلوب سے تلذذ حاصل کر رہا ہے۔ بعض ابواب پڑھ کر وہی وہانوی کی یاد آجاتی ہے۔

مضمون کا آخری جملہ یہ ہے۔ کہ درحقیقت کرشن چندر نے راشد کو جس طرح بہت بڑا شاعر ثابت کیا ہے۔ اسی طرح جس شاعر کو چاہو دنیا کا سب سے بڑا شاعر ثابت کر دو۔ میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر یہی طرز تنقید ہے تو جس شاعر کو چاہو غیر معیاری، شہوانی، بدکردار، دھوکے باز، ثابت کر دو۔

"شہوت حیوانی" کے عنوان سے ایک باب ہے۔ اس باب کو پڑھتے وقت کام و دہن میں چٹخارہ سا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس باب میں امرؤالقیس کے سبعہ معلقہ والے قصیدہ کا ترجمہ تقریباً غلط کیا گیا ہے۔

امرؤالقیس کے سبعہ معلقہ کے سترہویں شعر کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ ۵

ومثلک حبلیٰ وقد طرقت ومرضع
فالھیتما عن ذی تمائم محول
اذا ما بکی من خلفھا انصرفتْ
بشق وتحتی شقھا لم تحول

" اے محبوبہ تو اپنے کو بہت حسین سمجھ کر مجھ سے ناز نہ کر، میں بھی بڑا بانکا مرد ہوں، جانے کتنی عورتیں مجھ پر مرتی ہیں۔ ان میں حاملہ بھی ہے، اور ایسی ماں بھی جس کی گود میں ایک سال کا بچہ ہے۔ جس کا اتنا دلار کرتی ہے کہ گلے میں تعویذ پہنا رکھا ہے۔ اس پر بھی جب میں رات کو اس کے پاس جاتا ہوں تو ماں کو اپنی طرف الیسا راغب کر لیتا ہوں کہ بچے کو بھول جاتی ہے۔ اور میں اس سے مشغول ہو جاتا ہوں۔ ایسی حالت میں اگر بچہ روتا ہے تو وہ اوپر کے جسم سے گھوم کر دودھ پلانے لگتی ہے۔ لیکن نیچے کا جسم بدستور میرے نیچے رہتا ہے۔"

اس شعر کا صحیح ترجمہ یہ ہے۔

"جب حفاظتی تعویذ پہنے ہوئے، ایک سال کا بچہ، اپنی ماں کی پشت سے روتا تھا،

تو وہ اپنے جسم کا اوپر والا حصہ پھیر دیتی تھی تاکہ وہ دودھ پیتا رہے اور نصف زیریں حصہ میرے نیچے رہتا تھا جس کو وہ نہیں پھیرتی تھی۔"

امرؤ القیس کا پورا نام امرؤ القیس بن حُجر الکندی تھا۔ عرب میں وہ مَلِک الضّلیل یعنی گمراہ بادشاہ کے لقب سے مشہور تھا۔ امرؤ القیس اپنی چچا زاد بہن عنیزہ سے عشق کرتا تھا۔ لیکن ایک موقعہ پر اس نے اپنی محبوبہ اور اس کی سہیلیوں کے کپڑے چرا لئے۔ جس کی وجہ سے ان تمام لڑکیوں کو غسل سے فارغ ہو کر امرؤ القیس کے سامنے سے برہنہ گزرنا پڑا۔ یہ ایک طرح کا SADISTIC رویہ تھا۔ تنقید نگار نے امرؤ القیس کو ایک آدرش کے رُوپ میں پیش کیا ہے۔ اور راشد پر جگہ جگہ ایذا دہی SADISTIC اور ایذا طلبی MASOCHISTIC رجحانات کے الزام عائد کئے ہیں۔ جس قصیدہ کے شعر کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں بیاسی اشعار ہیں۔ اور حوالہ شدہ شعر سے تقریباً سب بہتر ہیں۔ چوں کہ اس شعر میں جس عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ ناممکن ہے۔

"ن۔ م۔ راشد۔ حیات اور شاعری" ذاتی بغض و عناد پر مبنی ایک معمولی درجہ کی کتاب ہے جو کسی طرح بھی تنقیدی کتابوں میں شمار نہیں کی جا سکتی۔ اس کتاب سے راشد کی شاعرانہ حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن انصاری صاحب کی ادبی شخصیت ضرور مجروح ہوتی ہے۔

⁂

شعبہ اردو
دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

ڈاکٹر محمد یعقوب عامر کی یہ نظم چنگاری میں چھپ چکی ہے۔ ہم اسے ایک منظوم مقالے کے طور پر دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر یوگندر بہل تشنہ کی نظم نالۂ اردو بھی اسی قسم کا ایک منظوم مقالہ ہے۔ اس قسم کے مقالے چھاپنا ہمارا مزاج نہیں۔ اس شمارے میں ان کی شمولیت کی وجہ وہ سچائی ہے جس پر اظہار ندامت اور تشویش ہم سب پر لازم ہے۔

ادب آشوب ــــ ڈاکٹر یعقوب عامر

یہ جدت، قدامت، ترقی پسندی
ہے زوروں کی اردو میں اب پارٹی بندی
وتیرے مغلظ، زبانیں بھی گندی

یہ گلیوں میں پھرتے ہیں چاقو نکالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

یہ کرسی کا جھگڑا، یہ پیسے کا چکر
یہ خونخوار حربے، یہ تکرار ٹکر
ہیں لالچ کے مرغے، نہ بیٹھیں گے تھک کر

یہ اک دوسرے سے نہیں دبنے والے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

ہے اردو زباں اِن کے ہاتھوں میں کاسہ
جسے جتنا حاصل وہ اتنا ہی پیاسا
کہاں تک حکومت انھیں دے دلاسا
یہ گنتے ہیں اک دوسرے کے نوالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

یہ سب اپنے مالک کے پنجرے کے مٹھو
یہ اندر کے بیری، یہ باہر کے پٹھو
مزا یہ کہ سب ان کے دیسی ہیں ٹٹو*

ادب میں جو کرتے ہیں بیدار سالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

ہر اک گھاٹ پر ان کی ہے جی حضوری
حقیقت بہ پردے، صداقت ادھوری
انھیں چاہیئے اپنی خوراک پوری

یہ ہر جا سے بھرتے ہیں اپنے ہی پیالے
نہیں کوئی ایسا جو ان کو سنبھالے

عجب ہے یہ ان سب گروہوں میں ان بن
جو اک دوست تو دوسرا آپ دشمن
بچے کوئی ان سے، تو سب اس سے بدظن

جو پوچھو کہ کیوں جی تو حیلے حوالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

جو اک کی کہو دوسرا ٹانگ کھینچے
کہو دوسرے کی تو وہ دانت پیسے
اگر چپ رہو تو کوئی ہاتھ کھینچے

یہ کیا کر رہے ہیں غترغوں یہ سالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

سیاست کی شطرنج کے سب کھلاڑی
ذرا ان کو مل جائے افسر اناڑی
تو پھر دیکھو ان کی اکھاڑ، پچھاڑی

کہ رہ جائیں حیران تہذیب والے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

* یہ قافیہ غلط ہے۔

یہ اک دوسرے کے لیے گو ہیں پاجی
مگر لوٹ کے مال میں سب ہیں ساجھی
دلائیں کلرکوں کو یہ دال بھاجی
اڑائیں مگر یہ بہم تر نوالے
نہیں کوئی ایسا جو اِن کو سنبھالے

ہے کالج میں ان کی عجب کج کلاہی
نیا لیکچرر وہ جو ان کا سپاہی
ہے انصاف کیا اور کیا داد خواہی
وہ منظور ان کو جو گردن جھکالے
نہیں کوئی ایسا جو ان کو سنبھالے

یہ رکھتے ہیں پاس اپنے کتے شکاری
یہ حربوں سے اپنے ہیں غنڈوں پہ بھاری
سلکشن کمیٹی میں یہ سب مداری
دکھاتے ہیں اک کو کرتب نرالے
نہیں کوئی ایسا جو ان کو سنبھالے

یہ مٹھو میاں اپنے زورِ بیاں میں
سمجھتے ہیں خود کو معزز جہاں میں
مگر تفرقہ رہ گیا درمیاں میں
یہ بگلا بھگت سب کے ہیں دیکھے بھالے
نہیں کوئی ایسا جو ان کو سنبھالے

ہوا درس گاہوں کا اب حال ابتر
ہیں شاگرد بیچارے حیران و ششدر
بنیں کس کے حامی، رہیں کس سے بچ کر
یہ استاد ہیں بحث و تکرار والے
نہیں کوئی ایسا جو ان کو سنبھالے

ہے تفریق و تقسیم وہ کیمپس میں
نہیں ضابطہ اب کسی کے بھی بس میں
پھنسے ہیں جو شاگردان کی ہوس میں

دعا کر رہے ہیں خدایا بچالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

لگاتے ہیں یہ امتحانوں کے نمبر
یہ ہیں نوکری کے اداروں کے ممبر
یہ بھارت کی سرکار کے خاص رہبر

ہیں مٹھی میں عہدے زبانوں پہ تالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

پروفیسری ہے تجارت سے بڑھ کر
یہ محنت کریں درس دینے میں کیوں کر
ہے اصلی کمائی تو کالج کے باہر

کہ اردو ادارے ہیں ان کے حوالے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

کسی نے کہیں شاعروں کو ہے گھیرا
کسی کا کسی انجمن میں بسیرا
بہت سوں نے قبروں پہ ڈالا ہے ڈیرا

نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

ہے کالج کے لڑکوں کو اب یہ شکایت
پڑھیں کس سے، ٹیچر ہیں غرق سیاست
انھیں ملک و ملّت نہ اُردو سے رغبت

کوئی کام کس طرح ان سے بھلا لے
نہیں کوئی ایسا جوان کو سنبھالے

نالۂ اردو

(دیکھو غالبؔ، مجازؔ، بس مخمورانی میں معاف)

یہ کس دہانے پہ لے کے پہنچے ہو مجھکو آخر
ترقیوں کی قبا تو پہنی ہوئی ہے میں نے
ہے میرے آگے عمیق خندق
جو میری بربادیوں کا ساماں لیے ہوئے ہے
لکھی ہے شاید میرے مقدر میں اب عجائب گھروں کی زینت!!!

مگر تمہاری یہ خامشی بھی عجب شے ہے
تمہاری یہ مصلحت ہے شاید!

کہ تم میرے نام کے وظیفوں کو ہضم کرنے کی فکر میں ہو
تمھیں یہ پروا نہیں ہے ہرگز ——
کہ میں جو تھی ایکتا کی ضامن
سمٹ سمٹ کر بس ایک فرقے تلک ہی محدود ہو رہی ہوں
اگر یہی میرے روز و شب ہیں
تو میری زلفیں سنوارنے کو کہاں سے آئے گا[۲] کوئی ناداں[۱]
کہاں اٹھائیں گے ناز میرے خیالؔ[۲] و ذاکرؔ[۳]
نہ کرشن موہنؔ[۴]، نہ کوئی راہیؔ[۵]، نہ کوئی کھلرؔ[۶]، نہ رازؔ[۷] و تنہاؔ[۸]
نہ کوئی آزادؔ[۹] اور سرورؔ[۱۰]
مرے لئے خون دل جلا کر
جہاں کو درس خلوص دیں گے

۱؎ اندر سروپ دت ناداںؔ
۲؎ چندر بھان خیالؔ
۳؎ کشمیری لال ذاکرؔ
۴؎ کرشن موہنؔ
۵؎ رام پرکاش راہیؔ
۶؎ کے. کے کھلرؔ
۷؎ راج نرائن رازؔ
۸؎ رمیش تنہاؔ
۹؎ جگن ناتھ آزادؔ
۱۰؎ ودیا پرکاش سرورؔ تونسوی
۱۱؎ جاوید وششٹ
۱۲؎ بلراج حیرتؔ
۱۳؎ ظفر پیامیؔ
۱۴؎ ستیش بترا
۱۵؎ رشی پٹیالوی
۱۶؎ پرتپال سنگھ بیتابؔ
۱۷؎ دھرم پال عاقلؔ

نہ پھر مرے گلشنِ خیالی کے پھول ہوں گے
وشش[18] و حیرت[12]، ظفر پیامی[13]، ستیش بترا[14]
کہاں سے لاؤں گی ڈھونڈ کر میں
رشی[15] و بیتاب[16] و عاقل[17] و طور[18] و جنیت[19] اور مہر چند کوثر[20]
پھر اک بڑا نام "ماہر غالبیات" مالک[21]
ادب کے تیر[22]، گیان چند[23] اور دیوندر ایسر[24]
کنول[25] بھی کوئی نہیں کھلے گا
مرے افق پر قمر[26] بھی کوئی نہیں رہے گا
بھلا چکے ہوں گے مجھکو گلزار[27] و سوز[28] و رما[29]
کمار پاشی[30] و عرش[31] و پرکاش[32] اور راہی[33]
نہ کوئی خنداں[34] نہ اشک[35] و گیتا[36] نہ کوئی فکری[37] نہ پھر گلاٹی[38]
میرے خیالوں میں گم رہے گا
نہ ہو گا طاؤس[39] کوئی رقصاں، نہ کوئی کرتار[40] ہی رہے گا
نہ رشک[41] ہی ریڈیو پہ کچھ نشر کر سکے گا

۱۸	کرشن کمار طور
۱۹	جنیت پرمار
۲۰	مہر چند کوثر
۲۱	مالک رام
۲۲	حکم چند نیر
۲۳	گیان چند جین
۲۴	دیوندر ایسر
۲۵	اوم پرکاش بجاج کنول
۲۶	دیپک قمر
۲۷	آنند موہن زتشی، گلزار
۲۸	ہیرانند سوز
۲۹	ملراج ورما
۳۰	کمار پاشی
۳۱	عرش ملسیانی
۳۲	پرکاش تیواری
۳۳	رشمی کانت راہی
۳۴	خنداں دہلوی
۳۵	پریم پال اشک
۳۶	کالی داس گپتا رضا
۳۷	پرکاش فکری
۳۸	آزاد گلاٹی
۳۹	وشوناتھ طاؤس
۴۰	کرتار سنگھ دگل
۴۱	سکھدیو سنگھ رشک

نہ کوئی ہادی[42] نہ کوئی کومل[43] نہ کوئی رہبر[44]
شبوں میں میرے لئے جگے گا
وہ شخص تھا جو ازل سے تشنہ[45]
وہ کیا مجھے سیر کر سکے گا
نہ آئے گا رام[46] لال کوئی مری حفاظت کو تیغ لے کر
نہ ہو گی ملا[47] کی سرپرستی بھی مجھ کو حاصل
نہ گوہر[48] و گوپی[49] دکھا سکیں گے قلم کے جوہر
نہ آئے گا پھر کوئی جگندر[50] مرے فسانے سنوارنے کو
نہ جگمگائے گا کوئی مہتاب[51] میری شب کو
نہ پھر مرے آسماں کی زینت بنے گا تارا[52]

مشاعروں میں دکھائی دے گا سحر[۵۳] نہ کوئی
نہ نور[۵۴] و ناصر[۵۵] سنائی دیں گے
کہانیوں کے رتن[۵۶] بھی ڈھونڈے نہیں ملیں گے
دکن سے اُٹھے گا پھر نہ کوئی بشری نواس[۵۷] اور اُس کے ساتھی
جو اپنی شعلہ نوائیوں سے مجھے بقائے دوام دیں گے
مرے چمن کے یہ ان گنت پھول جب تہہ خاک ہوں گے
تب دو دہائیوں میں یہ کھیل بھی سارا ختم ہوگا

نہ ہوگی گجرال[۵۸] کی محبت بھی مجھ کو حاصل
کہ میرے قاتل
اُسے کبھی راستہ نہ دیں گے

نہ پھر کوئی تم سے کہہ سکے گا
کہ تم ہو میری بقا کے دشمن
ہو میرے قاتل
کہ تم میرے نام کے وظیفوں پہ پل رہے ہو

۴۲ منوہر لال ہادی
۴۳ بلراج کومل
۴۴ ہنسراج رہبر
۴۵ یوگندر بہل تشنہ
۴۶ رام لال
۴۷ آنند نرائن مُلاّ
۴۸ راج بہادر گوڑ
۴۹ گوپی چند نارنگ
۵۰ جوگندر پال
۵۱ م۔ک مہتاب
۵۲ تاراچند رستوگی
۵۳ کنور مہندر سنگھ سحر
۵۴ کرشن بہاری نور
۵۵ ا۔ک ناصر
۵۶ رتن سنگھ
۵۷ بشری نواس
۵۸ اندر کمار گجرال

یوگندر بہل تشنہ

DR. Yoginder Behl 'TISHNA'
1620, Bahadur Garh Road, Delhi-110006

ایک اعلان

سرسید
کے خواب کی تعبیر
۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء
دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔
۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء
علی گڑھ میں وفات پائی۔
ہماری نظر میں سرسید مسلمانوں کے سب سے بڑے
ترقی پسند اور اہم سربراہ تھے۔ ہم نے اس عظیم انسان کی ادبی خدمات کے تفصیلی جائزے کے طور پر
ایک خصوصی شمارہ مرتب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ سب سے تخلیقی اور علمی تعاون کی مؤدبانہ استدعا ہے۔
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اردو رسم الخط کا مستقبل

آج کل کے اخبارات نے اور نا اہل لوگوں کے مرتب کئے ہوئے کورس کی کتابوں اور کم علم مترجموں کے ہاتھوں اردو زبان کی جو بربادی ہو رہی ہے وہ بجائے خود افسوس ناک ہے. لیکن اس سے زیادہ افسوس ناک اور تاریک اردو رسم الخط کا مستقبل ہے۔

اردو رسم الخط جس کو نستعلیق کہا جاتا ہے ڈیزائنروں اور مصوروں کے ہاتھوں نہایت کس مپرسی کے عالم میں ہے۔ آج کل ایک فیشن چل پڑا ہے کہ کتاب کا سرورق بگڑے ہوئے خط میں لکھا جاتا ہے۔ کتاب کا نام، مصنف کا نام ڈسٹ کور کے اوپر نہایت بد خط لکھا ہوا ہوتا ہے۔ مصوّر اور ڈیزائنر ڈیزائن کے ساتھ ساتھ کتاب کے نام کو بھی شامل کر لیتے ہیں اور جیسا ان کو لکھنا آتا ہے ویسا ہی لکھتے ہیں۔ کچھ رنگ آمیزی کر کے، کچھ ٹیڑھی سیدھی نوک پلک نکال کے اس کو خوبصورت بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ فیشن جو چل پڑا ہے اور یہ نیا خط جو ایجاد کیا گیا ہے اس کے کوئی قواعد و ضوابط مقرر نہیں کئے گئے، نہ کسی ایک شخص نے اس کو ایجاد کیا ہے۔ نہ اس کی کوئی شکل متعین کی گئی ہے۔ آپ کسی کتب خانے میں چلے جائیے اور کتابیں اٹھا اٹھا کر دیکھتے رہیئے۔ ہر ایک کتاب کے ڈسٹ کور کے اوپر نیا انداز تحریر دکھائی دے گا۔ شاید ہی کوئی مصور اور ڈیزائنر ایسا ہو جس نے خوش خطی کی مشق کی ہو، جتنے ڈیزائنر ہیں اتنے ہی انداز تحریر ہیں۔ ہر ایک کتاب پر نیا ہی انداز تحریر ملے گا۔ کہیں رسّی کی شکل میں حروف لکھے ہوئے ہوتے ہیں، کہیں لفظوں کے ستارے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور حرفوں کی غلط سلط نوکیں نکلی ہوئی ہوتی ہیں۔ کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوات میں مکھی ڈوب گئی تھی اس کو نکال کر کاغذ پر رکھ دیا ہے۔ اس نے کاغذ پر رینگ کر حروف بنا دئے ہیں۔ کہیں معلوم ہوتا ہے تنکے سے لکھا گیا ہے، کہیں معلوم ہوتا ہے کہ سرمہ کی سلائی سے لکھا گیا ہے، کہیں نقطے نوکدار قطرے کی شکل کے ہوتے ہیں۔ غرض کہ خط کا یہ تنوع دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور اس جدید خط کا کوئی نام بھی نہیں ہے۔

نسخ و نستعلیق کے ضابطے مقرر ہیں۔ ہر ایک جوڑ کی پیمائش مقرر ہے۔ سالہا سال محنت کرنے کے

بعد اس میں کمال پیدا کیا جاتا ہے۔ قلم بنانے کا طریقہ قط رکھنے کا طریقہ۔ سیاہی کو قابو میں رکھنے کا طریقہ نوک پلک وغیرہ کے قاعدے سب مقرر و متعین ہیں۔ مصور اور ڈیزائنر اور پینٹر نسخ و نستعلیق کی مشق نہیں کرتے نہ سیکھتے ہیں۔ جیسا ان کا خط ہے ویسا ہی لکھ دیتے ہیں۔ رنگ آمیزی کر کے ڈیزائن میں شامل کر دیتے ہیں۔ اگر ایک ہزار مصور اور ڈیزائنر ہیں تو خط کے اسٹائل بھی ایک ہزار ہی ہونگے۔ یہ فیشن شروع تو کیا تھا بد خط اناڑیوں نے "دیکھو میں تیسا تو دا" کی عادت کے مطابق مگر افسوس ہے کہ اعلیٰ درجہ کے خوشنویسوں اور اساتذہ نے بھی اس کو بڑی فراخ دلی سے قبول کر لیا ہے اور اپنی مہارت فن کو اس گھناؤنے فیشن پر قربان کر دیا ہے۔ اس کو اردو کی بانصیبی و مظلومیت کہا جائے یا اپنی غلامانہ ذہنیت ؟۔

یہ ایک بڑا زبردست حادثہ ہے جو اردو کے حسین رسم الخط کو فنا کر رہا ہے جو مصنفین اپنی کتاب کے ڈسٹ کور پر اس بگڑے ہوئے لقوہ زدہ خط کو برداشت کرتے ہیں بلکہ خوش ہوتے ہیں میں ان سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی ساری کتاب کو اسی خط میں کیوں نہیں لکھواتے یہ غفلت و بے پروائی خود مصنفوں اور ناشروں کی ہے۔

گر ہمیں مکتب است و ہمیں ملاّ ؛ کارِ طفلاں تمام خواہد شد

یہ حقیقت ہے کہ خط نستعلیق دنیا کا بہترین خط ہے۔ اس میں جو حسن جو نزاکتیں، جو نوک پلک، جوڑ پیوند کا تناسب موجود ہے وہ دنیا کے کسی خط میں نہیں۔ لیکن افسوس ان ڈیزائنروں نے اس کی وہ صورت بگاڑی ہے کہ اس کو دیکھ کر گھن آتی ہے۔

اردو زبان اپنے رسم الخط کے ساتھ زندہ رہ سکتی ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔۔۔ رسم الخط گیا تو زبان بھی گئی۔ زبان گئی تو رسم الخط بھی گیا۔۔۔ مصوروں کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ کچھ آڑی ترچھی اُلٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر بتاتے ہیں کہ اس میں بسم اللہ نظر آتی ہے، اس میں کلمہ نظر آتا ہے، وغیرہ۔ مگر در حقیقت "دیکھو میں تیسا تو دا" کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس موقعہ پر جعفری صاحب کی نظم کے کچھ چیدہ اشعار پیش کرتا ہوں۔

ایبسٹریکٹ آرٹ

ایبسٹریکٹ آرٹ کی دیکھی تھی نمائش میں نے ؛ کی تھی ازراہِ مروت ہی ستائش میں نے

آج تک دونوں گناہوں کی سزا پاتا ہوں
لوگ کہتے ہیں کہ کیا دیکھا تو شرماتا ہوں

ایک تصویر کو دیکھا جو کمالِ فن تھی
بھینس کے جسم پر ایک اونٹ کی سی گردن تھی

ناک وہ ناک خطرناک جسے کہتے ہیں
ٹانگ کھینچی تھی کہ مسواک جسے کہتے ہیں

نقش محبوب مصور نے سجا رکھا تھا
مجھ سے پوچھو تو تپائی پہ گھڑا رکھا تھا

بولی تصویر جو میں نے اسے اُلٹا پلٹا
میں وہ جامہ ہوں کہ جس کا نہیں اُلٹا سیدھا

ایک تصویر کو دیکھا کہ یہ کیا رکھا ہے
ورقِ صاف پہ رنگوں کو گرا رکھا ہے

ٹیڑھی ترچھی سی لکیریں تھیں وہاں جلوہ فگن
جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے پہ سورج کی کرن

تھا کیوبزم میں کاغذ پہ جو آتا تھا نظر
مجھ کو اینٹیں نظر آتی تھیں اُسے حسن بشر

ایک تصویر جو دیکھی تو یہ صورت نکلی
جس کو سمجھا تھا اننّاس وہ عورت نکلی

اس نمائش میں جو اطفال چلے آتے تھے
ڈر کے ماؤں کے کلیجوں سے لپٹ جاتے تھے

میں نے یہ کام کیا سخت سزا پانے کا
یہ نمائش نہ تھی اک خواب تھا دیوانے کا

(متاعِ سخن)

ایک بڑھئی سے کواڑوں کی جوڑی بنوائی۔ اس نے چوکھٹا سا بنا کر ویسے ہی سیدھے سپاٹ دلے ٹھونک ٹھانک کر تیار کر دی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ کیسی جوڑی بنائی ہے نہ تو دلوں میں لوزات وغیرہ بنائی نہ فرکوٹوں اور گنجکوں میں گولا غلطاں کچھ نہیں بنایا۔ کہنے لگا آج کل کا فیشن یہی ہے۔ اب تو ویسا کوئی نہیں بنواتا۔ میں نے کہا کہ یہ فیشن کس نے ایجاد کیا ہے تو آئیں بائیں شائیں ہانکنے لگا۔

بات دراصل یہ ہے کہ آج کل کام کرنے والے خود بخود فیشن ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ اپنی تن آسانی اور بدنیتی کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تھوڑے سے وقت میں زیادہ سے زیادہ پیسے کمائیں۔ اس لئے دفع الوقتی کرتے اور کام کو گھسیٹتے ہیں۔ یہ کہدیتے ہیں کہ آج کل کا فیشن یہی ہے۔ سننے والے اس لفظ سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ چلتے ہوئے فیشن کے خلاف لب کشائی کی جائے تو قدامت پسندی کا الزام لگتا ہے اور وہمی کا خطاب ملتا ہے اس لئے خاموش ہو جاتے ہیں۔ انسانی ہمدردی کا راگ بڑے زور شور سے الاپا جاتا ہے مگر مشاہدہ یہ ہے کہ

گاہک کے ساتھ ان لوگوں کو قطعاً کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ گاہک زیادہ سے زیادہ اجرت دینے اور ان کا ناقص پھوہڑ پن کا کیا ہوا کام قبول کرنے پر مجبور ہے۔ قارئین اس گُر کو سمجھ گئے ہونگے۔ اگر چاہتے ہو کر تمہارا اناڑی پن دوسروں کی نظروں میں ہنر بن جائے اور تمہاری خود غرضی و بدنیتی دوسروں کے سامنے خلوص بن کر ظاہر ہو تو اس کا نام ترقی وجدت رکھ دو یعنی فیشن کی ڈگڈگی بجا دو بس پھر اعتراض کرنے کی کسی میں ہمت نہیں ہوگی۔ اور تم سرخرو ہوگے۔ اس طریقے سے ہر قسم کا ہنر خود تمہارے ہاتھوں دفن ہوجائے گا۔ جب اناڑی پن سے ہی خوب تن پروری ہوجاتی ہے تو ہنر میں مہارت اور کمال پیدا کرنے کی کیا ضرورت؟ درزی بھی کُرتے میں اکہرے بخیے کرتے ہیں، کہتے ہیں اب تو یہی فیشن ہے۔

ایسا ہی حال کاتبوں کا ہے۔ اول تو کاتبوں کی کمی پریشان کن ہوگئی ہے۔ اور ہیں تو ایسے ہیں کہ صرف مفردات کی تختی نکالی۔ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ مشق کی اور اجرت کا کام کرنا شروع کردیا۔ حرفوں کی صحیح شکل لکھ سکتے ہیں نہ جوڑ پیوند کا ان کو علم ہے۔ غلط جوڑ، غلط شوشے۔ بلاضرورت کششوں کی بھرمار۔ عبارت کو بکھرا ہوا لکھنا ایک عام عادت ہوگئی ہے۔ حالانکہ اساتذۂ فن نے کتابت میں بلاضرورت کشش کے استعمال کو عیب قرار دیا ہے۔

ایک نوجوان کاتب صاحب کو میں نے لکھنے کے لئے ایک کتاب دی۔ انھوں نے اصل کتاب کے ایک صفحہ کو پھیلا کر دو صفحوں میں لکھا۔ اور جب میں نے ان سے کہا کہ یہ تم نے کیا کیا۔ تو فرمایا کہ آج کل کا تو فیشن یہی ہے۔ ایسا ہی کُھلا کُھلا لکھواتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ فیشن بنانے والے بھی تم ہی ہو۔ تمہاری لکھائی میں گٹھاؤ نہیں ہے۔ اس طریقے سے میری کتاب دو سو صفحے کے بجائے چار سو صفحات کی ہوجائے گی۔ اپنے پھوہڑپن، نقص اور خود غرضی کو فیشن قرار دیتے ہو اور گاہکوں کی طرف منسوب کرتے ہو اور کہتے ہو کہ وہ ایسا ہی پسند کرتے ہیں۔ اگر بچوں کے کورس کی کتابیں کُھلی کُھلی لکھی جائیں تو ٹھیک ہے لیکن غیر درسی اور علمی وفنی کتابوں کو اس طرح سے لکھنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

غرض یہ ہے کہ اردو کی نیّا ڈانواڈول ہے۔ اردو کے مخالفین کا کیا گلہ شکوہ کیا جائے۔ آجکل کے اردو اخبارات ورسائل نے تو زبان کا حلیہ بگاڑ دیا ہے اور ڈیزائنروں اور نااہل کاتبوں نے

اردو رسم الخط پر کلہاڑا چلایا ہے۔

اس خوبصورت نستعلیق خط کو بگاڑنا بدنما کرنا اور اس کا نام فیشن رکھ دینا۔ کیا ترقی اسی کو کہتے ہیں اور یہ ترقی حسن و جمال کی طرف ہے یا بدنمائی و قبح اور بگاڑ کی طرف ؟ کیا یہی وہ رسم الخط ہے جس کی بقا کی کوشش کی جارہی ہے ؟

اردو رسم الخط لکھنے کے لئے تھوڑی سی فارسی و عربی کی واقفیت ضروری ہے کیونکہ اردو میں فارسی ترکیبیں بہت استعمال ہوتی ہیں۔ عربی کے الفاظ اور عربی کا الف لام بھی بہت زیادہ استعمال میں آتا ہے۔ الفاظ کی ساخت کا بھی جاننا ضروری ہے۔ مثلاً "عزیز" ایک لفظ ہے ایک سطر میں "عز" اور دوسری سطر میں "یز" لکھدے تو معلوم ہوگا کہ کاتب بالکل جاہل ہے۔ آج کل کے کاتب اس قسم کی بہت غلطیاں کرتے ہیں۔ اور یہ ناشائستہ حرکت تو بہت عام ہوگئی ہے کہ صرف لفظ "ہے" کو یا "گا" کو دوسری سطر میں کھینچ کھانچ کے لایا جاتا ہے اور اس طرح ایک سطر ضائع کی جاتی ہے۔ یہ حرکت قصداً کی جاتی ہے اور اس کی بنیاد وہی خود غرضی اور بدنیتی ہے جو پھیلا کر کھلا کھلا لکھنے یا خط کو بگاڑ کر لکھنے میں کارفرما ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو زبان اور اردو رسم الخط تو فنا ہوتا جارہا ہے۔ اور ہمارے دانشور اور ادیب بڑے بڑے لمبے چوڑے فلسفیانہ تبصرے، تقریظیں، دیباچے، پیش لفظ اور تاریخی مقالے لکھنے میں مصروف ہیں جن میں یا تو عربی فارسی کے بہت بھاری بھاری اور ثقیل الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں یا خود ساختہ اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ جنکا زبان کے لغات اور محاورات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔

اور ہمارے لیڈر اردو کا حق منوانے کے لئے بڑی بڑی کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ زبان اور رسم الخط ہے کہاں ؟ جس کے لئے اتنی ہنگامہ آرائی کی جاتی ہے۔ کیا اس کی حفاظت کی طرف بھی توجہ کی جاتی ہے ؟

● قوم کا مستقبل

یہ ننھے ننھے منے منے بچے جو نرسری اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں قوم انھیں کا نام ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت اگر صحیح طریقے سے نہ ہو سکی تو بڑے ہو کر بھی درست نہ ہو سکیں گے۔

ایک فارسی شاعر کہتا ہے ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج ٭ تا ثریا می رود دیوار کج

یعنی معمار جب پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھتا ہے تو دیوار ثریا تک ٹیڑھی ہی جاتی ہے۔ جو عادت بچپن میں پڑجاتی ہے وہ عمر بھر قائم رہتی ہے۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ابتدائی تعلیم کے لئے بہترین، قابل، تربیت یافتہ، مہذب بلند کردار افراد چھانٹ کر رکھے جاتے۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ میری ایک تجویز ہے۔ اگرچہ یہ جانتا ہوں کہ ہمارے ملک کا آج کل کا فیشن یہی ہے کہ تجویزیں بہت بنتی رہتی ہیں لیکن وہ کاغذ تک محدود رہتی ہیں میری تجویز کا حشر بھی یہی ہوگا۔ یہ جانتے ہوئے بھی تجویز پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ " ایں ہم برسر علم " وہ یہ کہ ریڈروں اور پروفیسروں کو نرسری اسکول میں لگایا جائے اور پرائمری کے جو معلم بدخط، بدلسان، بدسلیقہ ہوں ان کو غالب اکیڈمی میں خوش خطی سیکھنے کے لئے محب مکرم خلیق ٹونکی کے سپرد کردیا جائے اور خلیق صاحب پر پابندی لگادی جائے کہ وہ صرف نسخ و نستعلیق سکھائیں۔ ڈیزائن سازی، نقش و نگار، خط کوفی، خط رعنا، خط نازنین، اور خط اڑنگ بڑنگ وغیرہ سکھانے کی ضرورت نہیں۔

تنخواہیں ریڈروں اور پروفیسروں کی بدستور قائم رکھی جائیں اور پرائمری کے معلموں کو بھی کم از کم تین سال تک بدستور تنخواہیں دی جائیں۔ تین سال کے بعد خوشنویسی میں اپنی موجودہ تنخواہوں سے بہت زیادہ کمانے کے قابل ہوجائیں گے۔ اس وقت اردو کے کاتبوں کی بہت کمی ہے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا تو قوم کا مستقبل ہمارے سامنے ہے۔ جس دور سے ہم گذر رہے ہیں یہ مستقبل ہی تو ہے۔ اور آگے کا مستقبل اس سے زیادہ عبرت ناک دکھائی دیتا ہے۔

یہ جو کچھ ہے اظہار جذبات ہے ٭ مرے دردِ دل کی محاکات ہے
حدودِ تحمل کو ملحوظ رکھ کر ٭ مری بات سمجھو تو کیا بات ہے

(مولانا حفظ الرحمٰن واصف)

بشکریہ ماہنامہ دارالسلام مالیر کوٹلہ

مشہور زمانہ تقریریں

مسلمانانِ دلّی کا اجتماع

جامع مسجد، دلّی اکتوبر ۱۹۴۷ء

میرے عزیزو! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی چیز ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لیے شاہ جہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع کوئی نئی بات نہیں ہے میں نے اُس زمانہ میں جس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں، تمھیں یہیں سے خطاب کیا تھا۔ جب تمھارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمھارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد۔ آج تمھارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمھیں یاد ہے، میں نے تمھیں پکارا تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی، تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتّٰی کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمھیں آج داغِ جدائی دے گئی ہے اس کے عہدِ شباب میں بھی میں نے تمھیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا، لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنّتیں تازہ کریں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمھیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمھیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گذاری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چن لیا تھا، وہاں میرے بال و پر کاٹ لیے گئے ہیں۔ یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی، بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی، تم نے کونسی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں؟ کیا تمھارے حواس میں اختلال نہیں آگیا ہے؟ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ یہ تمھارے اپنے اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا، جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے۔ نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے سُنی اَن سُنی برابر کر دی، اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمہارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمھیں بھروسہ تھا، وہ تمھیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے۔ وہ تقدیر جو تمھارے دماغی لغت کی منشاء سے مختلف مفہوم رکھتی ہے یعنی ان کے نزدیک فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمھاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی، اور راہ نمائی کے وہ بُت جو تم نے وضع کیے تھے، وہ بھی دغا دے گئے، حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لیے بچھائی گئی ہے، اور ان ہی بُتوں کی پوجا میں تمھاری زندگی ہے۔ میں تمھارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا۔ اور تمھارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں۔ لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ، تو تمھارے لیے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔

ایک وقت تھا میں نے ہندستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمھیں پکارا تھا اور کہا تھا۔

جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندستان کی تقدیر
میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت
سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلوتہی کی
اور تعطّل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا، تو مستقبل کا مورّخ لکھے گا کہ تمھارے
گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا، ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویّہ
اختیار کیا، جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ آج ہندستان
کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور
کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔"

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمھاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی، بلکہ اس نے
ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی۔ اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی
ایک کروٹ نے تمھیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی
اچھی شے چھن گئی ہے اور اس کی جگہ بری شے آگئی ہے۔ ہاں، تمھاری بیقراری اسی لیے ہے کہ
تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لیے تیار نہیں کیا تھا۔ اور بری شے کو ملجا و ماویٰ
سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے۔ جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا
کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا کہ جب ہماری قوم کے قدم کسی جنگ کے آغاز
کی طرف تھے، اور آج تم اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمھاری اس عجلت پر
کیا کہوں، کہ ادھر سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گمرہی کا خطرہ بھی پیش آگیا!

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاست کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔
میں نے اس پرخار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں
کا پہلو لیے ہوتی ہیں۔ لیکن مجھے آج جو کچھ کہنا ہے اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔
متحدہ ہندستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی،

اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات میں آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

پچھلے سات برس کے روداد دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں ہی کا نتیجہ ہے لیکن میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پچھلے دنوں ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔

اب ہندستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے مسلم لیگ کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے اندازِ فکر میں بھی سوچ سکتے ہیں یا نہیں۔ اسی لیے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتہ میں ہندستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا ہے۔ دعوت نامے بھیج دیے گئے ہیں۔ ہراس کا موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھا لو، اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے، جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمھارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہے۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر غور کرو، اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ، اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمھارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟

یہ دیکھو، مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا۔ اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمھارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصے پہلے تمھارا جوش وخروش بیجا تھا اُسی طرح آج یہ تمھارا خوف وہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال، ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمانوں کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں انھوں نے تمھیں جانے کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمھارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ عیب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو تمھارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمھارے پاس ہیں تو اسے خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک اُمّی کی معرفت فرمایا تھا: "جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم"[2]۔ ہوائیں آتی ہیں، اور گذر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت ہی میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں ہوں لیکن مجھے تمھاری تغافل کیشی کے پیشِ نظر بار بار یہ کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنی گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے جو ہونا تھا، وہ ہو کر رہا۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمھارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں، اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی، تو پھر حالت دوسری ہے لیکن اگر واقعی تمھارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے تو پھر اس طرح بدلو جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔ آج بھی کہ ہم ایک دَورِ انقلاب کو پورا کر چکے ہیں، ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان صفحوں میں زیبِ عنوان بن سکتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لیے تیار بھی ہوں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیّر کے لیے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے اس سے کرنیں مانگ لو اور

ان اندھیری راہوں میں بچھا دو، جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمھارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں، وہ تمھارا ہی قافلہ تھا، انھیں بھلاؤ نہیں۔ انھیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو، اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمھیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود اک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو، کیا یاد نہیں کہ تمھارا وجود ایک اجالا تھا! یہ بادلوں نے میلا پانی برسایا ہے تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائینچے چڑھا لیے ہیں۔ وہ تمھارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا۔ بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرا دیے۔ بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی تو اس کا رخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ تمھارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے۔ اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمھارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ وہی پرانا نسخہ ہے، جو برسوں پہلے کا ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان کہ لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔[3]

آج کی صحبت ختم ہو گئی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ اختصار کے ساتھ کہہ چکا ہوں۔ پھر کہتا

ہوں اور بار بار کہتا ہوں: اپنے حواس پر قابو رکھو، اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمھیں خرید کر لادوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی میں سے اعمالِ صالحہ کی نقدی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گاندھی جی کی یادگار

نئی دلی ، فروری ۱۹۴۸ء

گاندھی جی کے حادثۂ قتل کے چند ہی روز بعد فروری ۱۹۴۸ء میں کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دلی) میں ایک اجتماع ہوا تھا، جہاں یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ گاندھی جی کی یادگار کس شکل میں قائم کی جائے۔ اس جلسے کی صدارت مولانا آزاد نے فرمائی تھی۔ یہ ان کی صدارتی تقریر ہے

آج مہاتما گاندھی کے بعد نہ صرف ہندستان میں، بلکہ تمام دنیا میں ان کی یادگار مختلف شکلوں میں قائم ہے۔ حال ہی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی چھ اصحاب پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی ہے، جو مہاتما گاندھی کی ایک ایسی یادگار قائم کرنے کے مسئلے پر غور و فکر کرے گی، جو ان کے پاکیزہ مقصدِ حیات اور اس کی روح کو دنیا کے سامنے نمایاں کر دے۔

اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی ان کی خدمات کے تذکرے اور قلمی یادگاریں، ان کے کارنامے محفوظ کیے جا رہے ہیں، تاکہ آنے والی نسلیں جب ان کی زندگی کا مطالعہ کریں، تو ایک روشن حقیقت ان کے سامنے آجائے۔

یہ سب کچھ ہے لیکن میں جب بھی سوچتا ہوں ایک چیز بار بار میرے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ اس طرح جو کچھ بھی کیا جارہا ہے اس میں مجھے ایک بڑا خانہ خالی نظر آتا ہے اور اگر اس کو پُر نہ کیا گیا تو ایک بڑی کمی رہ جائے گی۔

آپ کو معلوم ہے کہ مہاتما جی کی زندگی مختلف کاموں میں گذری ہے لیکن ان جیسی شخصیتیں دنیا میں کبھی کبھی ابھرا کرتی ہیں، جو دنیا کی تمام خودساختہ حدبندیوں سے بالاتر ہوا کرتی ہیں۔

تاریخ انسانی کے ہر دور میں آپ دیکھیں گے کہ انسان نے دنیا میں بہت سی حدبندیاں قائم کی ہیں۔ جیسے جغرافیائی حدبندی؛ کہا جاتا ہے: یہ یورپ ہے، یہ ایشیا، یہ عرب ہے، یہ ہندستان، وغیرہ، مذہبی حدبندی؛ ہم کہتے ہیں: یہ مسلمان ہے، یہ عیسائی، یہ ہندو، یہ سکھ وغیرہ۔

قومی حدبندی؛ کہا جاتا ہے یہ انگریز ہے، یہ اٹالین، یہ ہندی وغیرہ

لسانی حدبندی؛ کہا جائے گا: یہ فلاں زبان کا بولنے والا ہے اور یہ فلاں زبان کا وغیرہ، ایسے ہی رنگ ونسل کی حدبندی وغیرہ۔

یہ تمام حدبندیاں ہماری زندگی کی قدرتی ضروریات ہیں۔ لیکن جب تک یہ تعمیری دائرہ میں رہتی ہیں، ہمارے لیے ایک بڑا سہارا بنتی ہیں اور جب یہ تخریبی رنگ اختیار کرلیتی ہیں تو گروہِ انسانی کو تباہ کردینے والی اور مٹا دینے والی بن جایا کرتی ہیں۔

دنیا کی پوری تاریخ میں جب بھی ان حدبندیوں کا غلط استعمال ہونے لگتا ہے، تو وہی مقاصد جو ان کے سہارے چمکتے تھے، خاک میں مل جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر مذہب کی حدبندی کو لیجیے۔ سب جانتے ہیں کہ مذہب دنیا کی اصلاح کے لیے آیا ہے۔ اور صلح وآشتی، امن وانصاف وغیرہ ایسی چیزیں ہیں، جن کو ہر مذہب بنیادی طور پر صحیح مانتا ہے لیکن یہی مذہبی حدبندی جب تخریبی جامہ پہن لیتی ہے تو ہزاروں

خوں ریزیوں کا باعث بن جاتی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ہزاروں کشت و خون ہیں جو اسی مذہب کے نام پر ہوئے ہیں۔

اپنے ہی ماحول کو دیکھیے۔ آج ہمارے چاروں طرف جو کچھ ہو چکا ہے وہ خدا کا نام لے کر ہی کیا گیا ہے۔ ایسے ہی جغرافیائی حد بندی کو لیجیے۔ قرآن کی بولی میں یہ بندشیں اس لیے تھیں کہ لِتَعَارَفُوْا تم میں باہم پہچان پیدا ہو۔ لیکن یہی حد بندی جب تباہی کی شکل میں آتی ہے تو دنیا میں بڑی بربادیوں کا باعث بن جاتی ہے۔

یہی حال قومی حد بندی کا ہے، اس کا مقصد بھی وہی لِتَعَارَفُوْا ہے۔ یعنی آپس کی پہچان کا ذریعہ! لیکن یہی قومیت کی حد بندی جو ایک ذریعہ پہچان کا تھی، جب اپنی حدوں سے گذر جاتی ہے، تو دنیا میں بڑی خوں ریزیاں اسی قومی حرص و طمع اور غرور و گھمنڈ کے نتیجے میں ہوئی ہیں۔

غرض کہ دنیا میں بہت سی حد بندیاں ہیں جو ہماری زندگی پر چھا گئی ہیں! اور ہم ان میں ایسے بندھ گئے ہیں کہ اگرچہ ہم میں بڑی سے بڑی روح برائی کی بڑی سے بڑی جگہ پیدا کر سکتی ہے، لیکن ان حدود کے اندر ہی اندر رہ کر ان سے آگے قدم رکھنے کی ان میں جرأت ہی پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن جس طرح نیچر ایک خاص ڈھنگ پر چلتا ہے، لیکن کبھی کبھی اپنا رنگ چھوڑ دیتا ہے۔ ایسے ہی ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کے افق پر کبھی کبھی ایسی شخصیتیں ابھرتی ہیں کہ دنیا کی کوئی حد بندی بھی انھیں بڑائی تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ مذہب کی حد بندی ان کی آنکھوں کو بند نہیں کر سکتی۔ قومیت کی حد بندی ان کے پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکتی۔ وطنیت کی حد بندی ان کے ہاتھوں کو پکڑ نہیں سکتی۔ وہ ان تمام حدود سے بہت اونچے اور بلند ہوتے ہیں۔

جب یہ شخصیتیں ان بندشوں کی حدود سے بالاتر ہو جاتی ہیں، تب آپ دیکھیں گے کہ ان کی آنکھوں میں سچائی کا نور پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی نگاہ میں تعصب کا ایک شمہ نہیں رہتا۔ ان

کی نظر ہر طرف اور ہر گوشے پر یکساں پڑتی ہے۔ دنیا کا تمام اچھا بُرا ان کے سامنے ہوتا ہے۔ وہ سب کو ایک ہی لوز سے دیکھتے اور پہچانتے ہیں۔ انھیں جہاں کہیں حُسن نظر آتا ہے، وہ دوڑتے ہیں کہ یہ تو ہمارے لیے ہے۔ انھیں جس طرف خوبی نظر آتی ہے، وہ اس کو اپناتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارا حق ہے۔ لیکن آپ یاد رکھیے، تاریخ میں ایسی ہستیاں بہت ہی کم ہوا کرتی ہیں۔

مہاتما جی کی ہستی تاریخِ عالم کی ان ہی ہستیوں میں سے ایک تھی۔ وہ دنیا کی ان تمام حدبندیوں سے بلند تر تھے۔ اور ان کی نگاہ میں ہر قوم اور ہر وطن، ہر نسل اور ہر گروہ ایک ہی حیثیت رکھتا تھا۔ اور وہ ہر ایک کی خوبیوں کو اپناتے اور پسند کرتے تھے۔

جہاں تک میری یاد داشت کام کرتی ہے، مجھے اُن کا تعارف سب سے پہلے ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ جب کہ والد مرحوم نے انتقال فرمایا۔ بمبئی، ٹرانسوال وغیرہ میں والد مرحوم نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اور ان اطراف میں ان کے بہت سے مریدین و معتقدین تھے۔ ان دنوں گاندھی جی ان اطراف کے حالات سے دلچسپی لے رہے تھے اور ٹرانسوال کانگریس کے پروگراموں میں سرگرم عمل تھے۔ اس وقت مجھے ایک ٹیلی گرام ملا۔ جس کے نیچے گاندھی جی کے دستخط تھے۔ انھوں نے اس ٹیلی گرام میں والدِ مرحوم کی تعزیت کی تھی اس کے بعد ۱۹۱۸ء تک مجھے ان سے خط و کتابت یا زیارت و ملاقات کا موقع نہ ملا۔

۱۹۱۸ء میں جب میں رانچی جیل میں نظر بند تھا، ان دنوں گاندھی جی بہار کے دورے کے لیے آئے، اور انھوں نے ایک شخص کے ذریعے مجھے جیل میں پیغام بھیجا کہ میں بہار آیا ہوا ہوں، اور تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ مگر گورنر بہار نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس کے بعد جب میں رانچی جیل سے رہا ہوا۔ اور ایک جلسہ میں شرکت کے لیے ۱۹۲۰ء کی ۲۰ جنوری کو دہلی آیا، تو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے مکان پر سب سے پہلے مجھے گاندھی جی سے نیاز حاصل ہوا۔ اس دن سے آج تک جب کہ ۱۹۴۸ء ہے، ۲۸ برس گذر چکے ہیں۔ ۲۸ برس کے

یہ دن ہم پر ایسے گذرے ہیں کہ گویا ہم ایک ہی چھت کے نیچے رہے۔

اس عرصے میں بسا اوقات ان سے اختلافات بھی ہوئے۔ چنانچہ اس لڑائی کے زمانے میں میرا اور ان کا جو اختلاف ہوا تھا اُس سے آپ بھی واقف ہونگے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں میری یہ قطعی رائے تھی جس پر ممبران کی اکثریت کو اتفاق تھا کہ اگر برطانیہ یہ مان لے کہ جنگ کے بعد ہندستان کو آزادی دے دی جائیگی، تو ہم لڑائی میں شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کو اس سے سخت اختلاف تھا، وہ بالکل دوسری جانب جارہے تھے۔ وہ کہتے تھے، ہم ایسی آزادی لینا ہی نہیں چاہتے، جو لڑائی کے سایہ میں ہم کو ملے۔ اس لیے وہ کسی طرح بھی لڑائی میں شرکت کے لیے تیار نہ تھے۔

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تجاویز کا ڈرافٹ گاندھی جی ہی بنایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی اپنے اس ریزولیوشن کا ڈرافٹ بنوانے کے لیے میں اور پنڈت نہرو، گاندھی جی کے پاس گئے۔ اور انھوں نے اپنے پورے اختلاف کے باوجود اس تجویز کا ڈرافٹ بنا دیا۔

غرض اس طویل مدت میں بہت سے موقعے آئے کہ ہم میں اور ان میں اختلاف ہوا اور کشمکش تک نوبت پہنچی، انھوں نے اور ہم نے، دونوں ہی نے اپنی اپنی جگہ اس کو محسوس بھی کیا۔ لیکن اس پوری زندگی میں کوئی ایسا وقت نہیں آیا کہ ہمارے دلوں کا رُخ پھر گیا ہو۔ ایسے ایسے اختلافوں کے باوجود ان کی عظمت کی جو رسّی ہماری گردنوں میں پڑی ہوئی تھی، ہم کبھی اس سے باہر نہ ہو سکے۔

اس موقعے پر آپ سے یہ کہہ دوں کہ میری طبیعت میں ایک طرح کا نقص اور خامی ہے۔ وہ یہ کہ جب تک کسی کی کوئی خصوصیت میرے سامنے نہ آجائے، جو میرے دماغ پر چھا جائے اور میری گردن کو دبا لے، اس وقت تک وہ مجھے اپنے سامنے جھکا نہیں سکتا۔ "میری گردن کی رگیں سخت ہیں۔" میرے سامنے جب کوئی دماغ آتا ہے، تو پہلے میرا

ذہن اس کے خلاف ہی جانا چاہتا ہے، یہاں تک کہ وہ میرے ذہن کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لے۔ چنانچہ جب میں پہلی دفعہ مہاتما جی سے ملا، اس وقت میں ان کا معتقد نہیں تھا۔ میری آنکھوں پر اعتقاد کی پٹی نہ تھی، جو انسان کی آنکھوں کو بند کر دیا کرتی ہے۔ لیکن اس کے بعد ان کی ہر ہر چیز نے ان کی عظمت کو میرے دل میں راسخ کر دیا۔ اور جو دن گزرا میرا اعتقاد ان کے بارے میں بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہم دو آدمیوں کو ان سے انتہائی قرب تھا اور ہمیں بہت طویل موقع ملا۔ وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھے، جس کا ہر ورق کھلا ہوا، ہر سطر روشن، اور ہر لفظ دھلا ہوا اور ہر حرف چمکتا ہوا تھا۔

آج تمام دنیا میں شاید ان ہی کی زندگی ایسی تھی، جس کا ایک حرف بھی چھپا ہوا نہ تھا۔ یہ انسانیت کی عظمت کے لیے سب سے بڑی کسوٹی ہے اور اس معیار پر اترنے والے تمام تاریخِ انسانی میں صرف چند انسان ہوئے ہیں۔ جنھیں آپ اپنی انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔

جن کو تمام دنیا کی حد بندیوں نے الجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ الجھ نہ سکے۔ تمام بندشوں نے ان کا دامن پکڑنا چاہا، مگر وہ گرفت میں نہ آ سکے۔ میرے نزدیک گاندھی جی کی سب سے بڑی عظمت یہی ہے۔

یہ نہ تھا کہ مہاتما جی ہندو نہ تھے۔ وہ بیشک ہندو تھے۔ لیکن انھوں نے ہندو مذہب و دماغ کی ایک نئی تعبیر کی تھی۔ اور ایک نیا زاویہ بنایا تھا، جو تمام حد بندیوں پر چھا گیا تھا۔ اور وہ ایک ایسی جگہ بن گئی کہ نہ وہاں جغرافیہ اور قومیت کی لکیریں چل سکتی ہیں، نہ اور دوسری حد بندیوں کی دیواریں قائم رہ سکتی ہیں۔ یہ وہ بلندی ہے کہ اگر ہمارا دماغ وہاں تک پہنچ سکے، تو اس سے بڑی کوئی خوبی نہیں ہے۔

ہندو مذہب کا پرانا دماغ اور نقشہ جو ہمارے سامنے آتا ہے، اس میں بہت زیادہ وسعتیں تھیں اور جہاں تک میرا مطالعہ ہے، دنیا کے تمام مذاہب میں نظریۂ توحید کو

جس مذہب نے سب سے زیادہ قریب سے دیکھا ہے وہ ہندو مذہب ہے۔ میرے پاس اس کے بہت سے تاریخی شواہد و نظائر موجود ہیں۔ لیکن آج ہندو دھرم کی وہ شکل باقی نہیں ہے۔ اور اس کے بہت سے خانے خالی ہو چکے ہیں۔ ہندو مذہب نے ابتدائی دور میں یونانیوں کو وہ درجہ دیا تھا جو ایک برہمن کا ہوتا ہے۔ صرف اس لیے کہ یونان علم دوست ملک تھا۔ لیکن دوسری جگہ یہ ہے کہ ہندو دماغ گرنے لگا۔ چھوت چھات اور تنگ دماغ پیدا ہو گیا۔ تب ہی سے ہندو دھرم اپنی بلند سطح سے گر گیا۔

گاندھی جی ہندو تھے اور ہندو ہی رہے۔ لیکن انھوں نے ہندو دھرم کی اتنی اونچی جگہ بنائی تھی کہ کہ جب وہ اس بلندی پر سے دیکھتے تھے تو دنیا کے تمام جھگڑے ان کو مٹے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کے سامنے ایک کھلی ہوئی سچائی تھی جو کسی ایک کا ورثہ نہیں ہے، بلکہ سورج اور اس کی شعاعوں کی طرح سب کے لیے ہے۔

پس ہمیں گاندھی جی کی عظمت ان ادنیٰ درجے کی چیزوں میں نہیں ڈھونڈھنی چاہیئے بلکہ پردہ اٹھا کر دیکھنا چاہیے تب حقیقت کا چہرہ صاف نظر آئے گا۔ وہ اتنی بلندی پر تھے کہ دنیا کی کوئی حد بندی ان کا راستہ روک نہیں سکی۔

آج ہم ان کی کوئی بھی یادگار بنائیں، وہ نامکمل ہوگی۔ جب تک کہ وہ ان کی اس سربلندی کو ظاہر نہ کرے۔ اس لیے مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ گاندھی جی کی یادگار اس شکل میں ہونی چاہیے جو مہاتما جی کی اس سربلندی کو ظاہر کرے۔ آنے والی نسلوں کو اپنی خاموش زبان سے بتائے کہ مہاتما جی کا مشن اور مقصدِ حیات یہ تھا۔ جو دنیا بھر کے زائرین کو اپنی زبانِ حال سے گاندھی جی کی عظمت و بلندی کی تاریخ بتا سکے۔

آپ کتنی ہی یادگاریں بنالیں، لیکن وہ بیکار ہیں، جب تک کہ ان کی انگلی اس عالمگیر سچائی کی طرف نہ اٹھے، جو گاندھی جی کے پیشِ نظر تھی۔

خالد الشیخ۔ سفیر تنظیم آزادی فلسطین
مقیم نئی دہلی

امریکی منافقت کا شکار

یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ بیت المقدس، دارالامن ہوتے ہوئے بھی حملہ آوروں کی سفاکیوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ تین آسمانی مذاہب کے ماننے والوں، مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کا یہ مقدس شہر اٹھارہ مرتبہ فتح ہوا اور خاکستر بھی ہوا۔

تین اور چار ہزار سال قبل مسیح میں ایک عرب قبیلہ کنعانیوں کے ایک گروہ نے یروشلم کی داغ بیل ڈالی تھی۔ یہ عرب قبیلہ اسی سرزمین پر آباد ہوا تھا جسے فلسطین کہا جاتا ہے اور جو یروشلم کی پہاڑیوں سے پھوٹتے ہوئے ایک بہت بڑے چشمے کے آس پاس تھا۔ مصر کے دو ہزار قبل مسیح کے آثار قدیمہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کنعانی اور عبوسی قبائل کا اپنا ایک تمدن تھا اور انھوں نے چھوٹی اور گھریلو صنعتیں قائم کر رکھی تھیں اور اس زمانے کے مٹی کے برتن فلزمی (کانسے) دور کے برتنوں کی طرح کے ہیں۔

یروشلم کا پہلا نام ایلیار کھا گیا تھا لیکن کنعانیوں نے اس کا نام یروشلم رکھ دیا۔ اس نام کے پہلے حصے "یرُ" کے معنی ہیں شہر کے اور "سلم" کے معنی ہیں سلامتی یا امن کے۔

۱۳۰۰ قبل مسیح میں پہلی بار یہودی اس شہر میں آئے جب حضرت ابراہیمؑ عراق سے یہاں منتقل ہوئے۔ انھوں نے مصر جاتے ہوئے کچھ دنوں کے لیے یہاں قیام فرمایا تھا۔ ایک ہزار قبل مسیح میں حضرت داؤدؑ کی قیادت میں متحد ہو کر اسرائیلیوں نے یروشلم کو فتح کیا۔

حضرت سلیمان ؑ کے دور حکومت میں اسرائیلیوں نے اپنی سلطنت قائم کی جس کا صدر مقام یروشلم تھا یہ سلطنت کوئی ستتر سال قائم رہی۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ یروشلم میں اس شہر کے قیام کے آٹھ سو سال بعد جس کی بنیاد عربوں نے ڈالی تھی۔ اسرائیلی پہلی بار آئے۔ ان کی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی اور تین صدیوں میں ایک مرتبہ پھر یہودی ایک اقلیت بن گئے۔ اس سارے دور میں یروشلم اور فلسطین دونوں میں عرب نژاد کنعانی اکثریت میں رہے۔

دراصل فلسطین کا نام ہی ان لوگوں کی دین ہے جو کریٹ اور ایجین کے جزائر سے آکر بحیرۂ روم کے ساحل پر اس علاقہ میں آباد ہو گئے یہ سنہ ۱۲۰۰ قبل مسیح کے واقعات ہیں۔ انھیں (PHILISTINES) کہا جاتا ہے جس کا مطلب بیرون ملک سے آئے ہوئے لوگ یا غیر مہذب لوگ ہے۔ لیکن ان لوگوں کو عرب کنعانی قبیلہ نے اپنے اندر سمولیا۔ یہی وہ علاقہ ہے جس کو انجیل مقدس میں کنعان کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

سنہ ۷۲۲ قبل مسیح میں شامیوں نے یروشلم کو فتح کر لیا۔ لیکن سنہ ۵۸۶ قبل مسیح میں بابل کی سلطنت نے یروشلم کو فتح کیا۔ شاہ سلیمان کی تعمیر کردہ عبادت گاہ کو تباہ کیا اور یہودیوں کو قید کر کے بابل لے گئے۔ سنہ ۵۳۹ قبل مسیح میں ایرانیوں نے فلسطین پر قبضہ کیا اور یہودیوں کو واپس آنے کی اجازت دی۔ اس کے عوض یہودیوں نے ایرانیوں کو مصر پر حملہ کرنے میں مدد دی۔ سنہ ۳۲۳ قبل مسیح میں یونانیوں نے فلسطینوں پر حملہ کیا اور یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ سکندر اعظم نے بھی اس علاقہ کو اپنے زیر نگیں لانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اور اس علاقہ پر کنعانی ثقافت، زبان اور تمدن چھائے رہے۔

سنہ ۶۳ قبل مسیح میں رومیوں نے یروشلم کو فتح کیا۔ اس کے بعد ایک ایسا دور آیا جب اس علاقہ کو تھوڑی بہت آزادی حاصل رہی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب حضرت عیسیٰ ؑ نے اپنا پیغام حق سنایا۔ یہودیوں کا کہنا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ کا پیغام یہودیوں کے مذہب ہی کا ایک حصہ ہے لیکن حضرت عیسیٰ ؑ نے اپنا امن اور محبت کا پیغام دیا۔ اس زمانے کے مذہبی جنونیوں کے خلاف حضرت عیسیٰ ؑ نے علم بغاوت بلند کیا جس کے نتیجہ میں انھیں طرح طرح کی

اذیتیں دی گئیں۔ اور انھیں صلیب پر چڑھایا گیا۔ اس دور میں بھی عرب قبیلے کنعانی اور دوسرے مقامی لوگ یہودیوں کے مخالف تھے اور انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کے نئے مذہب کو قبول کر لیا۔ اور رومی جرنیل طیطوس نے آخر کار یروشلم سے یہودیوں کے وجود ہی کو ختم کر دیا۔ ان کی جائیدادیں لوٹ لیں اور وہ عبادت گاہ بھی تباہ کر دی جو ایرانیوں کے دور حکومت میں یہودیوں نے دوبارہ تعمیر کی تھی۔

اس کے بعد چوتھی صدی عیسوی میں اس علاقہ کا اقتدار رومیوں سے بازنطینیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اور ۶۳۷ء میں یہ دور بھی اس وقت ختم ہو گیا جب عرب سے تارکین وطن کا ایک اور ریلا آیا اور فلسطین اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بس گیا۔ یہ یروشلم کے عرب اسلامی دور کا آغاز تھا جو آج تک باقی ہے اب بھی اس شہر میں عربوں کی اکثریت ہے اور عربوں نے اس مقدس شہر کے عرب اسلامی کیرکٹر کو برقرار رکھا ہے۔

ایک اہم بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ ۱۰۰۰ قبل مسیح میں حضرت داؤد کے ہاتھوں فتح یروشلم اور ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کے درمیان تین ہزار سال کا وقفہ ہے۔ (۱۹۴۸ء میں سامراجی سلطنت برطانیہ نے اقوام متحدہ کے غیر آئینی فیصلے کی بنیاد پر اسرائیل کی مملکت قائم کروائی تھی) اس ساڑھے تین ہزار سال کے وقفہ میں یروشلم اور اسرائیل پر یہودیوں نے صرف ستر سال حکومت کی تھی۔ ان ستّر سالوں میں میں یہودیوں پر مصریوں نے کئی قدغنیں لگائی تھیں، اگر ستر سال کی یہ حکومت یروشلم اور فلسطین پر یہودیوں کو حکومت کرنے کا حق دیتی ہے تو ایرانیوں، یونانیوں اور رومیوں کو بھی یہ حق ملتا ہے۔ اور اس دلیل کو قبول کر لیا جائے تو عربوں کو ہسپانیہ پر حکومت کرنے کا حق بھی مل جاتا ہے کیونکہ انھوں نے آٹھ سو سال اس ملک پر حکومت کی ہے۔ اسی طرح سامراجی ممالک کو بھی یہ حق پہنچ جاتا ہے کہ وہ بھی ان تمام ممالک کو اپنا زیر نگیں علاقہ دوبارہ بنا لیں جن کو انھوں نے سابق میں نو آبادیاں بنا رکھا تھا۔ اور چونکہ خود یروشلم پر عربوں نے تیرہ صدیوں حکومت کی ہے لہٰذا یروشلم پر حکومت کا انھیں یہودیوں سے زیادہ حق حاصل ہوتا ہے۔

یہودیوں کے ایک وطن کے لیے برطانیہ کے اعلان بالفور میں جو عہد تھا اس نے

فلسطین اور یروشلم میں یہودیوں کی یلغار کے لیے دروازے کھول دیئے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں سارے فلسطین میں یہودیوں کی تعداد پچاس ہزار کے لیے بھگ تھی؛ در خود یروشلم میں ان کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن سنہ ۱۹۴۸ء میں یروشلم میں یہودیوں کی تعداد اسّی ہزار سے تجاوز کر گئی جو اس شہر کی آبادی کا نصف حصہ تھا۔ اور فلسطین کے سارے علاقہ میں ان کی تعداد ساڑھے چار لاکھ ہو گئی۔

سنہ ۱۹۱۷ء سے سنہ ۱۹۴۸ء کے درمیان برطانیہ کے سامراجی دور نے فلسطین یہودیوں کا اثر و رسوخ بڑھا دیا۔ انگریزوں نے یہودیوں کو مسلح دہشت پسند ٹولیاں قائم کرنے کی ترغیب بھی دی۔ تاکہ وہ فلسطین کو قابو میں کر سکیں۔ انگریزوں کی اس کھلی جانبداری کے باوجود یروشلم میں عربوں ہی کی اکثریت رہی۔ یہودی تو صرف یہودیوں کے محلہ جات میں آباد تھے۔

بونئے یہودی تارکین وطن آئے انھوں نے شہر یروشلم کی دیواروں کے باہر مغرب کی جانب اپنی نئی بستیاں بنائیں اور اسے یروشلم جدید کا نام دیا۔ اور یہ صورت حال سنہ ۱۹۶۷ء تک قائم رہی اس سال اسرائیل نے یروشلم پر جارحانہ جنگ میں قبضہ کر لیا۔ اس سے اسرائیل کو کوئی قانونی یا اخلاقی حق حاصل نہیں ہوتا۔ نیز اسرائیل کے اس اقدام کی عالمی رائے عامہ اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے بھرپور مذمت کی ہے۔ اور مطالبہ کیا ہے کہ اسرائیل یروشلم کے عرب کیرکٹر کو برقرار رکھے۔ ۲۱ مئی سنہ ۱۹۶۸ء کو قرارداد ۲۵۲ منظور کی گئی جس میں اسرائیل کو ہدایت کی گئی کہ اس کے اٹھائے ہوئے اقدامات کو وہ خود مسترد کرے اور ایسے اقدامات سے احتراز کرے جن سے اس شہر کی موجودہ حیثیت میں کوئی فرق آتا ہو۔ اس کے بعد سلامتی کونسل نے ۲۶۷ء، ۲۷۱ء، ۲۹۸ء وغیرہ قراردادیں بھی منظور کیں جن کا مقصد یروشلم کی حیثیت کو برقرار رکھنا ہے۔

لیکن ان قراردادوں پر اسرائیل کا سرکاری ردعمل منفی رہا۔ اور اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل کرنے کے بجائے اسرائیل کی حکومت اور فوج نے مل کر اس مقدس شہر کی عرب حیثیت کو ختم کرنے کے لیے کام کیا۔ عربوں کے گھر ڈھائے گئے۔ شہر کے اندر موجود ان کی زمینات ضبط کر کے غاصبانہ قبضہ میں لی گئیں۔ اور

ان کے محلہ جات کے محلہ جات نیست و نابود کر دیئے گئے۔ اس شہر کی مسلم اور عیسائی مذہبی اور مقدس عمارات کو تباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اور شہر کو ثقافتی اور نظریاتی اعتبار سے "یہود باتے" کا عمل شروع کیا گیا اور شہر کی آبادی میں یہودی غلبہ کے لیے بھی اقدامات کیے گئے۔ اس شہر کو صیہونی بستیوں کے نرغہ میں لے لیا گیا ہے۔

جب سے ۱۹۴۸ء میں صیہونی اور نسل پرست مملکت اسرائیل فلسطین پر غاصبانہ قبضہ کے بعد معرض وجود میں آئی ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ ہر طرح سے اس کی ہمت افزائی کررہا ہے اور ہر طرح کی تائید و امداد دے رہا ہے۔ اس سے بعض دفعہ یہ سوال اٹھتا ہے کہ امریکہ کے نظم و نسق کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہے؟ کیا یہ امریکی انتظامیہ کے ہاتھوں میں ہے یا اسرائیل کے؟ اقوام متحدہ کے منشور اور قرار دادوں اور عالمی رائے عامہ کو برملا ٹھکراتے ہوئے امریکہ اسرائیل کو ہر طرح کے جدید ترین ہتھیاروں سے لیس کر رہا ہے ان میں وہ ہتھیار بھی شامل ہیں جن کو بین الاقوامی طور پر ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

فلسطینیوں کے پناہ گزین کیمپوں اور ہمسایہ عرب ممالک کو امریکی ہتھیاروں کی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسرائیل کی ہر دہشت پسندانہ، توسیع پسندانہ اور جارحانہ کارروائیوں کی پشت پناہی امریکہ کررہا ہے اور وہی اس کی سیاسی حمایت بھی کرتا ہے ایک طرف اسرائیل کے ہاتھوں انسانی حقوق کی پامالی اور منشور اقوام متحدہ کے خلاف ورزیوں کی جانب سے امریکہ چشم پوشی کرتا ہے۔ اور دوسری طرف فلسطینی عوام کے جائز حقوق کی بحالی کے لیے ہونے والی ہر پہل کی بھی امریکہ مخالفت کرتا ہے۔ ان میں فلسطینیوں کے حق خود ارادیت اور حصول مملکت کے حقوق بھی شامل ہیں۔ نیز امریکہ اسرائیل کو معاشی امداد بھی بے تحاشا فراہم کرتا ہے جس کے بغیر یہ صیہونی مملکت کبھی کی اڑاڑا دھم ختم ہوجاتی کیونکہ اس پر معاشی فلاکت کا بوجھ روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ اپنے قیام سے لے کر اب تک اسرائیل کو امریکہ نے ۲۸ ارب ڈالر کی مالی امداد دی ہے۔ اس میں وہ امداد شامل نہیں ہے جو فوجی اور معاشی منصوبوں کے لیے امریکہ نے اسرائیل کو دی ہے۔

امریکہ کی مشرقی وسطیٰ سے متعلق پالیسی میں ہمیشہ سے ایک خفیہ عنصر رہا ہے جو اس کے

علی الاعلان دعووں کے سراسر خلاف ہوتا ہے۔ اس کے قول و فعل میں کبھی بھی یکسانیت نہیں رہا
ہوتی۔ ظاہری طور پر امریکہ بہ بانگ دہل اعلان کرتا ہے کہ اس کے بعض انسانیت پرست
اور اخلاقی اصول ہیں لیکن باطنی طور پر اس کی ایک دوسری پالیسی بھی ساتھ ساتھ روبعمل
رہتی ہے اور اس کے تحت اسرائیل کو اس کی توسیع پسندانہ کارروائیوں میں امریکہ اسے
ہر طرح کی تائید و حمایت سے نوازتا ہے، امریکی پالیسی میں ایسی بے شمار مثالیں موجود
ہیں۔

ان میں سب سے بدنام مثال اس "ریگن پلان" کی ہے جس کا بیروت سے تنظیم
آزادی فلسطین کے انخلا کے فوراً بعد اعلان کیا گیا اور جس کا مقصد عرب دنیا اور تحریک
فلسطین میں تفرقہ ڈالنا تھا۔ اس میں دل برداشتہ عربوں کو یہ جتایا جاتا ہے کہ دریائے
اردن کے مغربی کنارے پر یہودی بستیوں کی آبادکاری کو روکنے کے لیے امریکہ اسرائیل
پر دباؤ ڈالے گا لیکن اسرائیل نے اس "ریگن پلان" کو مسترد کر دیا تو اس پر
دباؤ ڈالنے کے بجائے عربوں پر الزام لگایا کہ انھوں نے اس پلان کو مسترد کر دیا ہے
ساتھ ہی ساتھ امریکہ نے اسرائیل کو سیکڑوں ملین ڈالر کی نہ صرف مزید امداد دی بلکہ
ایک سال بعد اس نے اسرائیل کے ساتھ فوجی معاہدہ بھی کر لیا۔

لبنان کے اتحاد و سالمیت کے بھی امریکہ خلاف ہے بعد میں امریکہ نے اس ملک
اسرائیل کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور امریکہ کی اس مخاصمانہ پالیسی کا مقصد یہ ہے
کہ اسرائیل کو وہ مقاصد حاصل ہو جائیں جو وہ چاہتا ہے یعنی لبنان کے جنوبی علاقہ
پر اسرائیل کا حقیقی معنوں میں قبضہ ہو جائے۔

ایک اور مثال امریکی سفارت خانے کی تل ابیب سے یروشلم منتقلی ہے اس کا مقصد
آنے والے امریکی انتخابات میں یہودیوں کے ووٹ حاصل کرنا ہے۔ امریکی انتظامیہ اس
سلسلہ میں ایک نہایت ہی کامیاب پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ امریکہ نے اپنی کانگریس میں
ایک طویل بحث کی اجازت تو دے دی لیکن دوسری جانب اردن اور سعودی عرب کو
ان کی جائز ضروریات کے مطابق اسلحہ فراہم کرنے سے انکار کر کے اسرائیل کے ہاتھ مضبوط

کر دیئے ہیں۔

اس طرح ریگن انتظامیہ نے عربوں اور اسرائیل دونوں کو مطمئن کر دیا ہے۔ اس نے ایک طرف یروشلم کو اسرائیل کا صدر مقام بنانے کی تجاویز کی مخالفت کر کے عربوں کا دل جیت لیا ہے۔ اور دوسری طرف اس نے اسرائیل کو اربوں ڈالر کی امداد بھی دے دی ہے۔ اور یہ بھی امریکہ کی منافقت کی ایک اور زبردست مثال ہے۔

معاملات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتے۔ ہم یہ حقیقت نظر انداز نہیں کر سکتے کہ وہ دن دور نہیں جب یہودیوں کی توسیع پسندانہ پالیسی کے آگے امریکہ بے بس ولاچار رہ جائے گا۔ اور یہ خطرہ ہر وقت موجود ہے کہ امریکی انتظامیہ اسرائیلی دباؤ کے سامنے سرجھکا دے اور اپنا سفارت خانہ یروشلم منتقل کر کے اس اقدام کے سارے خطرناک مضمرات کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہو جائے۔

اس خطرے سے تمام جمہوری اور امن پسند ممالک اور افراد کو باخبر رہنا چاہیے تاکہ وہ ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہ سکیں۔ اس سلسلہ میں ناوابستہ ممالک کی تحریک پر زبردست ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ امریکی سفارت خانہ کی یروشلم منتقلی سے اس شہر کے اسرائیل کا حصہ بنانے کی اسرائیل کی ناجائز کوششوں کو ایک طرح سے جواز حاصل ہو جائے گا۔ نیز اس سے مستقبل میں مشرق وسطیٰ کے مسئلے کے پرامن حل کے امکانات بالکلیہ طور پر ختم ہو جاتے ہیں۔ نیز فلسطینیوں کے حق خود ارادیت اور اپنی آزاد مملکت کے قیام کے جائز قومی حقوق بھی خطرہ میں پڑ جاتے ہیں۔ یہاں اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ اس سے ساری دنیا کے مسلمانوں اور عیسائیوں کے جذبات کو بری طرح ٹھیس لگے گی اور یہ اقدام جنیوا کنونشن اور اقوام متحدہ کی قراردادوں ــ خصوصاً اقوام متحدہ کی قرارداد ۲۴۲ جس کو خود امریکی حکومت نے پیش کیا تھا ــ کے خلاف جاتا ہے۔

ناوابستہ تحریک کے سربراہ کی حیثیت سے اور فلسطینی کاز اور فلسطینی عوام کے زبردست حامی کی حیثیت سے ہندستان کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ اس

طرح کے خطرناک اقدام کو روکنے کی سعی کرے۔ ہمیں اعتماد ہے کہ مسز اندرا گاندھی کی قیادت میں حکومت ہند ایسے تمام اقدامات کرے گی اور دوسرے عرب اور اسلامی ممالک کے ساتھ مل کر ان اسرائیلی کارروائیوں کی مذمت کرے گی جن کے ذریعہ یروشلم کو اسرائیل کا حصہ بنانے کی اسرائیلی کوششیں بارآور ہوسکیں۔

القدس ـــ عصری حقائق کی روشنی میں

تحریک آزادی فلسطین کے سفیر خالد الشیخ اور پریس ایشیا انٹرنیشنل فورم کے جنرل سکریٹری اختر الواسع یہ واضح کر چکے ہیں کہ اسرائیلی جارحیت کے چنگل میں محبوس شہر قدس یروشلم، مقبوضہ مغربی کنارے (دریائے اردن کے) اور غازہ پٹی میں کیا ہو رہا ہے۔ لہٰذا میں اس کی تاریخ (یعنی پچھلے واقعات) کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔

معاملات بالکل صاف ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان مسائل سے ہم کئی برسوں سے نبرد آزما ہیں ان کی رگ رگ سے ہم واقف ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں اتنے سارے عرب اور غیر عرب ممالک نے اب تک فلسطینیوں کے کاز کے لیے کیا کیا قدم اٹھائے ہیں ہم اور ہمارے عرب دوست یہ بھی جانتے ہیں کہ ان ساری کوششوں کے باوجود ہمیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ فلسطینیوں کے حقوق کی بحالی میں ہمیں رتی برابر کامیابی نہیں ہوئی۔

لہٰذا میرا خیال ہے کہ پوری ایمانداری سے ہم گریبان میں جھانک کر دیکھیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ہمیں ناکامی کیوں ہوئی ہے؟ میں یہ کہنا نہیں چاہتا کہ عرب ناکام ہوئے ہیں۔ کیونکہ میرے خیال میں ناکامی ہماری سب کی ہے۔ نیز میرا خیال یہ بھی ہے کہ دونوں کے درمیان منافقت نہیں ہونا چاہیے اور ہمیں حقائق سے روگردانی نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ جب تک ہم نے حقائق کی تحقیق و تفتیش نہیں کی۔ جب تک ہم نے اپنی کوتاہیوں

اور کمزوریوں کی چھان پھٹک نہیں کی ہمیں پتا ہی نہیں چلے گا کہ ہم کیوں ناکام ہوئے ہیں؟ کیوں اب تک یروشلم آزاد نہیں ہو پایا ہے؟ کیوں اب تک یروشلم کے لوگ، مغربی کنارے کے لوگ، جولان کی پہاڑیوں کے لوگ اور غازہ پٹی کے لوگ تحقیر کا نشانہ بنائے جا رہے ہیں؟ کیوں مغربی کنارے کے معصوم بچوں پر حملے کیے جا رہے ہیں؟ کیوں یونی ورسٹیاں بند ہیں؟ مغربی کنارے پر عربوں کو کیوں وارنٹ کے بغیر گرفتار کر لیا جاتا ہے؟ کیوں انھیں اذیتیں دی جاتی ہیں اور انھیں کیوں جیلوں میں بند رکھا جاتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ سارے سوال پوچھنے چاہئیں اور ان کے جواب تلاش کرنے چاہئیں۔

ہر ایک یہی کہتا ہے، اور صحیح کہتا ہے، اسرائیل نے ہمیشہ سے غیر مصالحانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے، وہ عالمی رائے عامہ کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ فلسطینیوں کے حقوق کے متعلق اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ڈھیر ساری قرار دادیں منظور کی ہیں۔ ان میں کئی ایک مکمل اتفاق رائے سے منظور ہوئی ہیں۔ فلسطینیوں کے حق میں سلامتی کونسل نے بھی جس میں بڑی طاقتیں ویٹو کا اختیار استعمال کر سکتی ہیں۔ پر زور قرار دادیں منظور کی ہیں۔ ان سب کے باوجود تعجب اس بات پر ہے کہ عالمی رائے عامہ اس توانائی اور صاف گوئی کے ساتھ ظاہر کی جا چکی ہے لیکن پھر بھی مقبوضہ عرب علاقوں کے مسئلہ کو حل کرنے میں اس سے کیوں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ کیا بات ہے کہ اسرائیل عالمی رائے عامہ کو قبول نہیں کرتا؟

جواب بالکل واضح ہے۔ مقبوضہ عرب علاقوں میں اسرائیل کی فوجی، توسیع پسندانہ، اور سامراجی پالیسیوں کو ریاستہائے متحدہ امریکہ کی اقتصادی اور فوجی حمایت حاصل ہے۔ ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ جب تک ہم اس سچائی کو خلوص دل سے قبول نہیں کر لیتے، ہم مقبوضہ عرب علاقوں کے مسائل کی تحقیق و تشخیص کر ہی نہیں سکتے۔

مسئلۂ فلسطین میں امریکی الجھاؤ کی تاریخ میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ میں صرف چند حالیہ واقعات کی جانب اشارہ کروں گا۔ ۱۹۸۰ء میں اسرائیل ''نیسٹ'' (KNESSET) (پارلیمان) نے ایک قانون پاس کیا جس کا نام ''بنیادی قانون'' (Basic Law) ہے۔ اس قانون کے تحت عرب یروشلم کو اسرائیل کے علاقہ میں شامل کر لیا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں عرب

یروشلم پر اسرائیلی قوانین نافذ کر دیئے گئے تھے۔ اس نئے قانون کے تحت یروشلم کو اسرائیل کا "دائمی صدر مقام" قرار دیا گیا ہے۔

یہ گویا اشارہ تھا امریکہ نواز ممالک کے لیے کہ وہ اپنے اپنے سفارت خانے تل ابیب سے عرب یروشلم کو منتقل کر لیں۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے فوراً اعلان کیا کہ اسرائیل کی یہ حرکت بین الاقوامی قوانین کے بالکل خلاف ہے۔ نیز ان تمام ممالک سے جنھوں نے اپنے سفارت خانے عرب یروشلم کو منتقل کر لیے تھے سلامتی کونسل نے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے سفارت خانے واپس تل ابیب لے آئیں۔ بعض ممالک نے سلامتی کونسل کی اس ہدایت پر لبیک کہا۔ لیکن امریکہ کا ردعمل کیا تھا؟ امریکی وزیر خارجہ مسٹر ایڈمنڈ مسکی نے ایک بیان جاری کر کے سلامتی کونسل کو ڈانٹ پلائی کہ وہ "غیر متوازن اور غیر حقیقت پسندانہ" قرار دادیں منظور کر رہی ہے۔ اور عربوں نے خاموشی اختیار کر لی!

یا پھر اقوام متحدہ کے تعلیمی، سماجی اور ثقافتی ادارے (UNESCO) کی مثال لیجیے حال ہی میں امریکہ نے نوٹس دے دی ہے کہ وہ اس ادارے سے نکل جائے گا کیوں؟ امریکہ کے سرکاری اور غیر سرکاری بیانات سے بالکل واضح ہے کہ وہ اس ادارے سے اس لیے نکل جانا چاہتا ہے کہ عرب یروشلم میں اسرائیل کی غنڈہ گردی، اس شہر کی تقدیس کی تباہی اور قدیم عمارات کو نیست و نابود کرنے میں اسرائیل کے سیاہ کردار کی اقوام متحدہ کا یہ ادارہ (UNESCO) باقاعدگی کے ساتھ سخت الفاظ میں مذمت کرتا آرہا ہے۔

اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ مقبوضہ عرب علاقوں میں اسرائیل کے کالے کرتوتوں کے خلاف برسوں سے ظاہر کی جانے والی عالمی رائے عامہ سے امریکی خاصے پریشان ہیں۔ اسی سال مارچ (۱۹۸۴ء) میں سینٹر مائی نی ہان نے امریکی سینٹ میں ایک مسودہ قانون پیش کیا کہ اسرائیل میں امریکی سفارت خانہ تل ابیب سے یروشلم منتقل کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی امریکی وہائٹ ہاؤس اور سینٹ میں نورا کشتی شروع ہو گئی۔ وہائٹ ہاؤس کی دلیل یہ ہے کہ اس سے امریکہ کے دوست عرب ممالک ناخوش ہو جائیں گے۔

یہ سب بکواس ہے۔ امکان یہ ہے کہ ریگن امریکی سفارت خانہ عرب یروشلم کو منتقل نہیں کریں گے لیکن اس واقعہ سے وہ ضرور فائدہ اٹھائیں گے اور اپنے عرب دوستوں پر یہ واضح کردیں گے کہ امریکہ نے عربوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ عرب یروشلم میں رتی برابر کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ امریکہ کے دیئے ہوئے پیسے اور ہتھیاروں کی مدد سے اسرائیل نے عرب یروشلم پر قبضہ کیا ہے۔ اور اس حقیقت میں امریکی سفارت خانے کے محل وقوع سے کوئی فرق نہیں آئے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کیا کریں؟ میں نہیں سمجھتا کہ یہ صرف عربوں کی ذمہ داری ہے بلکہ یہ تو عربوں، ہندستانیوں اور ناوابستہ تحریک کی مشترکہ ذمہ داری ہے لہذا ہمیں کیا کرنا چاہیے اور اس صورت حال سے بچ نکلنے کا کیا طریقہ ہوگا؟

توجہ کے قابل پہلی بات تو یہ ہے کہ عالم عرب میں اختلافات ان لوگوں کے درمیان نہیں ہیں جو فلسطین کے مسئلہ کا سیاسی حل چاہتے ہیں اور جو اس کے لیے جنگ لڑنے کے حق میں ہیں۔ اس طرح کا تجزیہ مغربی ممالک کے اخبارات گمراہ کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ اصل تفریق ان دو فریقین کے درمیان ہے جن میں سے ایک بہر قیمت اسرائیل سے سیاسی سمجھوتہ کرنا چاہتا ہے اور دوسرا انصاف کی بنیادوں پر اسرائیل کے ساتھ سیاسی سمجھوتے کا خواہاں ہے۔ اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عربوں میں تفریق جنگ پرستوں اور امن پسندوں کے درمیان نہیں ہے۔

سابق صدر سادات ان لوگوں میں سے تھے جو بہر قیمت اسرائیل سے سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے انھوں نے اپنا علاحدہ راستہ اختیار کیا اور اسرائیل کے ساتھ علاحدہ صلح کرلی۔ میں نے اس سے پہلے بھی کہا ہے اور اب بھی دہراتا ہوں کہ ایک مقتدر اعلا مملکت کی حیثیت سے مصر کو اپنے علاقہ جات، اور سرحدوں کے بارے میں کسی ملک کے ساتھ کسی طرح کا بھی معاہدہ کرنے کا حق اور اختیار حاصل ہے۔ لیکن کیمپ ڈیوڈ معاہدے اور مصر و اسرائیل کے امن معاہدے میں جو بات ناقابل قبول ہے وہ یہ ہے کہ ان معاہدوں کے تحت سابق صدر سادات نے فلسطینیوں کے حقوق کا سودا کیا ہے۔ اس

طرح فلسطینیوں کے حقوق بیچ دینے کا اختیار نہ سادات کو تھا اور نہ مصر کو، انھیں یہ حق نہیں تھا کہ وہ مغربی کنارے اور غازہ پٹی کی قسمت کا فلسطینیوں کی مرضی کے خلاف فیصلہ اسرائیل کے ساتھ معاہدے کے تحت کر بیٹھیں۔

ان ساری باتوں کا نتیجہ کیا ہوا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ مصر کے ساتھ سمجھوتہ کرکے اسرائیل نے یہ محسوس کیا کہ وہ فلسطینیوں اور شمال اور مشرق میں ہمسایہ عرب ممالک پر چڑھ دوڑنے کے لیے آزاد ہے اگر کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ نہ ہوتا تو جون ۱۹۸۱ء عراق کے ایٹمی ری ایکٹر پر حملہ کرنے کی اسرائیل کو جرأت نہ ہوتی۔ جولائی ۱۹۸۱ء میں بیروت پر دو ہفتوں تک مسلسل بمباری کرنے اور ہزاروں معصوم شہریوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کی اسرائیل کو ہمت نہ ہوتی۔ دسمبر ۱۹۸۱ء میں جولان کی پہاڑیوں پر اسرائیل کو قبضہ کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ اور لبنان کا وہ حشر نہ ہوتا جو اسرائیل نے کر رکھا ہے۔ یہ سب تلخ نتائج ہیں کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے۔

اب اس کا متبادل کیا ہے؟ متبادل یہ ہے کہ مبنی بر انصاف سمجھوتے کے لیے جدوجہد جاری رکھی جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ عربوں کے ایک دوست کی حیثیت سے میں صاف گوئی سے کام لے سکتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے عرب دوستوں نے منصفانہ سمجھوتے کے لیے جدوجہد پر اتنا زور نہیں دیا ہے جتنا وہ دے سکتے ہیں۔

پچھلی دہائی (دس سال) میں بین الاقوامی مالیاتی میدان میں عربوں کا زبردست اثر و رسوخ پیدا ہو گیا ہے۔ اور اس اثر و رسوخ کے ذریعہ امریکہ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ جبکہ امریکہ اربوں ڈالر اسرائیلی خزانے کو فراہم کر رہا ہے۔ وہ اسرائیل کو مسلح کر رہا ہے اور یہ ہتھیار ہزاروں عرب مرد عورت اور بچوں کو ہلاک کرنے کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ امریکہ نہ صرف اسرائیل کو عرب علاقے فتح کرنے میں مدد دے رہا ہے بلکہ مفتوحہ عرب علاقوں میں اسکی کالونیاں بسانے کی پوری تائید کر رہا ہے۔ اس امریکہ کو لگام دینے کے لیے عربوں نے کچھ نہیں کیا۔

اس سارے معاملہ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ عرب دنیا کی دولت جو امریکہ حاصل کر رہا ہے اس کا ایک حقیر سا حصہ وہ اسرائیل کو بطور خیرات دے رہا ہے۔ اور یہ افسوس ناک

صورت حال ہے اور جب تک عرب ممالک اپنی اس غلطی کا ازالہ نہیں کریں گے اس وقت تک اسرائیل عرب یروشلم اور دوسرے علاقوں پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرے گا۔ امریکہ پر عربوں کو یہ واضح کر دینا چاہیے کہ اسرائیل کی مدد کرنے سے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم باقی سارے ممالک فلسطینیوں کے جائز حقوق کے لیے اور کچھ نہ کریں۔ اب تک ہم نے اپنی سرگرمیاں قرار دادیں منظور کرنے اور اقوام متحدہ میں اپنی تشویش کا اظہار کرتے تک محدود کر رکھی ہیں لیکن اس سے ہمیں زیادہ فائدہ نہیں ہوا ہے۔

صورت حال خطرناک ہے۔ اسرائیل اور امریکہ فلسطین پر اپنی مرضی مسلط کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ عرب یروشلم اور دوسرے عرب علاقوں پر اسرائیل کے قبضے کو ایک حقیقت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنے کی انھوں نے تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔ اگر اس کو روکنا مقصود ہے تو عربوں کو اپنی بات منوانے کے لیے ٹھوس قدم اٹھانا ہوگا اور ہم ناوابستہ ممالک کو عربوں کی بھرپور حمایت کرنی ہوگی۔ اور اسرائیل کے ناپاک عزائم کو ناکام بنانے کے لیے نئے طریقے دریافت اور اختیار کرنے ہوں گے۔

پروفیسر محمد شفیع اگوانی
قائم مقام وائس چانسلر جواہرلال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی

دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی
مدیر اعلا پریس ایشیا انٹرنیشنل، نئی دہلی ۱۱۰۰۴۹

شہرِ مظلوم و مقدس

دشمنوں کے محور میں محصور

بیت المقدس دنیا کے بڑے شہروں میں سب سے قدیم، سب سے مقدس اور سب سے خوبصورت شہر ہے۔ اس کی تاریخ سچ مچ خون سے لکھی ہوئی ہے۔ اس کی ایک ایک اینٹ انسان کے ناقابل تسخیر جذبۂ قربانی یا حاکموں کے ظلم کی شہادت دیتی ہے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے خون سے اس کو تقدس بخشا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج مبارک بھی یہیں سے ہوئی۔

یروشلم ہمارے نزدیک اس لیے بھی مقدس ہے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کا دارالخلافہ تھا۔ خود یہودیوں کی تاریخ میں اس تاریخ بہت ہی مختصر رول رہا ہے لیکن بنی نوع انسان کے مفتخورنے میں اس کا بڑا حصہ رہا ہے۔ صدیوں سے دنیا کی دو تہائی آبادی یعنی مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے یہ شہر روحانی رہنمائی کا منبع رہا ہے۔

اسلام اور مسیحیت نے ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کے تانے بانے میں جو رول ادا کیا ہے اس پر ہم ہندستانیوں کو فخر ہے۔ بھارت میں چودہ کروڑ مسلمان اور ایک کروڑ عیسائی بستے ہیں۔ بیت المقدس کو اس ملک کے پندرہ کروڑ باشندے مقدس مانتے ہیں۔ لہٰذا اس شہر پر جو بھی گزرتی ہے اس سے ہمیں تشویش اور لگاؤ ہے۔

لیکن بیت المقدس کی بازیابی کے لیے ہندستان کی جدوجہد کی اصل وجہ صرف یہی نہیں ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یروشلم دنیا کا سب سے مظلوم شہر ہے۔ اس پر بیرونی طاقتوں کا قبضہ ہے جو اس کے روحانی کردار کو ملیا میٹ کر دینا چاہتی ہیں۔ یہ طاقتیں اس شہر کی تاریخ، ماحول اور مکینوں تک کو تبدیل کر دینا چاہتی ہیں۔ شہری منصوبہ بندی کے جھوٹے بہانے بنا کر تاریخی اہمیت کے قدیم مقامات کو بلڈوزر چلا کر نیست و نابود کیا جا رہا ہے۔

مسجد اقصیٰ کی اہمیت نہ صرف اس لیے ہے کہ دنیا کے تعمیراتی ورثہ میں یہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اس لیے بھی کہ یہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی تیسری سب سے مقدس مسجد ہے اور یہ اسرائیلی غنڈہ گردی کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ ۱۰ اگست ۱۹۸۴ء کو "انٹرنیشنل ہیرلڈ ٹرائی بیون" نے اطلاع دی کہ اسرائیلی انتخابات کے بعد طاقتور صیہونی گروہ مسجد اقصیٰ کے بیرونی ڈھانچے کو بلکہ اس کے صحن کے ایک وسیع حصہ کو بھی منہدم کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ بظاہر یہ اقدام معبد سلیمانی کی از سر نو تعمیر کے لیے ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ معبد تین ہزار سال قبل منہدم کیا گیا تھا۔ اقوام متحدہ کے مختلف اداروں بشمول یونسکو کی سو سے زیادہ قرار دادیں یہ شہادت دیتی ہیں کہ صیہونی قابضین، صدیوں سے مقیم عربوں کو قدیم شہر یروشلم سے زبردستی بے دخل کر رہے ہیں۔ اس شہر کے مشرقی علاقہ پر اسرائیل نے ۱۹۶۷ء میں قبضہ کیا تھا لیکن اس پر بلڈوزر چلا کر اس کو صیہونی بستیوں کی تعمیر کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔

اقوام متحدہ کی بے شمار قرار دادوں کی منظوری کے باوجود صیہونی غنڈہ گردی کو لگام نہیں لگائی جا سکی۔ جیسے کہ اس سے پہلے بعض دوستوں نے اپنی تقریروں میں نشان دہی کی ہے یروشلم ظلم و استبداد کے خلاف انسانیت کے جہاد کا سمبل بن چکا ہے۔ اور یہ جہاد سامراج کی باقیات کے خلاف ہے جو ہندستان کی آزادی کے ساتھ شروع ہوا اور جاریہ صدی کے اختتام تک اس نا تمام انقلاب کو یروشلم کی بازیابی

کے ساتھ مکمل کرنا اس جہاد کا مقصد ہے۔ جب تک سامراجیت کے یہ بدنما داغ باقی ہیں ہندستان کی آزادی نامکمل رہے گی۔ جب ان کو مٹا دیا جائے گا تو اس کرۂ ارض کا خوبصورت چہرہ ابھر آئے گا۔

دنیا کی ۹۵ فیصد آبادی ــ اور خصوصاً ہم ہندستانیوں ــ کے لیے یروشلم کسی بحث کا موضوع نہیں ہے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں مہاتما گاندھی نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ جس طرح انگلینڈ ان انگریزوں کا اور فرانس فرانسیسیوں کا ہے اسی طرح یروشلم عربوں کا ہے۔

برصغیر ہندستان کے ایک اور عظیم سپوت، ڈاکٹر محمد اقبال نے جو بیسویں صدی کے دنیا کے سب سے بڑے شاعروں میں گنے جا سکتے ہیں، فلسطین پر صیہونیوں کے دعووں کا مسکت جواب دیا تھا۔ ضرب کلیم میں انھوں نے کہا ہے ؎

ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا؟
مقصد ہے ملوکیت انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں نارنج کا یا شہد و رطب کا

اس طرح ہندستان ہمیشہ سے فلسطین کے مسئلہ سے متعلق رہا ہے اور اب ناوابستہ برادری کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے اور جنگ آزادی اقوام کے وارث کی حیثیت سے ہندستان کے قومی مفادات ہمارے عرب دوستوں کی جدوجہد کے ساتھ منسلک ہیں۔ یہ ہمارا اپنا قومی مفاد ہے کہ ہم فلسطین کی جدوجہد کو ہندستان کے قومی مقاصد کا ایک حصہ بنا لیں۔ ہمیں اس مفروضے کو بھی خیرباد کہہ دینا چاہیے کہ ہندستان بھی صرف اسی حد تک جا سکتا ہے (فلسطین کے مسئلہ کے حل کے لیے) جہاں تک عرب ممالک کی حکومتیں جانا چاہیں گی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض عرب حکومتیں فلسطین پر عرب حقوق کے حصول کے لیے موثر اقدامات کرنے میں بطورِ خاص القدس کو آزاد کرانے میں پس و پیش کرتی ہوں۔ لیکن یہ موقع ان وجوہات کی تفصیل میں جانے کا نہیں بلکہ یہ سوچنے کا ہے کہ ہندستان کیا کرے۔

جوبات انتہائی اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ فلسطین کے مسئلہ میں ہندستان کا

مقصد اس کے اپنے قومی مفادات کے قومی تصور کا ایک حصہ ہونا چاہیے۔ یہ صرف دوستوں کے ساتھ اتحاد کا مظہر نہیں ہے۔ فلسطین کے معاملہ میں ہندستان کا مقصد ہندستان اور انفرادی عرب ممالک کے درمیان تعلقات سے علاحدہ سطح پر ہوگا۔ اور یہ عرب حکومتوں پر بین الاقوامی واقعات کے پس منظر میں ان کی اپنی رقیاتی سرگرمیوں کے طے کردہ مدارج سے پیش آنے والی مجبوریوں سے بھی متاثر نہیں ہوگا۔ یہ واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ شہر مقدس پر جن طاقتوں نے جارحانہ قبضہ جما رکھا ہے، وہ ہندستان کے لیے بھی ایک راست خطرہ کا روپ دھار رہا ہے۔ ہماری جغرافیائی سالمیت، سیکولر کردار اور قومی اقتدار اعلا کو ہمارے پڑوس سری لنکا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے شدید خطرہ لاحق ہے۔ جنوبی ہند کی سرحدوں سے صرف تیس چالیس میل پرے اسرائیلی خفیہ "موسعد" سری لنکا میں اپنے قدم جما چکا ہے۔ اس کا اگلا نشانہ ہندستان ہوگا۔ صیہونی سازشوں کا خطرہ ہمارے دروازوں پر کھٹکا دے رہا ہے۔ ہمارے ساحل اس کے تھپیڑوں میں آچکے ہیں۔

سنہ ۱۹۷۶ء میں تنظیم آزادی فلسطین کے سربراہ یاسر عرفات نے کہا تھا کہ "ہم (فلسطینی اور ہندستانی) ایک ہی خندق میں ہیں اور ہم پر برسنے والی گولیاں ایک ہی جگہ سے آرہی ہیں"، وہ بیروت میں تنظیم آزادی فلسطین کے ہیڈ کوارٹرس میں متورما دیوان اور اس خاکسار کی فلسطینی کاز کے لیے ناچیز خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے "آرڈر آف پیلیسٹائین اسٹرگل" (Order of Palestine Struggle) کا اعزاز عطا فرمار ہے تھے۔ یاسر عرفات نے عالمی صورت حال کو جانچنے کے ہندستانی اور عرب پیمانوں کی یکسانیت پر زور دیا تھا۔ پچھلے آٹھ سال میں جو واقعات پیش آئے ہیں ان سے یاسر عرفات کے الفاظ کی صداقت خود بخود عیاں ہو جاتی ہے۔ انھوں نے کہا تھا:-

"ہمارے ہندستانی بھائی ہمیشہ یہ یاد رکھیں تو اچھا ہے کہ ہندستانی اور عرب ایک ہی خندق میں بیٹھے ہیں۔ آج جو گولیاں (دشمن کی بندوقوں سے) ہم پر برس رہی ہیں وہ ایک ہی جگہ سے آرہی ہیں۔ ہم دونوں (قوموں) کے عوام ایک ہی (فوجی) حکمت عملی کے مارے ہوئے ہیں۔ ایک ایسی حکمت عملی کے جس کو عالمی سامراج کی قوتوں نے تیار بھی کیا ہے اور اسے روبعمل

بھی لا رہے ہیں۔

"جس ہاتھ نے میرے وطن پر غاصبانہ قبضہ کر لینے میں اپنے پٹھوؤں کی مدد کی ہے وہی ہاتھ آج آپ کے عوام کی تقدیر پر قابض ہونے کے لیے پیچ وتاب کھا رہا ہے۔ ہم عرب صرف صیہونی سامراجیت کا مقابلہ نہیں کر رہے ہیں۔ ہم دنیا کی سب سے زیادہ جارحانہ جنگی مشنری کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اور وہ ہے ریاستہائے متحدہ امریکہ!

"جن ہتھیاروں نے فلسطینی عوام کو اپنے وطن پر اپنے جائز حقوق سے محروم کیا ہے وہی ہتھیار آج سارے ایشیا، سارے افریقہ اور سارے لاطینی امریکہ کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔"

دراصل صورت حال یہ ہے کہ عربوں کے وطن اور ہندستان کے لیے خطرہ بحرہند کے دونوں ساحلوں پر موجود ہے اس سمندر میں ہتھیاروں کا زبردست ذخیرہ جمع ہو رہا ہے اور اسرائیل اور جنوبی افریقہ کی صیہونی اور نسل پرست حکومتوں کی جانب سے خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ عرب اور ہندستانی ان کے حملوں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ لبنان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان دونوں قوموں اور امریکہ کے گٹھ جوڑ کے بغیر ناممکن تھا۔

مغربی سامراجیت کے اور صیہونی گٹھ جوڑ کی سازشوں کا راست نشانہ ہندستان ہے اور ان سازشوں سے ہندستان کو زبردست خطرہ لاحق ہے۔ ہماری تاریخ میں کبھی بھی ہم اتنے بڑے خطرے سے دوچار نہیں تھے جتنے کہ آج ہم اس جانب سے ہیں۔

ذرا اس معاملہ کی گہرائی میں جاکر دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ آج نامی بیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ لبنان میں جو کچھ ہو چکا ہے اور شام وار دن میں کل کیا ہونے والا ہے اس کا گہرا تعلق اس امر سے بھی ہے کہ سری لنکا میں کیا ہو رہا ہے، پنجاب میں حال ہی میں جو کچھ ہوا اور جنوبی بھارت میں کیا کچھ ہونے جا رہا ہے۔

وزیر اعظم راجیو گاندھی نے بجا طور پر اس امر پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ سری لنکا جیسے ہمسایہ ملک کے سلامتی کے اداروں میں بدنام زمانہ اسرائیلی جاسوسی کی ایجنسی "موساد" کا عمل دخل شروع ہو گیا ہے۔ بھارتی پارلیمان میں اپنے بیان میں انھوں نے اس

انتہائی خطرناک صورت حال کی جانب اشارہ کیا جو سری لنکا میں اسرائیلی جاسوسی ایجنسی "مسعد"، اور برطانوی جاسوس ادارے "ایس۔ اے۔ ایس" (SAS) کی سرگرمیوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے

بھارت کو چاروں طرف سے گھیرے میں لینے کی سازش اس طرح پایہ تکمیل کو پہنچے پائی گئی کہ ۱۲ اگست کو امریکی اخبار رساں ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس (اے۔ پی) نے اطلاع دی کہ جنوبی افریقہ کا ایک بی سی۔ آٹھ (BC-8) طیارہ بھاری مقدار میں اسلحہ لے کر کولمبو کی طیران گاہ پر اترا۔ کولمبو کے ہوائی اڈے کے ذرائع نے اے پی کو بتایا کہ جنوبی افریقہ کے ہتھیاروں کی سری لنکا کو فراہمی اس منصوبے کا ایک حصہ ہے جو سری لنکا نے اسرائیل اور برطانوی جاسوسی ادارے SAS کی مدد سے تامل باغیوں کی بیخ کنی کے لیے تیار کیا ہے

سری لنکا کے لیے جنوبی افریقہ کے ہتھیاروں کی سپلائی کوئی الگ تھلگ واقعہ نہیں بلکہ یہ ایک جاری و ساری سازش کا ایک حصہ ہے، اس کا ثبوت حال ہی میں کولمبو میں برطانوی ہائی کمیشن میں جنوبی افریقہ کے دو گورے افسروں کی موجودگی سے بھی ملتا ہے۔ یہ خبریں بھی مستند ذرائع سے ملی ہیں کہ سری لنکا کا ایک وفد ہتھیاروں کی تلاش میں پریٹوریا گیا ہوا تھا، یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ برطانوی جاسوسی ادارے (SAS) میں جنوبی افریقہ کے ان گوروں کی بھاری تعداد موجود ہے جو افریقہ کے (سیاہ فام) عوام کو دہشت گردی اور ایذا رسانی کے سوچے سمجھے منصوبوں کے ماہر ین ہیں۔ اسرائیل کے سابق وزیر دفاع شارون (SHARON) نے بڑے فخر کے ساتھ کہا تھا کہ ان کی جاسوس ایجنسی "مسعد" دنیا کے مختلف ممالک بشمول جنوبی افریقہ میں دہشت گردوں کا مقابلہ کرنے والے جتھوں کو تربیت دے رہا ہے۔

بات اب مکمل طور پر واضح ہو جانی چاہیے۔ مغربی سامراجیت، صیہونی جنون اور جنوبی افریقہ کی نسل پرستی کا گٹھ جوڑ صرف افریقہ اور عرب کی سرزمین تک محدود نہیں ہے۔ سابق وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے نہر سویز پر مغرب کی جارحیت کے موقع پر

پر کہا تھا" اب وہاں جو کچھ ہوا ہے اس کی ہمارے لیے زبردست اہمیت ہے۔ یہ ہم پر کل بیت سکتی ہے!" ان الفاظ کی سچائی ثابت کرنے کے لیے اٹھائیس سال لگے ہیں۔

خطرے کی سنگینی کا احساس اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ ایک اسرائیلی باشندہ جو "موساد" کا کارکن ہے۔ جولائی ۱۹۸۴ء کے آخری ہفتہ میں تامل ناڈو ریاست کے تنجاور ضلع میں پکڑا گیا مجھے پتا چلا ہے کہ اس شخص سے جو پوچھ گچھ جاری ہے۔ اس کی تفصیلات ملک کی سلامتی کی خاطر صیغۂ راز میں رکھی جارہی ہیں۔ لیکن اس امر کی کافی شہادت موجود ہے کہ یہ شخص تامل ناڈو میں بدامنی پھیلانے کے ایک منصوبے پر کام کر رہا تھا ۱۹۸۴ء میں مدراس کے ہوائی اڈے پر بم کا دھماکہ اس اسرائیلی جاسوس کی گرفتاری کے ایک ہفتہ کے اندر اندر پیش آیا۔ تامل متحدہ محاذ آزادی کا کہنا ہے کہ تامل باشندوں میں جو اپنی بقا کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں کافی اسرائیلی جاسوس گھس آئے ہیں اور یہ جاسوس تامل ناڈو اور جنوبی بھارت کے مختلف حصوں میں بدامنی پھیلا رہے ہیں تاکہ ہندستان کو جو ابھی ناوابستہ تحریک کا سربراہ ہے بدنام کیا جاسکے۔ مدراس کے ہوائی اڈے کا دھماکہ انھیں سازشوں کے نتیجہ کی ایک مثال ہے۔

اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ امریکی خفیہ سروس "سی آئی اے" (CIA) اور "موساد" کا گٹھ جوڑ سنگاپور میں ایک تجارتی ادارے کا روپ دھار کر ابھرا ہے۔ یہ ادارہ ناکارہ کاغذ کا بیوپار کرتا ہے اور اس کاغذ کے گٹھوں میں قرآن مجید کے اوراق بھی ٹھونسے جاتے تھے تاکہ مسلمان ان اوراق کی بے حرمتی ہوتے دیکھیں تو مشتعل ہو جائیں۔ غیر مسلم ان اوراق کے تقدس اور اہمیت سے نابلد ہوتے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس تجارتی کمپنی کا تعلق اسرائیلیوں سے بھی ہے اور اس نے ملیشیا، سری لنکا بنگلہ دیش کو بھی سال بھر پہلے اسی طرح کے کاغذوں کے گٹھے بھیجے تھے جن میں کلام مجید کے پھٹے ہوئے اوراق شامل تھے۔

کلکتہ کی بندرگاہ پر قرآن کے ان اوراق کو دیکھ کر مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ ہو گئے تھے اور حکام کی بروقت مداخلت کی وجہ سے ایک بلا ٹل گئی ورنہ یہاں بمبئی اور بھیونڈی سے

زیادہ خطرناک فسادات ہو جاتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات صرف بیرونی سازشوں کا نتیجہ ہیں۔ ان کے لیے بنیادی طور پر، ہم خود ذمہ دار ہیں۔ لیکن ہماری ذمہ داری یہ بھی کہ ہم اس طرح کی سازشوں کا قلع قمع کر دیں۔

خود پنجاب میں بھی واضح آثار موجود ہیں کہ امریکی جاسوسی ادارہ سی آئی اے پورے جوش و خروش کے ساتھ سرگرم عمل ہے اور برطانیہ، کناڈا اور مغربی جرمنی میں اس کی شاخیں موجود ہیں اور اپنا کام کر رہی ہیں۔ اس کا ثبوت اس امر سے بھی ملتا ہے کہ امرتسر میں گولڈن ٹمپل میں فوجی کارروائی کے دوران جو ہتھیار اور دوسرا جنگی سازوسامان برآمد ہوا اس میں اسرائیلی ساخت کے زرہ بکتر بلٹ پروف جاکٹ (Bullet Proof Jacket) برآمد ہوئے تھے۔ حکومت ہند نے پنجاب پر جو قرطاس ابیض جاری کیا تھا اس میں یہ واضح اشارے ملتے ہیں کہ پنجاب کی ٹریجڈی میں اسرائیل کا ہاتھ ہے۔

سری لنکا میں، مسعد، جنوبی افریقہ، سی آئی اے اور ایس اے ایس کا جال بچھا ہوا ہے اور ان کا پہلا ہدف سری لنکا کی تامل آبادی کو صفحۂ ہستی سے مٹانا ہے لیکن یہ بھارت کے لیے ایک دردناک کہانی کا حرف اول ہے۔ طویل المیعاد منصوبے کے تحت ان کا اصل ہدف بھارت اور بحر ہند کے ساحلوں پر واقع ممالک کو غلام بنانا ہے۔ اور سری لنکا کو ایک ایسے بنیادی اڈے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے جہاں سے بھارت کے خلاف کارروائی کی جائے۔ اور پھر مالدیپ، ملیشیا، برما اور دوسرے ممالک کے خلاف کارروائی کے لیے راستہ صاف کیا جائے۔ سری لنکا میں ٹرنکومالی میں امریکہ کا بحری اڈہ موجود ہے اور امریکی نشریاتی ادارے "وائس آف امریکہ" (VOA) کے لیے بھی ایک اڈہ مہیا کیا گیا ہے اور ان سب کا ہدف بھارت ہے، مسعد، جنوبی افریقہ، سی آئی اے اور ایس اے ایس کا گٹھ جوڑ ہمیں یہ بات یاد دلاتا ہے کہ یہ خطرات ہمیں ایک طویل عرصہ تک لاحق رہیں گے اور انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اسرائیل اور امریکہ کے درمیان جاسوسی کے رازوں کے تبادلے کا جو معاہدہ ہوا ہے اس کا دائرہ عمل عرب دنیا تک محدود نہیں رہے گا اس کے دائرہ کار میں وہ معاملات بھی

آئیں گے جن کا ہندستان سے متعلق ہے اور جن کی ہندستان کے لیے اہمیت ہے۔

بھارت کی جغرافیائی سالمیت کے خلاف اسرائیل کی سازشیں پنجاب، تامل ناڈو مغربی بنگال اور دوسرے علاقوں تک محدود نہیں ہیں جہاں بار بار فرقہ وارانہ کشیدگی ابھر آتی ہے اور فسادات ہوتے رہتے ہیں، پچھلے بیس سال میں اسرائیل میزورام اور ناگالینڈ میں بھی اپنی سازشوں کا جال پھیلائے ہوئے ہے۔ ان ریاستوں کا دورہ کرتے ہوئے یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ ان ریاستوں میں کئی نوجوانوں کی انجمنیں ہیں جن کا نام "چلڈرن آف دی زیان" صیہونیت کی اولاد (Children of Zion) ہے!

مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ ان اداروں کو ریاستہائے متحدہ امریکہ اور کناڈا کے بعض ذرائع سے خیرات اور تعلیم کے لیے گرانٹس (عطیہ جات) کے طور پر بھاری رقوم ملتی ہیں۔ حالانکہ میزورام اور ناگالینڈ میں کہیں بھی یہودی آبادی نہیں ہے لیکن بعض امریکہ پرست ہندستانی اور بیرونی تبلیغی مشن میزو اور ناگا قبائلیوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ یہودیوں کے بعض گمشدہ قبائل کی اولاد سے ہو سکتے ہیں۔ اس گمشدہ قبائل کی تھیوری کو اسرائیل کے قیام کے بعد کشمیر میں بھی پھیلایا جا رہا ہے۔

ناگالینڈ اور میزورام کی طرح کشمیر میں بھی برسوں سے بعض نام نہاد محققین یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کشمیری یہودیوں کی اولاد ہیں۔ اسرائیل اور مغربی ممالک کے نفسیاتی جنگ وجدال کے ماہرین تیسری دنیا کے ممالک میں لوگوں کے دماغوں میں اپنے خیالات بٹھانے کی جو کوششیں کر رہے ہیں اس کی یہ ایک مثال ہے۔ "صیہونیوں کی اولاد" کی تھیوری کا جس طرح پرچار کیا جا رہا ہے اس کو اگر ہم ہندستانیوں نے نظر انداز کر دیا تو اس کے نتائج ہمارے لیے انتہائی خطرناک ہوں گے۔

یہاں یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ ناگا اور میزو قبائل کے نوجوانوں کو قوم دشمن سرگرمیاں شروع کرتے اور جاری رکھنے کے لیے یہ لالچ دے کر ورغلایا گیا کہ انھیں

امریکہ اور کناڈا میں پناہ دی جائے گی۔ ان میں سے بھٹکے ہوئے بعض قبائلی نوجوان جب پکڑے گئے تو انھوں نے بتایا کہ انھیں تخریب کاری کی تربیت اسرائیلی ماہرین نے دی تھی غالباً اسرائیل ہی میں۔ ان میں سے بعض نے اسرائیل، امریکہ اور کناڈا میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے وجود کا دعوے کیا۔ انھیں "دوستوں اور رشتہ داروں" کے ذریعہ بھاری رقوم اور قیمتی تحائف ان قوم دشمن عناصر کو بھیجے گئے۔ سنہ ۱۹۷۹ء اور سنہ ۱۹۸۲ء کے درمیان ان شمالی مشرقی ریاستوں کے دوروں کے موقع پر میں نے ان سارے واقعات کی تفصیلی رپورٹیں بھیجی تھیں اور ملک بھر کے اخبارات میں یہ رپورٹیں چھپی تھیں بھارت کے سب سے کثیر الاشاعت ہفتہ وار "بلٹز" نے ان رپورٹوں کو بڑی اہمیت دے کر شائع کیا تھا۔ جن مجرموں کی ان رپورٹوں میں نشاندہی کی گئی تھی انھوں نے کسی رپورٹ کی تردید نہیں کی

ان سازشوں کے جواب میں ہندوستان کو کم از کم اس اسرائیل قونصل خانے کو بند کر دینا چاہیے۔ جو بمبئی میں قائم رکھا گیا ہے۔ یاد رہے کہ اس قونصل خانے نے ہندستان کے وزیر اعظم مرارجی دیسائی اور اسرائیلی وزیر دفاع موشے دایان کی خفیہ ملاقات کا انتظام کروایا تھا۔ جو ہندستان کی روایتی امور خارجہ کی پالیسی کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ یہ ملاقات جو پارلیمنٹ اور عوام سے چھپائی گئی تھی ملک سے غداری کے ضمن میں آتی ہے۔ یا کم از کم پارلیمان کے استحقاق کو مجروح کرتی ہے۔ اس قونصل خانے کو بند کرنے سے نہ صرف قوم دشمن عناصر کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے میں مشکلات پیدا ہوں گی بلکہ ہمارے عرب دوستوں کو بھی اس سے خوشی ہو گی۔

یہ ساری باتیں کہنے کے بعد بڑے دکھ کے ساتھ یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ سری لنکا میں اسرائیل نے جو پیش قدمی کی ہے اس کے تئیں عرب ممالک اور تیسری دنیا کے دوسرے ممالک کا ردعمل خاطر خواہ نہیں ہے۔ جیسے کہ میرے دوست پروفیسر ایم ایس اگوانی نے فرمایا عربوں نے امریکہ اور اس کے ساتھی ممالک کے خلاف معاشی حربے کا استعمال نہیں کیا ہے لیکن امریکہ جیسے معاشی اور فوجی اعتبار سے طاقتور ملک کے ساتھ معیشت کا ہتھیار استعمال کرتے ہیں بعض

مشکلات ہو سکتی ہیں جن سے ہمارے عرب دوست سردست نمٹ نہ سکیں لیکن سری لنکا جیسے ملک کے معاملے میں ایسی کوئی مقتضیات نہیں ہو سکتیں۔ سری لنکا میں مقیم عرب سفارت کاروں نے صحیح طور پر اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ سری لنکا کی بیرونی زرمبادلہ کا ایک تہائی حصہ ان سری لنکائی کارکنوں کی آمدنی پر مبنی ہے جو عرب ممالک میں روزگار کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ سری لنکائی چائے کے سب سے بڑے خریدار بھی عرب ممالک ہی ہیں اور چائے سری لنکا کے زرمبادلہ کی کمائی کا دوسرا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اگر عرب ممالک نے سری لنکا کے خلاف قدم اٹھائے ہوتے تو اس سے ایشیا اور افریقہ کے وہ ممالک بھی چوکنا ہو جاتے جو آہستہ آہستہ اسرائیل کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ اگر عربوں نے سری لنکا کو دھمکی دی ہوتی تو امریکی سفارت خانہ میں اسرائیلی شعبہ کا قیام عمل میں نہ آتا اور آج حالات بالکل ہی جداگانہ ہوتے۔

ہمالیائی مملکت نیپال میں اسرائیل کا سفارت خانہ ۱۹۷۰ء کے عشرہ میں خاموش سا رہا لیکن اب وہ "جاگ" اٹھا ہے اور اس کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ اس کے کیا اثرات ہندستان۔ بنگلہ دیش اور خود نیپال پر ہوں گے اس کی تشویش دہلی ڈھاکہ اور کٹھمنڈو کو بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ عرب ممالک کو۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ بھوٹان میں اسرائیلی سفارت خانہ کھولنے کے لیے بات چیت جاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہندستان اس کو روک سکتا ہے۔ سنگاپور، تھائی لینڈ اور فلپائن میں اسرائیل اپنا جال بچھا چکا ہے اور اب ملیشیا، انڈونیشیا اور مالدیپ میں اپنے اثر و نفوذ کے لیے کوشاں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان ممالک میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت کی وجہ سے اسرائیل کو کامیابی حاصل نہ ہو لیکن ہم یہ فراموش نہیں کر سکتے کہ مغربی طاقتوں کے دباؤ کے تحت کئی ایسے افریقی اور ایشیائی ممالک میں اسرائیل کا اثر و رسوخ قائم ہو چکا ہے جہاں مسلمان کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ یروشلم، فلسطین اور لبنان کے مسائل پر عرب ممالک کو خطرہ بذاتہ اسرائیل ایسی حقیر ریاست سے نہیں بلکہ اس بنا پر ہے کہ استعماری اتحاد کی ناجائز اولاد کو امریکہ کی بھرپور تائید حاصل ہے۔ پہلے چوری چھپے امریکہ اسرائیل کی مدد کیا کرتا تھا لیکن اب

یہ تائید نہ صرف کھلے بندوں کی جا رہی ہے بلکہ اب امریکہ اسرائیل کو میدان جنگ میں اپنا حلیف سمجھتا ہے۔ یاد رہے کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں امریکی طیاروں نے اسرائیل کے نام سے (عربوں کے خلاف) جنگ لڑی تھی۔ لیبیا میں امریکہ نے اپنے فضائی اڈے سے ضروری ساز و سامان اسرائیل پہنچایا تھا۔ خود امریکہ کے ریگن انتظامیہ نے جو اعداد و شمار امریکی کانگریس کو پیش کی ہیں ان کے متعلق ۱۹۴۶ء اور ۱۹۸۳ء کے درمیان امریکہ نے اسرائیل کو سترہ ارب ڈالر کی فوجی امداد دی ہے۔ یہاں اہم بات یہ ہے کہ اس فوجی امداد کا اسی فیصد حصہ ۱۹۶۹ء کے بعد اسرائیل کو دیا گیا ہے۔ اور یہ وہ سال ہے جب اسرائیل نے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ بدترین جارح بن کر امریکی مقاصد کو آگے بڑھا سکتا ہے۔ واشنگٹن پوسٹ کے ایک تجزیہ کے مطابق مشرق وسطیٰ کے ۱۹ ممالک کو امریکہ نے جو امداد دی ہے اسرائیل کو دی ہوئی امداد اس کا سترہ گنا زیادہ ہے۔

برطانیہ کے ممتاز جریدے نیو اسٹیٹسمین کی اطلاع کے مطابق بحر روم کے اوپر لبنان کے ساحل سے ڈیڑھ سو میل دور پرواز کرتے ہوئے امریکی اواکس طیاروں نے ۱۹۸۲ء میں شام کے خلاف اسرائیلی جنگ کے لیے سارے راز اسرائیل کو فراہم کیے تھے۔ یاد رہے یہ وہ وقت تھا جب لبنان پر اسرائیل نے حملہ کیا تھا۔ اور اس حملے کی تیاری امریکہ اور اسرائیل نے مل کر کی تھی۔ وہ بھی امریکی اواکس طیارے ہی تھے جن کی مدد سے اسرائیل نے عراق کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ کر کے انہیں تباہ کیا تھا۔ اس اسرائیلی امریکی گٹھ جوڑ میں امریکہ کی آر ڈی ایف (Rapid Deployment Force) جس کو بعد میں سنٹرل کمانڈ کا نام دیا گیا کا رول بھی اہم ہے۔ اس کا مقصد کسی ہنگامی صورت حال میں عرب ممالک کے تیل کے ذخائر پر اچانک اور فوری طور پر موثر قبضہ کرنا ہے۔ اور اس سے عربوں کی آزادی اور ان کے ممالک کی سالمیت کو بہت بڑا خطرہ لاحق ہے۔ ۲۰ جون ۱۹۸۴ء کو مشترکہ امریکی اسرائیلی فوجی مشقیں بحر روم میں ہوئیں اور مزید مشقیں ہونے والی ہیں۔ مزید امریکی امداد بھی اسرائیل کو ملنے والی ہے۔ اس سلسلہ میں گفت و شنید کے لیے اسرائیلی وزیر اعظم اور وزیر دفاع نے واشنگٹن کے دورے کیے ہیں۔ ایک امریکی ماہر کا بیان ہے کہ اسرائیل امریکہ کے عالمی

دفاعی نظام کا ایک جزو لاینفک بن رہا ہے اور اس کام میں امریکی فوج کے ہر شعبہ کو پوری طرح اسرائیل کے ساتھ ملوث کیا گیا ہے۔ اسرائیلی بندرگاہیں امریکی بحری بیڑوں کو لنگرانداز ہونے کے لیے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرتی ہیں۔

اسرائیل کے ساتھ اس فوجی گٹھ بندھن میں امریکہ کا فائدہ یہ ہے کہ اسے ایک بنا بنایا مضبوط، جدید ترین اور قابل بھروسا ہوائی اڈہ اسرائیل میں مل گیا ہے جس کے ذریعہ وہ مشرق وسطیٰ کے علاقہ میں اپنا اثر و رسوخ قائم رکھ سکتا ہے۔ خود اسرائیل کے ایک نیم سرکاری اخبار یروشلم پوسٹ کا کہنا ہے کہ ہمارا ملک اس علاقہ میں امریکہ کا ایک طیارہ بردار جہاز ہے جس کو خود امریکی حکام چلائیں گے۔ اس اخبار کا کہنا ہے کہ اس نئے معاہدے سے اسرائیل کو اپنی پالیسیوں کو روبعمل لاتے میں زیادہ سیاسی اور فوجی آزادی مل گئی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اسی کے بعد اسرائیل نے سری لنکا میں قدم جمانا شروع کیے اور ایسے منصوبوں میں حصہ لینا شروع کیا جن میں امریکہ براہ راست ملوث ہونا نہیں چاہتا تھا۔

امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ کے نامہ نگار کا کہنا ہے کہ اسرائیل نے مطالبہ کیا کہ اسرائیل میں اسلحہ سازی کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے امریکہ اسرائیل سے سالانہ بیس کروڑ ڈالر کا ہتھیار خریدے۔ ساتھ ہی ساتھ جنوبی افریقہ اور اسرائیل کے تعاون سے ایک کنسورشیم قائم ہوا جو ہتھیاروں کے کارخانے قائم کرے گا۔ اور یہ ہتھیار بین الاقوامی مارکیٹ میں فروخت کیا جائے گا۔ اسرائیل میں تیار ہونے والے ہتھیار بھاری مقدار میں سری لنکا خرید رہا ہے اور توقع ہے کہ یہ ہتھیار ایران کو بھی فراہم کیا جائے گا۔

لندن کے اخبار نیو اسٹیٹسمین (۷ ستمبر ۱۹۸۴ء) کے مطابق امریکہ سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ اسرائیل سے درآمد کیے جانے والے فوجی اور غیر فوجی مال پر کسی طرح کے درآمدی ٹیکس نہ لگائے جائیں۔ ۱۹۸۴ء میں اس سے پہلے والے سال (۱۹۸۳ء) کے مقابلہ میں امریکہ میں اسرائیلی درآمدات ۲۳ فیصد زیادہ تھیں۔ ۱۹۷۶ء میں اسرائیل نے گیارہ کروڑ ساٹھ لاکھ

ڈالر کا مال امریکہ کو برآمد کیا تھا لیکن ۱۹۸۳ء میں اس کی مقدار اور قیمت چار گنا ہو گئی اور امریکی سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اسرائیل سے درآمد ہونے والے مال کے صرف ۹ فیصد حصّہ پر امریکی درآمدی ٹیکس لگتے ہیں۔

اور اب آیئے ایک طائرانہ نظر برطانیہ اور اسرائیل کے گٹھ جوڑ پر بھی ڈال لی جائے۔ مغربی ایشیا کی تاریخ کے ہر ایک طالب علم کو یہ معلوم ہے کہ بالفورڈ کلریشن کے وقت سے ہی اسرائیل اور برطانیہ کے تعلقات بہت گہرے اور قریبی رہے ہیں۔ برطانیہ ہی نے اس مقدس سرزمین کو یہودیوں کا غلام بنانے میں مدد دی تھی۔ اس سلسلہ کا دوسرا بڑا مرحلہ ۱۹۵۶ء میں پیش آیا جب مصر پر جارحانہ حملہ کیا گیا۔ یہ گٹھ جوڑ ہمیشہ سے مستحکم رہا ہے۔ صرف ۱۹۸۲ء میں جب اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا اور یوروپی مشترکہ منڈی نے اسرائیل کو دی جانے والی ساری معاشی امداد بند کر دی تو اس کے دباؤ کے تحت مسز مارگریٹ تھیچر کی حکومت کو لبنان پر اسرائیلی حملے کی مذمت کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور برطانیہ نے اسرائیل کے فوجی اتاشی کو ہدایت کی کہ وہ آلڈرشاٹ کے برطانوی ہتھیاروں کی نمائش دیکھنے نہیں جا سکتا۔ لیکن بعد کے واقعات سے پتا چلتا ہے کہ برطانوی سرکار دوبارہ اپنے روابط اسرائیل سے بعجلت بحال کر رہی ہے۔ خود مسز تھیچر نے "فرینڈز آف اسرائیل" نامی ایک مقامی تنظیم کی صدارت قبول کر لی ہے۔ اور دونوں ملکوں کے روابط آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔

جون ۱۹۸۴ء میں اسرائیل کے وزیر دفاع موشے آرینس اپنے برطانوی ہم عہدہ مائیکل ہیزلٹائن سے بات چیت کرنے کے لیے آئے۔ اس بات چیت کی تفصیلات صیغۂ راز میں رکھی گئیں۔ لیکن لندن ٹائمز نے ۱۵ر جون ۱۹۸۴ء کو یہ اطلاع دی کہ اسرائیل پر لگائی گئی ہتھیاروں کی برآمد پر پابندی زیر بحث آئی۔ اس اخبار نے یہ انکشاف بھی کیا کہ اسرائیل نے برطانیہ کے ساتھ مل کر ہتھیاروں کے مشترکہ کارخانے قائم کرنے اور ہتھیار بنانے کی تجویز پیش کی تھی۔ اور اس رپورٹ کی فریقین نے تردید نہیں کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ برطانوی خفیہ ایجنسی "ایس اے ایس" اور اسرائیل جاسوس

ایجنسی "مسعد" نے مل کر سری لنکا کے راستے جنوبی ایشیا میں اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔

اس برطانوی اسرائیلی گٹھ جوڑ کے سیاسی مضمرات سے قطع نظر دوسرے ایسے معاملات ہیں جن کے اثرات عربوں پر بھی پڑتے ہیں اور ایشیا اور افریقہ کے دوسرے آزاد ممالک، خصوصاً ہندستان، پر بھی پڑتے ہیں۔ اسرائیل اور برطانیہ کے درمیان اسلحہ کی صنعت میں تعاون کا مطلب یہ ہے کہ اسرائیل کو برطانیہ کے وہ تمام فوجی اہمیت کے راز دستیاب ہوں گے۔ جن سے اسرائیلی صنعت میں انقلاب آجائے گا۔ نیز اسرائیل کو یہ بھی پتا چل جائے گا کہ برطانیہ نے عربوں کو کس طرح کے ہتھیار فراہم کیے ہیں اور اس کے نتیجے میں ایسے ہتھیار بنانے میں وہ کامیاب ہو جائے گا جن کی مدد سے وہ عربوں پر بالادستی حاصل کر سکے۔

امریکہ اور اسرائیل کے روابط میں ایک ہوا کھڑا کیا گیا ہے کہ امریکی عربوں کے خیر خواہ ہیں۔ لیکن امریکہ میں یہودیوں کی ایک طاقتور لابی کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں اور انھیں اس چنگل سے نکالنے میں عرب امریکیوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ خود صدر سادات بھی یہی سمجھتے تھے۔ میں نے ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء میں قاہرہ اور دہلی میں دو مرتبہ صدر سادات سے ملاقاتیں کی تھیں۔ اور ان کا خیال تھا کہ عربوں کے حقوق بحال کرنے کی امریکیوں میں نہ صرف صلاحیت موجود ہے بلکہ وہ ایسا کرنا بھی چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر امریکہ کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ امریکہ کا معاشی اور فوجی مفاد عربوں کی دوستی میں ہے نہ کہ اسرائیل کی دوستی میں تو وہ اسرائیل کو چھوڑ کر عربوں کے ساتھ ہو جائیں گے۔ لہٰذا اب یہ باور کرانا عربوں کا فرض ہے کہ اب امریکہ کو مشرق وسطےٰ میں صرف اسرائیل پر بھروسا کرنے کی ضرورت نہیں عرب اس کے اسرائیل سے بھی اچھے دوست بن سکتے ہیں۔

یہ خیالات صرف صدر سادات کے نہیں تھے بہت سارے نیک نیت علما، اخبار نویس اور عرب ممالک کے پالیسی ساز بھی یہی سمجھتے ہیں اور چونکہ عربوں کی تیل کی دولت مغربی ممالک کے بینکوں میں موجود ہے تو یہ عرب اس دن کا انتظار کرتے نظر آتے

ہیں جب امریکہ اسرائیل کو غچہ دے کر عربوں سے آملے گا۔

یہی وہ منطق تھی جس نے صدر سادات کو کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ کرنے پر مجبور کیا انھیں یقین تھا۔ حالانکہ ان کا یقین غلط تھا۔ کہ اس معاہدے سے نہ صرف مصر کا بھلا ہوگا بلکہ سارے عالم عرب کو اس سے فائدہ پہنچے گا۔ افسوس کہ اس سادگی میں سادات کی جان بھی گئی۔

مجھے یاد آتا ہے کہ اگست ستمبر ۱۹۸۲ء میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کے سرکاری دورۂ امریکہ کے لیے گئی ہوئی پارٹی میں میں بھی شامل تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب لبنان کا بحران انتہائی شدید تھا۔ سارے اخبارات اسرائیل کے خلاف لکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ٹی وی کے ایک مبصر نے درد بھرے لہجے میں چلا کر کہا کہ امریکہ والوں کو پتا تو چلے کہ یہاں (لبنان میں) کیا ہو رہا ہے! لیکن امریکہ والے پہلے سے جانتے تھے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔

امریکی محکمۂ خارجہ کی "غیر سرکاری بریفنگ" کے دوران ہم ہندستانی اخبار نویسوں کو یہ بتایا جا رہا تھا کہ اب امریکہ اسرائیل کو چھوڑ کر عربوں کی جانب راغب ہو رہا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ ہم ہندستانیوں سے دبے الفاظ میں یہ کہا جا رہا تھا کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی عرب اسرائیلی سوال پر کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے صدر ریگن کی پوزیشن نازک ہو جائے۔

لیکن مسز اندرا گاندھی جہاں دیدہ سیاستدان تھیں اور انھیں اصل اسرائیلی امریکی روابط کا صحیح صحیح اندازہ تھا اور جہاں جہاں انھیں موقعہ ملا انھوں نے نہ صرف اسرائیل کی بلکہ امریکہ کی بھی برملا مذمت کی۔

اسرائیل نے صبرا اور شطیلا میں فلسطینی پناہ گزینوں کا جو قتل عام کیا تھا۔ اس پر امریکی ذرائع ابلاغ اور عوام کی ناراضگی کے باوجود امریکہ نے اسرائیل کو دی جانے والی امریکی امداد میں پینسٹھ فیصد کا اضافہ کیا۔ یہ فیصلہ ان امور کے باوجود کیا گیا جن کی تفصیل ذیل میں دی گئی ہے۔

(الف) مشرقِ وسطیٰ، خصوصاً لبنان، میں اسرائیل کی کارستانیوں کے خلاف امریکہ میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔

(ب) امریکی ذرائع ابلاغ اس بات پر متفق تھے کہ اسرائیل اپنی جارحانہ سرگرمیاں جاری رکھنا چاہتا ہے۔

(ج) دریائے اردن کے مغربی کنارے پر یہودی بستیاں بسانے اور اس علاقہ کے عرب کیرکٹر کو مکمل طور پر تباہ کرنے کے لیے اسرائیل کے اقدامات کے خلاف، امریکہ کے وہائٹ ہاؤس، امریکی کانگریس یا کسی اور اہم امریکی ایجنسی کی جانب سے جھوٹ موٹ ہی سہی کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوئی۔

• (د) یروشلم کے عرب اسلامی کیرکٹر کو تباہ کرنے کی اسرائیلی سازشوں اور اقدامات کے خلاف امریکی حکومت کی جانب سے ناراضگی کا کوئی اظہار نہیں ہوا۔ اور نہ ہی مسجد اقصیٰ کی جگہ یہودی عبادت گاہ تعمیر کرنے کی اسرائیل کی کوششوں پر امریکہ نے کوئی تبصرہ کیا۔

ان تمام باتوں سے ظاہر بھی ہوتا ہے اور میری خود اپنی رائے بھی یہ ہے کہ اب عربوں کو یا ہندستان کو امریکہ کی جانب سے کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ امریکہ میں یہودی لابی بہت طاقتور ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہودیوں کی بات امریکہ میں اسی لیے چلتی ہے کہ امریکہ اور اسرائیل کے مفادات مشترک ہیں۔

عربوں کے ایک مخلص دوست کی حیثیت سے یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ اب عربوں کو اپنی معاشی قوت کے مراکز بنانے کی جانب توجہ دینی چاہیے۔ اگر اس طرح کے مراکز عربوں نے قائم کر لیے تو انھیں اپنے مالیے کی سرمایہ کاری کرنے کے لیے مغربی ممالک کا دست نگر ہونا نہیں پڑے گا۔ وہ اپنے مالیاتی اور بنکاری کے ادارے قائم کر سکتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ جب عربوں کے پاس اتنی دولت ہے تو وہ کسی عرب شہر میں کوئی بڑا سا مالیاتی مرکز قائم نہ کر لیں۔ اس کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ عرب ممالک مل کر اپنی مالی قوت کو یکجا کریں اور امریکی ڈالر کے

نعم البدل کے طور پر کوئی "عرب دینار" جیسی کرنسی وضع نہ کرلیں۔

ماضی میں قائم عرب اپنے مالیاتی اداروں اور اقتصادی روایات پر بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔ یہ عرب ہی تھے جنھوں نے بین الاقوامی بنکاری۔ نقد اور مال کے بدلے مال کے لین دین، بیرونی زرمبادلہ وغیرہ جیسے تصورات اور تجارتی روایات قائم کی تھیں اور اب بھی وہ اس میدان میں دنیا کی رہنمائی کرسکتے ہیں۔

ایک ایسے ہندستانی باشندے کی حیثیت سے جسے اپنے ملک کے کارناموں پر فخر ہو میں اپنے ملک کے عوام اور حکومت سے درخواست کروں گا کہ وہ عربوں کو اس بات کا دو ٹوک الفاظ میں یقین دلائیں کہ یروشلم اور فلسطین کو نجات دلانے کے لیے ہمارے عرب بھائی جو بھی اقدام کرنا چاہیں اس میں ہندستان ان کا پورا پورا ساتھ دے گا۔ دفاعی میدان میں عرب اور ہندستان کے ماہرین مربوط کوششیں کرسکتے ہیں اور آخر کار یہ کوششیں ہندستان۔ عرب دنیا اور تیسری دنیا کی مشترکہ نجات کے لیے کارگر ثابت ہوں گی۔

ساتھ ہی ساتھ ذرائع ابلاغ کا قبلہ بھی درست کرنا ہوگا کہ صحیح حقائق عوام کے سامنے آسکیں کہ یروشلم کوئی یہودی بستی نہیں بلکہ مسلمانوں اور مسیحیوں کا مشترکہ مذہبی اور مقدس ورثہ بھی ہے۔

سیاسی اور سفارتی میدان میں فلسطین پر اقوام متحدہ کی کانفرنس کے انعقاد کی کوششیں جاری رہنی چاہئیں، اور اس کانفرنس کے ایجنڈے پر یروشلم ایک اہم موضوع کی حیثیت سے ابھرے اور اقوام متحدہ کی قرار دادوں کی روشنی میں اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

اسی طرح فلسطین کے مسئلے پر بھی ایک عالمی کانفرنس منعقد کی جاسکتی ہے تاکہ فلسطینی عوام کو اپنے وطن کا حق مل سکے۔ یا کم از کم اقوام متحدہ کی قرار دادوں پر عمل درآمد کے لیے راستہ ہموار ہوسکے۔

جہاں سیاسی، سفارتی اور ابلاغی میدانوں میں جدوجہد جاری رہے گی وہاں یہ دوبارہ یاد دلا دینا بے محل نہ ہوگا کہ آخر کار یہ جدوجہد خود عربوں کو کرنا ہوگی اور اس کے لیے انھیں ایک طرف اقتصادی قوت کو حربے کے طور پر استعمال کرنا ہوگا۔ اور دوسری طرف اپنی فوجی قوت کے بل بوتے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے موثر قدم اٹھانے ہوں گے۔

شہید جنرل محمد ضیاء الحق ایک سچا مسلمان

علی صدیقی (بانی و آرگنائزنگ سکریٹری عالمی اردو کانفرنس)

صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی شہادت عالمِ اسلام کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ موصوف کا ۱۱ سالہ دورِ اقتدار پاکستان کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ اپنی سیاسی بصیرت، اعلیٰ اخلاق، دور اندیشی اور عزمِ محکم کی بدولت شہید جنرل محمد ضیاء الحق پاکستان کے پہلے رہنما ثابت ہوئے جو دنیائے اسلام کے لئے قابلِ فخر شخصیت بن کر شہرتِ عام اور بقائے دوام کے مالک بنے۔ عالمی تاریخ میں بہت کم سیاسی رہنما ایسے ہوئے ہیں جن کے مخالفین بھی ان کے معترف ہوں۔ فرزندِ اسلام جنرل محمد ضیاء الحق اسلامی اخلاق و محاسن کی مجسّم تصویر تھے۔ میرے اس قول کی تائید ہر وہ شخص کرے گا جس نے انہیں قریب سے دیکھا ہے یا پھر ان کے بارے میں معلومات رکھتا ہے۔

جنرل محمد ضیاء الحق کی ناگہانی شہادت باشعور ہندوستانی عوام کے لئے بھی ایک دلدوز سانحہ ہے۔ مختلف مکاتیبِ فکر اس خصوص میں کچھ بھی کہنے کا حق رکھتے ہیں، لیکن جنرل ضیاء کی رحلت کے بعد یہ احساس ضرور جاگا ہے کہ عالمِ اسلام کا ایک سچا بہی خواہ اس دارِ فانی سے رخصت ہو گیا ہے۔

گذشتہ ۱۱ سال کا ایک ایک سیاسی لمحہ گواہ ہے کہ مرحوم جنرل ضیاء نے سابقہ پاکستانی حکمرانوں کی طرح ہندوستان کے خلاف زہر اگلنے کی سیاست نہیں کی۔ ہندوستان کے ساتھ پائیدار امن کے قیام کے لئے ان کی نیک نیتی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ جب دونوں ملکوں کی فوجیں سرحدوں پر جمع ہو چکی تھیں اور ایسا لگنے لگا کہ جنگ کے شعلے کسی بھی لمحے بھڑک سکتے ہیں تب وہ دور اندیش اور امن پسند پاکستانی سربراہ کرکٹ میچ دیکھنے کے بہانے ہندوستان پہنچ جاتا ہے اور تناؤ بھرا ماحول اچانک خوشگوار امن و آشتی میں بدل جاتا ہے۔

پاکستان میں جنرل ضیاء کی جو مخالفت تھی وہ کسی بھی ملک میں اقتدار اور کرسی کے لئے ہونے والے اختلاف کی طرح تھی لیکن ان کی سب سے زیادہ مخالفت ان کی اصلاحات، اسلامی اقدار کی ترویج اور صاف ستھرے نظام کے قیام کیلئے جدوجہد کی وجہ سے تھی، جنرل ضیاء سے اختلاف کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اردو تہذیب کے دلدادہ تھے اور محض آئینی طور پر نہیں بلکہ عوامی سطح پر بھی اردو کی ترویج کے خواہاں تھے۔ چنانچہ اس محسنِ اردو نے اردو کی تعلیم کے بنیادی مدارس کا وسیع پیمانے پر قیام اور اردو کے فروغ کے لئے کئی مؤثر اقدامات کئے، جب کہ بدقسمتی سے پاکستان میں لسانی تعصب اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ اگرچہ پاکستان کا ایک بڑا بااثر طبقہ پنجابی ہے لیکن پنجابیوں نے شروع سے ہی اپنی مادری بولی سے زیادہ اردو کو اپنایا ہے، لیکن سندھی، بلوچی اور پشتو وغیرہ بولنے والے اردو کے شدید مخالف ہیں یہاں تک کہ یہ عناصر لسانی بنیاد پر پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے بھی درپے ہیں۔ جنرل ضیاء نے ان عناصر کا کھل کر مقابلہ کیا۔ جنرل ضیاء پاکستان میں عالمی اردو کانفرنس منعقد کرنا چاہتے تھے لیکن ملک میں لسانی عصبیت کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہو سکا۔

بحیثیت ایک مسلمان، مرحوم جنرل ضیاء الحق کی ان خوبیوں سے سارا زمانہ واقف ہے کہ وہ قرآنِ کریم کی مقدس تعلیمات اور سنّتِ رسولؐ کے سچّے پیروکار تھے۔ احکاماتِ خداوندی کی بجاآوری ان کا مقصدِ حیات تھا۔ نماز و عبادت کا شوق بچپن سے تھا۔ اللہ کے گھر کی باربار زیارت کی تمنّا، کلام ربّانی کی تلاوت سے گہرا شغف اور تاجدارِ دو عالم سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے والہانہ عشق ان کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ قرآن مجید سے انہیں اس درجہ لگاؤ تھا کہ ہمیشہ سینے سے لگائے رہتے تھے، اپنے دوستوں، شناساؤں اور عزیزوں کو دینے کے لئے قرآن مجید کا ایک نسخہ دنیا کا سب سے بیش بہا تحفہ تھا۔ شاید اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ کہ شہید صدرِ پاکستان نہ صرف پنج وقتہ نمازوں کے پابند تھے بلکہ تہجّد کی نماز بھی شاید ہی قضا ہوئی ہو۔

میں نے جن تاثرات کا اظہار سطورِ بالا میں کیا ہے وہ میرے ذاتی مشاہدے کا نتیجہ ہیں گذشتہ سال اپریل میں ان سے طویل ملاقات کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ یہ ملاقات رسمی اور سیاسی نہیں تھی بلکہ یہ ایک گھریلو ملاقات تھی جہاں کوئی تصنّع نہیں تھا' تکلّفات نہیں تھے' پروٹوکول نہیں تھا۔ مرحوم جنرل ضیاء سے میرے مراسم کا سبب میرے داماد عزیزی خواجہ خلیل اللہ ہیں۔ میرے سمدھی مرحوم خواجہ امان اللہ اور جنرل ضیاء بچپن کے ساتھی تھے' دونوں کے گھرانوں میں دیرینہ تعلقات تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں جنرل ضیاء نے ایک طویل مدّت تک شملہ میں خواجہ امان اللہ صاحب کے گھر میں قیام کیا تھا۔ میرے داماد جنرل مرحوم کو چچا کہتے تھے جنرل صاحب بھی انہیں اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے

میرے سمدھی خواجہ امان اللہ مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے اور جنرل ضیاء کے والد اتنے قریبی دوست تھے اور دونوں میں سگے بھائیوں جیسی محبّت تھی۔ جنرل ضیاء کے والد نے خواجہ امان اللہ کو اور خواجہ امان اللہ کے والد نے جنرل ضیاءؒ کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ خواجہ امان اللہ نے اپنے اور جنرل ضیاء کے بچپن کی یادوں کا تذکرہ مجھ سے کئی بار کیا تھا کہ گیارہ بارہ سال کی عمر میں جب دونوں اسکول جاتے تھے تب اس چھوٹی سی عمر سے ہی ضیاء کو نماز سے گہرا لگاؤ تھا۔ اسکول سے واپس ہوتے ہوئے جب ظہر کی نماز کا وقت ہو جاتا تھا تو ضیاء اپنا بستہ انہیں سنبھلوا کر نماز ادا کرنے چلے جاتے تھے۔ خواجہ صاحب اعتراف کرتے تھے کہ ضیاء کی طرح نماز اور عبادت سے انہیں دلچسپی نہ تھی۔ چھٹّی کے دن جب میں کھیل کود میں مصروف رہتا ضیاء ہمارے لدا خی محلّے کی مسجد کی صفائی وغیرہ میں لگے رہتے۔ وہ اکثر اذان بھی دیا کرتے تھے۔ بچپن سے ہی انہیں دین کے کاموں سے رغبت اور خدا کا خوف دامن گیر تھا۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ کسی سے جھگڑا نہ کرتے تھے۔ جنرل ضیاء کے پاکستان کی عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ وہ شخص کتنا بلند کردار ہوگا جس کا بچپن اتنا پاکیزہ تھا۔

خواجہ امان اللہ مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ ان دونوں دوستوں نے بچپن میں ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ فوج میں بھرتی ہوں گے۔ خدا نے ان کی دعائیں قبول کیں اور وہ وقت بھی آیا جب ضیاء الحق آرمی میں اور خواجہ امان اللہ ایر فورس میں شامل ہو گئے اور حیدر آباد دکن میں ان کی پوسٹنگ ہوئی۔ ۱۹۵۱ء میں اپنے دو چھوٹے بچوں (خواجہ خلیل اللہ اور خواجہ کلیم اللہ) کو شملہ میں ہی چھوڑ کر پاکستان چلے گئے شملہ میں ان کی بڑی جائداد تھی لیکن ضیاء الحق کی محبت نے انہیں وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ جنرل ضیاء کے اقتدار حاصل کرنے سے پہلے تک دونوں دوست اکثر ملا کرتے تھے۔ لیکن جنرل ضیاء کے صدر بنتے ہی خواجہ صاحب ابوظہبی چلے گئے اور پھر ان سے کبھی ملاقات نہیں کی۔ اس سے خواجہ امان اللہ کے کردار کی بلندی ظاہر ہوتی ہے۔ وگرنہ عام لوگوں کی طرح وہ بھی اپنے دوست اور بھائی سے دنیاوی مفاد حاصل کر سکتے تھے۔

اور آج جب خواجہ صاحب اور جنرل ضیاء اس دنیا میں نہیں ہیں تو میں یہ سوچتا ہوں کہ انسانی کردار کی بنیادیں زندگی کے آغاز سے ہی تعمیر ہوتی ہیں۔ اور وقت کے ساتھ ان میں پختگی آتی چلی جاتی ہے۔

جنرل ضیاء الحق اللہ کے نیک بندے تھے، ان کو شہادت کا مرتبہ حاصل ہوا۔ اور آخری آرام گاہ کے لئے اس مسجد کے دامن میں جگہ ملی جہاں قیامت تک لاکھوں فرزندانِ توحید اپنے خالق کے حضور سجدہ ریز رہیں گے۔

گذشتہ سال عالمی اردو کانفرنس کی تیاریوں کے سلسلے میں میرا پاکستان جانا ہوا تو میری اہلیہ، میری دونوں بیٹیاں اور دونوں داماد خواجہ خلیل اللہ اور خواجہ کلیم اللہ میرے ہمراہ تھے۔ عزیزی خواجہ خلیل اللہ نے ہوٹل سے بذریعہ ٹیلی فون صدرِ پاکستان کو اپنی آمد سے مطلع کیا تو اسی وقت ایوانِ صدر کے کارکن دوڑے دوڑے آئے۔ اور صدر کی منشاء کے مطابق ہمیں حکومتِ پاکستان کا مہمان بنایا اور ہماری آسائش

کے لئے اہتمام کئے گئے۔

مرحوم جنرل ضیاء میرے دونوں دامادوں اور بیٹیوں سے بالکل اُسی طرح ملے جیسے ہندوستانی اور پاکستانی بزرگ اپنے بچوں سے ملتے ہیں۔ مجھے اور میری اہلیہ کو انہوں نے جو خلوص و احترام دیا اور اپنے پن کے جذبات کا اظہار کیا میں اُسے لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ اس دن رمضان المبارک کی پہلی تاریخ تھی جنرل ضیاء صائم تھے مگر ہم سے بار بار معذرت کر رہے تھے کہ بیگم اور بچوں کے امریکہ چلے جانے کی وجہ سے وہ ہماری مناسب مدارات نہیں کر سکے۔ جنرل ضیاء سے ہماری یہ ملاقات ڈھائی گھنٹے کی تھی۔ اس دوران ہم نے بہت سے موضوعات پر کھل کر تبادلۂ خیال کیا۔ جنرل ضیاء اپنے ملک کے سر براہ تھے اور میں ہندوستان کا ایک سیاسی ورکر، ایسے میں اگر وہ بات چیت میں محتاط رہتے یا کسی بات کو "آف دی ریکارڈ" کہتے تو غلط نہ ہوتا۔ ان سے بات چیت کے دوران میں سمجھا تھا کہ ایک سچے اور کھرے مومن کی طرح ان کے قول و عمل میں تضاد نہیں ہے، وہ ایک صاف گو اور کھرے مسلمان ہیں۔ اپنے ملک اور قوم کے لئے ان کا دل محبت سے لبریز تھا اس کے ساتھ ہی دنیا کے تمام انسانوں کی بہبودی کی دعائیں بھی ورد زبان تھیں۔

دورانِ گفتگو میں نے محض ذاتی معلومات کی غرض سے ان سے کچھ سوالات کئے تھے اور جواباً انہوں نے جو خیالات ظاہر کئے تھے وہ آج میں لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ اس سے اس دور ساز شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

مومن کی دولت

جنرل ضیاء الحق نے میری ایک بات کے جواب میں فرمایا تھا کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کی ذات پر مکمل اعتقاد، قرآنِ کریم اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا رہنا مومن کے لئے سب سے بڑی دولت ہے۔

ہندوپاک تعلقات

میں نے پوچھا تھا کہ ہندوپاک تعلقات کو جس قدر مضبوط ہونا تھا' نہیں ہو پائے ہیں، جبکہ دونوں ملکوں کا دعویٰ ہے کہ وہ تعلقات میں بہتری کے خواہاں ہیں؟ اس کے جواب میں جنرل ضیاء نے فرمایا تھا۔" ماضی میں جو غلطیاں ہوئی ہیں انہیں دہرانا دانشمندی نہیں ہے۔ دونوں ملکوں کے عوام کی بہتری' دوستی اور خیر سگالی میں ہے۔ ہندوپاک اپنی مشترکہ تہذیب کے قدیم رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ اختلاف اور ٹکراؤ دونوں کے مفاد میں نہیں ہے۔ میں دل سے دونوں ملکوں کے درمیان پائیدار امن اور اٹوٹ دوستی کا خواہاں ہوں۔

پنجاب میں دہشت گردی

میں نے بطورِ خاص جنرل ضیاء سے مشرقی پنجاب کے سکھ دہشت گردوں کو پاکستان سے ملنے والی مبینہ مدد کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔ میں نے ذاتی طور پر یا سرکاری سطح پر سکھ دہشت گردی یا کسی طرح کی دہشت گردی کی کبھی حمایت نہیں کی ہے۔ ہماری جانب سے بار بار ان الزامات کی تردید کی جا چکی ہے کہ پاکستان کی حکومت سکھ دہشت گردوں کی حامی ہے اور نہ ہی ان کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارا ملک خود بھی کئی طرح کے دہشت گردوں سے پریشان ہے۔ ہماری افواج نے سرحدوں میں دراندازی کرنے والے عناصر کی سرکوبی کی ہے اور گرفتار کر کے قید میں ڈالا ہے' اس طرح کے سکھ دہشت گردوں کے ساتھ ہم کوئی نرمی برتنے کو تیار نہیں ہوئے۔ ہم نے تو حکومتِ ہند کو سرحدوں پر دہشت گردوں کی روک تھام کیلئے تعاون کی پیش کش بھی کی ہے۔

میں نے ان کی وضاحت سُن کر کہا' لیکن دہشت گردوں کو پاکستان سے ہتھیار وغیرہ ملنے کے تو واضح ثبوت موجود ہیں؟

جنرل ضیار نے کہا حقیقت یہ ہے کہ پاکستان ہو یا ہندوستان زیرِ زمین ناجائز کام کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ہندوستان سے کتنی چیزیں پاکستان میں اسمگل ہوتی ہیں سب جانتے ہیں، اگر کچھ پاکستانی سماج دشمن عناصر سکھ دہشت گردوں سے ساز باز رکھتے ہوں تو یہ ممکن ہے۔ ایسے عناصر کا پتہ لگتے ہی حکومت فوراً ان کے خلاف ایکشن لیتی ہے لیکن اِس میں حکومت کا ملوث ہونا کہاں تک ثابت ہوتا ہے، ایسا کوئی ثبوت کسی کے پاس ہے تو سامنے لایا جائے۔

میں نے جنرلِ ضیار کی اس صفائی کے بعد پوچھا۔ لیکن اس بات کے تو ثبوت موجود ہیں کہ آپ ہندوستان سے آنے والے سکھوں سے بطور خاص ملتے ہیں اور ان کی خاطر و مدارات کرتے ہیں؟

جنرلِ ضیار میری بات سن کر سنجیدہ ہو گئے۔ "آج تک جتنے ہندوستانی سکھوں سے میں ملا ہوں وہ اپنے مذہبی مقامات کی زیارت کے لئے پاکستان آئے تھے، یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جنہیں ویزا دینے کے لئے خود حکومتِ ہند ہم سے درخواست کرتی ہے اور جن لوگوں کی فہرست ارسال کرتی ہے ہم انہیں ویزا دیدیتے ہیں، کئی بار تو یہ ہوتا ہے کہ پہلے فہرست بھیج دی جاتی ہے۔ بعد میں ہم سے کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں کو ویزا نہ دیا جائے۔ کبھی مرسلہ فہرست میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ ہم انسانی ضابطۂ اخلاق کی بنا پر کسی کو پاکستان آنے سے نہیں روکتے، حکومتِ ہند کو چاہیئے کہ وہ خود اپنے لوگوں کی تحقیق کرے اور انہیں پابند کرے۔ رہی خاطر مدارات کی بات تو ایسے وفود جب بھی یہاں آئے انہوں نے اپنی ایمبیسی کی معرفت مجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اس شرط پر ملاقات منظور کی کہ ان لوگوں کے ہمراہ ہندوستانی سفیر مسٹر ایس کے سنگھ ضرور موجود ہوں چنانچہ اب تک جتنے بھی سکھ یا ہندو وفود مجھ سے ملے ہیں اور اخلاقاً میں نے ان کی تواضع کی ہے سب کے ساتھ مسٹر سنگھ موجود رہے ہیں، صدیقی صاحب! آپ خود سنگھ صاحب سے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔"

فرقہ وارانہ فسادات

ضیار صاحب نے مجھ سے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔" آخر آپ کے ملک میں اس قدر فسادات کیوں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟

میں نے جواباً گوش گذار کیا کہ" ملک کی تقسیم کے وقت پاکستان چاہنے والے مسلمان پاکستان آ گئے تھے، جو وہاں رہ گئے انہوں نے سیکیولر ہندوستان میں رہنا پسند کیا تھا۔ لیکن حالات کو جس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے وہ حقیقت نہیں ہے، جہاں اس طرح کے واقعات ہوتے ہیں وہاں حکومت ان کا سدِ باب کرنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات میں نقصان صرف مسلمانوں کا ہی ہوتا ہے جیسا کہ آپ کے اخبارات اور ذرائع ابلاغ میں کہا جاتا ہے۔

جنابِ صدر ! حقائق یہ ہیں کہ ہندوستانی مسلمان اتنے کمزور ہیں نہ تمام ہندو اتنے ظالم ۔ مانا کہ ہندو اور مسلم فسادات ہندوستان میں ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ دونوں کے درمیان مذاہب کا فرق ہے لیکن آپ کے ملک پاکستان میں تو صرف ایک ہی مذہب اسلام کے ماننے والے ہیں تو پھر یہاں فسادات کیوں ہوتے ہیں ؟

راجیو گاندھی

اپنے وزیرِاعظم جناب راجیو گاندھی کے بارے میں ان کے تاثرات جاننے کے لئے میں نے درخواست کی تو انہوں نے کہا" میں اب تک آٹھ بار ان سے مل چکا ہوں ایک بار تنہائی میں ملنے اور انہیں سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ میری ذاتی رائے ان کے بارے میں یہ ہے کہ وہ انتہائی شریف اور نیک انسان ہیں، میں ان کی بے حد قدر کرتا ہوں۔ میری جانب سے اُن سے جا کر کہیئے کہ حوصلے سے کام لیں، ان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ میری نیک تمنّائیں ہمیشہ ان کے ساتھ ہیں۔

فیر فیکس اور بوفورس

میں نے ان سے پوچھا کہ وہ یقیناً ہمارے یہاں ہو رہے بوفورس اور فیرفیکس کے معاملات سے آگاہ ہوں گے "اس بارے میں ان کے ذاتی خیالات جو بھی ہیں وہ بے جھجک ارشاد فرمائیں۔ میرا سوال سن کر وہ ایک دم خاموش ہو گئے اور کچھ دیر تک میری جانب دیکھتے رہے، پھر بے حد سنجیدہ لہجے میں انہوں نے کہا۔ "راجیو ایک ایماندار اور با اصول انسان ہیں" مجھے یقین ہے کہ کچھ شر پسندوں نے اس معصوم اور پُر خلوص لیڈر کو اس اسکینڈل میں ملوث کرنے کی کوشش کی ہے، راجیو صاحب پر بہتان لگانے والے ایک دن پچھتائیں گے۔

بابری مسجد

بابری مسجد کا ذکر چھڑنے پر انہوں نے کہا تھا۔" دنیا کا کوئی بھی مسلمان اس طرح کی خبروں سے رنجیدہ ہو گا۔ مسجد خدا کا گھر ہے ہر مسلمان کے ایمانی جذبات مسجد کے تقدس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ بابری مسجد کے سلسلے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر وہاں نماز ہوتی رہی ہے تو اس کا بات چیت کے ذریعے منصفانہ حل تلاش کیا جائے۔ لیکن اگر ایک طویل عرصے سے اس مسجد میں نماز نہیں ادا کی جاتی رہی ہے تو میرے نزدیک اس قضیہ کا سیدھا سادا حل یہ ہے کہ اُسے مسمار کر دیا جائے۔ اور اگر وہ مسجد بابر نے ہی تعمیر کروائی تھی اور اس کے تاریخی شواہد موجود ہیں تو پھر اُسے محکمۂ آثارِ قدیمہ کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ دائمی نزاع اور کشت و خون دونوں فریقوں کیلئے اچھی بات نہ ہو گی۔

بنگلہ دیش کے بہاری مسلمان

دورانِ گفتگو بنگلہ دیش کے بانی شیخ مجیب الرحمٰن مرحوم کا ذکر نکلا تو میں نے انہیں بتایا کہ مجیب صاحب بیحد نیک اور خدا پرست انسان تھے۔ موصوف قرآنِ کریم کے پندرہ پاروں کے حافظ بھی تھے۔ دینداری اور پرہیز گاری انہیں اپنے والدِ محترم سے ورثہ میں ملی تھی۔ اُن کے والد حافظِ قرآن تھے اور ڈھاکہ کی جامع مسجد میں امام و معتکف تھے۔ یہاں تک کہ ان کا انتقال بھی مسجد میں ہی ہوا۔ پورے شہر میں اُن کی بزرگی کا شہرہ تھا۔ مجھے بھی اُن سے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی"۔

میری بات سُن کر صدر ضیا ر نے دریافت کیا۔ "کیا آپ مجیب صاحب مرحوم سے ملے ہیں؟" میں نے انہیں بتایا کہ میں کئی بار ان سے ملا ہوں، اور بمعہ اہل و عیال اُن کا مہمان رہا ہوں، میں ان کی دینداری اور خدا ترسی سے بیحد متاثر ہوں اور بزرگانِ دین سے انہیں بیحد عقیدت و محبت تھی، خاص طور پر سلطانِ ہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بیحد معتقد تھے۔ میری موجودگی میں انہوں نے مزار شریف کا بیحد شاندار غلاف بڑی عقیدت سے تیار کرایا اور اپنے سر پر رکھ کر کچھ دور چلے اور اجمیر شریف بھجوایا۔ اور اب میں نے آپ کے دینی جذبے اور نیکوکاری کو دیکھا ہے تو ان کی یاد آرہی ہے اور اس کے ساتھ ہی بنگلہ دیش میں مقیم بہاری مسلمانوں کا خیال بھی دل میں ابھرتا ہے۔ آپ کی منصف مزاجی، رحمدلی اور اسلامی قدروں کی پاسداری کو دیکھتے ہوئے آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اور جنرل ارشاد مل کر ان مظلوم انسانوں کے مسئلے کا کوئی مثبت حل تلاش کریں، انسانی اور دینی بنیاد پر وہ لوگ آپ کی توجہ اور ہمدردی کے حقدار ہیں۔ خداوند کریم آپ کو اس عظیم نیکی کا اجر عطا فرمائے گا۔

میری بات انہوں نے غور سے سنی اور پُر یقین لہجے میں بولے "میں ضرور اس مسئلے پر توجہ دونگا اور ضروری اقدامات کروں گا

عالمی اردو کانفرنس

جنرل محمد ضیاء الحق نے عالمی اردو کانفرنس میں بے حد دلچسپی اور خوشنودی کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے اس بات کا شکریہ بھی ادا کیا تھا کہ انہیں عالمی اردو کانفرنس عالمی اردو ایوارڈ برائے امنِ عالم دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اردو زبان کے بارے میں اپنے تاثرات ظاہر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔ اردو زبان کی ترقی سے ہندوستان اور یا پھر پاکستان کی کسی بھی زبان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پھر بھی کچھ لوگ اس کے مخالف ہیں اور فرق و تفریق کا ماحول پیدا کرتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو برِصغیر کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان ہے جو بین الاقوامی سطح تک پہنچ چکی ہے اور یہ کہ اب اردو زبان کی ترقی کے راستے روکے نہیں جا سکتے، اردو کے مخالفین ایک دن شرمسار ہوں گے۔

شملہ کی یادیں

جنرل ضیاء نے اپنے بھتیجے خواجہ خلیل اللہ کو انتہائی خوبصورت اور بیش بہا نسخۂ قرآنِ پاک اپنے دستخطوں کے ساتھ عطا کیا، اور ہم سب کو بہت سے تحائف پیش کئے۔

وقتِ رخصت بار بار معذرت کر رہے تھے کہ اہلِ خانہ کے عدم موجودگی کیوجہ سے خاطر خواہ مہمان نوازی نہیں کر سکے۔ انہوں نے خواجہ خلیل اللہ سے وعدہ لیا کہ وہ جب عالمی مشاعرے میں شرکت کے لئے ہندوستان آئیں گے تو انہیں اپنے گھر شملہ ضرور لے جائیں گے کیونکہ وہاں سے ان کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔

مستقبل روشن ہے

جنرل محمد ضیاء الحق ایک دور ساز شخصیت تھے، ان کی ناگہانی موت نے خود انہیں تو زندہ جاوید کر دیا لیکن ان کی موت دراصل ان کے مخالفین کی موت ہے۔ یہ عناصر

خواہ کچھ بھی کہتے رہیں لیکن جنرل ضیاء نے پاکستان کو مضبوط، خوشحال اور مثالی مملکت بنانے کے لئے جو نظریات اپنے پیچھے چھوڑے ہیں وہ بے حد پائیدار رہیں۔ ہندو پاک تعلقات کی بہتری کے لئے جنرل مرحوم نے جو بیج بوئے ہیں وہ یقیناً ایک دن بارآور ہوں گے۔ میرے اس یقین کی سب سے بڑی وجہ جنرل ضیاء الحق کے بعد جناب غلام اسحٰق خان کا کرسئ صدارت پر متمکن ہونا ہے۔ غلام اسحٰق خانصاحب گذشتہ چالیس سال سے حکومتِ پاکستان کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ آپ ایک جہاندیدہ اور تجربہ کار حاکم ہیں۔ جنرل ضیاء کے نہایت قریبی مشیر کی حیثیت سے انہوں نے نمایاں کارکردگی دکھائی ہے۔ جنرل ضیاء کی کامیابیوں میں غلام اسحٰق خاں کی بے حد اہمیت رہی ہے۔ پاکستان کا عہدۂ صدارت سنبھالنے کے بعد غلام اسحٰق صاحب نے اعلان کیا ہے کہ وہ مرحوم صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی پالیسیوں پر قائم رہیں گے۔

میں ذاتی طور پر غلام اسحٰق خاں سے واقف ہوں، میں پہلی بار ان سے ۱۹۸۵ء میں ملا تھا اور اپنے سرپرست اور بزرگ دوست، مجاہدِ آزادی جناب محمد یونس کی کتاب "قیدی کے خط"، انہیں پیش کی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یونس صاحب اور اسحٰق صاحب میں دیرینہ دوستی ہے۔ محمد یونس صاحب نے اپنی اس شہرۂ آفاق کتاب میں جگہ جگہ غلام اسحٰق سے اپنے دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ یونس صاحب کا کہنا ہے کہ غلام اسحٰق ایک انسانی دوست اور صاحبِ کردار انسان ہے۔ وہ جنرل ضیاء کے دستِ راست ہونے کی وجہ سے پاکستان آرمی کی نظروں میں بہت محترم اور قابلِ بھروسہ ہیں۔ جنرل ضیاء کی طرح غلام اسحٰق بھی ہندوستان سے بہتر تعلقات کیلئے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔ جناب محمد یونس اور غلام اسحٰق خان صاحب کے تعلقات کا اندازہ ہمارے صدرِ جمہوریہ جناب وینکٹ رمن کو اس وقت ہوا جب جنرل ضیاء کی تدفین کے بعد ہونے والی ملاقات میں قائم مقام صدر پاکستان سے دورانِ ملاقات محمد یونس صاحب کا ذکر آیا۔ صدر جمہوریۂ ہند نے محمد یونس کے بارے میں کہا۔ "وہ میرے بھائی جیسے ہیں"، اس پر غلام اسحٰق صاحب نے کہا۔ "وہ تو میرے بھائی ہی ہیں"۔

قائم مقام وزیرِ اعظم جناب اسلم خٹک کے بارے میں تو جناب محمد یونس نے کئی سال پہلے اپنی کتاب میں تحریر کیا تھا کہ "وہ ایک کراماتی انسان ہیں۔"

میں ذاتی طور پر جناب اسلم خٹک، وزیرِ دفاع محمود ہارون صاحب موجودہ خارجہ سکریٹری ہمایوں خانصاحب (جو گذشتہ سالوں میں ہندوستان میں پاکستان کے سفیر رہے ہیں) اور جناب فدا محمد خاں صاحب (صدرِ مسلم لیگ) وغیرہ سے واقف ہوں۔ ان اصحاب کے جذبات و خیالات جانتے ہوئے پُر امید ہوں کہ وہ مرحوم جنرل ضیاء کے خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہونگے اور پاکستان میں جمہوری سرکار قائم کر کے اپنے عوام کی دیرینہ آرزو کی تکمیل کریں گے۔ آثار و قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار جمہوریت کے زرّیں دور کا آغاز ہونے والا ہے۔ اور یقیناً اس صحت مند جمہوری نظام کا خاکہ خود جنرل ضیاء مرحوم نے ہی ترتیب دیا تھا۔ برِّ صغیر کے کروڑوں لوگ اس ضمن میں پر امید ہیں کہ پاکستان میں ہونے والے ۱۶ نومبر کے عام انتخابات کے بعد قائم ہونے والی اصل عوامی حکومت ہند و پاک کے مابین تمام مسائل حل کر کے دائمی امن و اتحاد کی ضامن ہو گی۔

پاکستان کے موجودہ وزیرِ دفاع جناب محمود ہارون میرے دیرینہ دوست ہیں ۸۳-۱۹۸۲ء میں وہ پاکستان کے وزیر داخلہ تھے، اسی زمانے میں انہوں نے مجھے پاکستان بلوایا تھا اور میرے لئے ویزا بھیجا تھا' ان کے بھائی جناب یوسف ہارون نیویارک میں مقیم ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں وہ اپنی بیگم کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے تھے۔ تو میں نے ہی مسز اندرا گاندھی سے ان کی ملاقات کا اہتمام کروایا تھا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اصحاب جن کے ہاتھوں میں اس وقت پاکستان کی عنانِ حکومت ہے' ہندوستان سے اچھے تعلقات کے حامی رہے ہیں اور یہ کہ دونوں ملکوں کے عوام ان سے اچھی توقعات وابستہ کر سکتے ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

مولانا ابوالکلام آزاد اور متحدہ قومیت

مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقریبات کا افتتاح ۱۱ر نومبر ۱۹۸۸ء کو صدر جمہوریۂ ہند نے وگیان بھون نئی دہلی میں کیا۔ اس موقع پر نائب صدر جمہوریۂ ہند نے یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیا، اور آزاد صدی تقریبات قومی کمیٹی کے چیئرمین وزیر اعظم راجیو گاندھی نے بھی مولانا آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر تین دانش وروں اور ادیبوں نے بھی اظہار خیال کیا۔ ہندی کی نمائندگی پروفیسر امیادت پنت، انگریزی کی پروفیسر رشید الدین خاں، اور اردو کی پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ صدر جمہوریہ ہند نے پروفیسر نارنگ کی شستہ و شائستہ اردو کی بطور خاص تعریف کی۔ ذیل میں پروفیسر نارنگ کی تقریر کا اقتباس دیا جا رہا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے پایے کے انسان خاک کے پردے سے روز روز باہر نہیں آیا کرتے، وہ کیسے انسان تھے؟ ان کے اصول اور آدرش کیا تھے، اور آزاد ہندوستان کو ان کی دین کیا ہے؟ یہ ایسے سوال ہیں، جن پر برابر گفتگو ہوتی رہے گی۔

مولانا آزاد تحریک آزادی کے اور آزاد ہندوستان کے چوٹی کے رہنماؤں میں تھے۔
دس ہے کہ تاریخ ایک ایسا موڑ مڑ گئی جو مولانا کے آدرشوں اور اصولوں کے خلاف پڑتا
ا، اور یہ تو مستقبل ہی بتائے گا کہ یہ موڑ غلط تھا یا صحیح ، لیکن یہ ایک سنگین حقیقت
ہے کہ متحدہ قومیت ، ملے جلے کلچر ، مذہبی رواداری ، بھائی چارے ، ہندوستانیت پر
وطنیت اور مذہبیت میں کسی ٹکراؤ کا محسوس نہ کرنا ، دوسروں کے عقیدوں کا
م ، سچا سیکولرزم ، وطن سے گہری محبت اور اس راہ میں حق پرستی ، حق گوئی ، حق
اور حق شعاری کو آدرش بنانا یہ تھی مولانا آزاد کی شخصیت ، اور ان اصولوں کی
ت جتنی آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے تھی ، اتنی ہی آج بھی ہے ، بلکہ آج پہلے
بھی زیادہ ہے ۔ اس لیے کہ ملک کو جن خطرات کا سامنا ہے ، اور جو مسائل شدت
کرتے جا رہے ہیں ، ان کا سامنا کرنے کے لیے دراصل ان اصولوں پر ایمان تازہ
کی ضرورت ہے جو مولانا کو عزیز تھے اور جن کے بارے میں انھوں نے کبھی کوئی
نہیں کیا ۔

حضرات : مولانا آزاد غیر معمولی انسان تھے ، وہ حب الوطنی اور عزم و ارادے کا آہنی
، وہ کچھ ایسی خوبیوں کے مالک تھے کہ جس میدان میں بھی انھوں نے قدم رکھا ،
ہو یا مذہب ، ادب ہو یا صحافت ، انھوں نے اپنے ولولے ، جذبات کی سچائی ،
ں عمل سے دھوم مچا دی ۔ وہ ہمارے ان قومی رہنماؤں میں تھے جن کے دانش
ر گاندھی جی اور جواہر لال نہرو بھروسہ کرتے تھے ۔ مولانا عالمِ دین بھی اس پائے
۔ بڑے بڑے علماء ان کا نام احترام سے لیتے تھے ، اور خطیب و ادیب و انشا
ں مرتبے کے کہ ایک صدی ہونے کو آئی ، زمانہ ابوالکلام آزاد کی نظیر پیدا
ا ۔ بقول میر :

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ستان کے دل کی ایک ایک دھڑکنوں کو ، ہندوستان کے دکھ درد کو اور
کے قومی مسائل کو اور ہندو مسلمان کے جذبات کو جیسا مولانا جانتے تھے ، انھیں
ندو مسلم اتحاد پر ان کا پختہ یقین تھا ۔ آج سے ۷۰ برس پہلے کے ان کے یہ

جملے آج بھی کتنے صحیح معلوم ہوتے ہیں :-

"اگر بادلوں سے اتر کر ایک فرشتہ قطب مینار کی چوٹی پر کھڑا ہوجائے اور یہ اعلان کرے کہ ہندوستان کی آزادی آج ہی مل سکتی ہے، بشرطیکہ وہ ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہوجائے، تو میں آزادی سے دستبردار ہوجاؤں گا، لیکن ہندو مسلم اتحاد نہیں چھوڑوں گا۔ کیونکہ اگر ہمیں آزادی نہ ملی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہندو مسلم اتحاد قائم نہ رہ سکا، تو یہ عالمِ انسانیت کا نقصان ہوگا۔"

ان کا یہ قول ۱۹۱۲ء کا یعنی آج سے پون صدی پہلے کا ہے جب وہ کلکتہ سے "الہلال" نکال رہے تھے۔ مولانا نے اپنے قلم کی ولولہ انگیزی اور گرم گفتاری سے چند برسوں کے اندر اندر ملک میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی۔ "الہلال" کی جلدیں کئی ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں جب انگریزوں نے الہلال کی ضمانت اور پریس ضبط کرلیا تو مولانا نے "البلاغ" کے نام سے نیا اخبار نکالنا شروع کر دیا، لیکن انگریزوں نے اس کو بھی جاری نہیں رہنے دیا اور مولانا کو کلکتہ چھوڑنا پڑا۔ وہ رانچی آگئے اور یہاں ۱۹۱۶ء میں نظر بند کر دیئے گئے۔ مولانا کی شہرۂ آفاق تفسیر "ترجمان القرآن" زمانہ رانچی کی یادگار ہے۔ "تذکرہ" بھی انھوں نے رانچی میں لکھا۔ "غبار خاطر" قلعہ احمد نگر جیل کی یادگار ہے۔ ترجمان القرآن بلاشبہ مولانا آزاد کا مہتم بالشان کارنامہ ہے۔ مولانا کی شخصیت کا یہ پہلو آج بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ ان کے یہاں مذہبیت اور وطنیت میں کبھی کوئی ٹکراؤ پیدا نہیں ہوا۔ وہ پکے مسلمان اور سچے ہندوستانی تھے۔ افسوس ہے کہ مولانا کے خیالات کی اہمیت کو لوگ بھولتے جاتے ہیں، ان کا ذکر تو سب کرتے ہیں، لیکن عام طور پر ہم ناک سے آگے نہیں دیکھ سکتے، اور چھوٹی وفاداریوں میں بٹتے جاتے ہیں۔ ہم ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی تو فوراً بن جاتے ہیں، لیکن نہیں سوچتے تو یہ کہ ہم اوّل اوّل ہندوستانی ہیں۔

متحدہ قومیت اور ملی جلی تہذیب پر مولانا آزاد کا اٹل یقین تھا۔ اس بارے میں انھوں نے بہت کچھ لکھا اور بہت کچھ کہا۔ اس تھوڑے سے وقت میں صرف اشارہ ہی کیا جاسکتا ہے، اور صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ کاش خدا ہمیں توفیق دے اور ہم مولانا کے اس بیان کو اپنی زندگیوں کا حصہ بنالیں۔

"صدیوں کی مشترکہ تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی
کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔
ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق،
ہمارا لباس، ہمارے رسم ورواج، ہماری روزانہ زندگی کا کوئی
گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر مشترکہ زندگی کی چھاپ نہ
لگ چکی ہو۔ ہماری ایک ہزار برس کی مشترکہ زندگی نے
ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے
نہیں جاسکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود
بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے، اور قسمت
کی مہر اس پر لگ چکی ہے۔"

حضرات: آخر میں یہی کہنا چاہوں گا کہ خالی لفظوں میں معنی نہیں پیدا ہوئے کرتے،
لفظوں میں معنی پیدا ہوتے ہیں عمل اور کردار سے! مولانا کی بڑائی اسی میں ہے کہ انھوں نے
اپنے عمل اور کردار سے لفظوں کو معنی دیئے تھے۔ آج ان کی صدی تقریبات کا افتتاح ہو رہا ہے
صرف اسی کے لفظ، اسی کے اصول، اسی کے آدرش باقی رہتے ہیں۔ مولانا کی بہترین یاد یہی
ہے کہ ان کے لفظوں، اصولوں اور آدرشوں کو یاد رکھیں، اور انھیں اپنی قومی زندگی کا حصّہ
بنائیں۔ یہ باتیں ہم جانتے ہیں، لیکن اس وقت ان پر اصرار کرنا اس لیے ضروری ہے کہ:

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

تبصرے

افکارِ گریزاں

کلدیپ گوہر

نام مصنف : ڈاکٹر کیشو چندر سین حقیر آستانی
صفحات : ۲۱۶
ناشر : ماہنامہ 'نشانِ ہند' فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ، دریا گنج۔ نئی دہلی۔
قیمت : ۵۰ روپے۔

افکارِ گریزاں جناب ڈاکٹر حقیر آستانی کا مجموعۂ کلام ہے جو شاعری کے انتہائی لطیف نمونوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں ۵۳ نظمیں، ۵۰ غزلیں، ۵ گیت اور ایک قطعہ شامل ہیں اور یہ تمام اصنافِ سخن ڈاکٹر حقیر آستانی کی خوش گوئی اور قادر الکلامی پر دلالت کر رہی ہیں۔

نظم ہو یا غزل، گیت ہو یا قطعہ، صاحبِ کلام کے بیان کی سادگی، بے تکلفی، الفاظ کی شوکت اور بندش کی چستی ان سب اصناف میں نمایاں طور پر جھلکتی ہیں۔ گلستانِ نظم میں فکر و خیال کے کیسے کیسے حسین پھول کھلائے ہیں ذرا توجہ فرمائیں۔

کس قدر ثابت قدم ہے گردشِ لیل و نہار
روز و شب شام و سحر لمحہ بہ لمحہ بار بار
آدمی بنتا ہی رہتا ہے حوادث کا شکار

حادثے ہیں وقت کی پرچھائیاں
لے رہی ہے زندگی انگرائیاں
(تضاد)

نہ محنت کشی ہو نہ محنت پرستی
مُروّج ہو احسان کی چیرہ دستی
جہاں فکر مہنگی ہو عشرت ہو سستی

بشر اپنی عظمت جہاں بھول جائے
یہی ہے جو زاہد کی جنت تو واللہ
یہ زاہد کی جنت جہنم میں جائے
(معاذ اللہ)

اس گھٹن میں کہیں انسان کا نہ دم گھٹ جائے
ہر گھڑی رنج والم آہ و فغاں کی محبوس
ہر طرف تیرتے پھرتے ہیں بھیانک سائے
دور یہ ہے کہ سلگتی ہوئی روحوں کا جلوس (عصر حاضر)

چلو دھڑکنوں کی ہم آغوشیاں ہوں
جنوں سازیاں ہوں ستم کوشیاں ہوں
جو ہشیار کر دیں وہ بے ہوشیاں ہوں
اب آؤ کہ جنت کا دیدار کر لیں گھڑی دو گھڑی کے لیے پیار کر لیں

(دعوت نامہ)

یہی روانی، یہی دلکش اسلوب، یہی فکر و جذبہ کی ہم آہنگی، غم دوراں اور غم جاناں کا ایک خوبصورت امتزاج ڈاکٹر حقیر آستانی کی غزلیات میں بھی موجود ہے۔ صاحبِ کلام نے غزل کی روایت کی پابندی کے ساتھ ہی ساتھ اسے آگے بڑھانے کی بھی کوشش کی ہے۔ چند اشعار تمثیلاً درج ذیل ہیں۔

انسان کا عروج جو حد سے گذر گیا تو تُو جب گرا ہی انسان ہو گیا
محبت کی آنکھوں میں شمعیں جلا کر کسی کی وفا آئینے ڈھونڈتی ہے
ہماری پیاس تو اک بوند ہی سے مٹ جاتی یہ کس خیال میں اتنے سراب نکلے ہیں
گویا اپنی ذات سے بھی اب یقیں اٹھنے لگا وقت کی مانند اپنے بھی عجب آثار ہیں
کوئی تو وصف ہمارا وجود میں آتا جو سنگِ میل نہ بنتے تو نقشِ پا ہوتے
کافی مشکل ہے ٹوٹنا ان کا آبگینے یہ عادتوں کے ہیں
شمشیر خود اپنے ہی دستے سے نہیں چلتی قاتل کی کلائی بھی شمشیر کا حصہ ہے

کاغذ عمدہ، سرورق نہایت حسین، دلکش اور دیدہ زیب کلام نے افکار گریزاں کو ایک ایسا میخانۂ شعر بنا دیا ہے جس سے تشنگانِ سخن مدتوں فیضیاب ہوتے رہیں گے۔

....

تبصرہ

شہابِ ثاقب

مصنف : ہمّت رائے شرما

صفحات : ۱۴۴

قیمت : ۵۰/- روپے

طباعت : نعمانی پریس دہلی

تقسیم کار: موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولامارکیٹ - دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ہمّت رائے شرما کا یہ پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹ غزلوں ۱۰ نظموں ۲۲ گیتوں اور کچھ قطعات پر مشتمل ہے۔ غالباً اردو میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں صاحب کتاب نے اپنی کچھ تخلیقات کے تفریحی اسکیچز بھی خود ہی بنائے ہیں۔ قابل مصنف نے حرف آغاز میں لکھا ہے کہ کتاب کی اشاعت وہ پورے بیس برس کے بعد کر پائے ہیں۔ انہوں نے کئی بار اس مجموعہ کو طبع کرانے کی کوشش کی لیکن کچھ مجبوریوں کی وجہ سے تاخیر ہوتی چلی گئی۔ شرما صاحب فلمی دنیا میں گیت کار کی حیثیت سے بھی مشہور رہیں۔ وہ ایک اعلیٰ پایے کے مصوّر کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار، صنائع لفظی اور صنائع معنوی کے ماہر ہیں۔ ہندوستانی کلاسیکل موسیقی پر انھیں عبور حاصل ہے اور پلے بیک سنگر کے طور پر کئی فلموں میں گیت دینے کے علاوہ اداکاری بھی کر چکے ہیں۔

کتاب کے مقدمہ میں شرما صاحب کی شاعری پر اظہار کرتے ہوئے محرمِ جمالیات جناب فراق گورکھپوری (مرحوم) فرماتے ہیں ان کی شاعری میں ایک صحت مند اور تربیت یافتہ جوانی کار فرما ہے۔ ان کی آواز اور تحریر میں چوٹ اور درد ہے۔ ان کے کلام میں خوشگوار شگفتگی ہے۔ شرما صاحب کے کلام میں زندگی کے مسائل اور محسوسات کی عکاسی ہے۔ کرب کا احساس بھی کلام میں جھلکتا ہے۔ نیز ماضی کے نقوش کسک کی صورت میں کہیں کہیں نمایاں ہیں۔

اے فلک ہرگز نہ لینا دِل جلوں کا امتحاں
مختلف ہوتا ہے اکثر ان کا اندازِ بیاں

پاؤں سے لپٹی ہوئی ہے کوچۂ جاناں کی خاک
جانے کب سے زیرِ پا منزل لئے پھرتا ہوں میں

روتے روتے شام ہوئی ہر سمت اندھیرا چھانے لگا
ڈرتے ڈرتے پھر ہم نے امید کا دامن تھام لیا

خدا گواہ مری داستانِ عہدِ شباب
لکھی گئی ہے اندھیروں کی روشنائی سے

یہ دل کش دیدہ زیب اور تصاویر سے مزین مجموعہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے اور امید ہے کہ اہل ذوق حضرات کے لئے تسکین وطمانیت کا باعث ہوگا۔

•••

پروفیسر یوسف سرمت

اردو اور ہندی

چالیس سال بعد اب دونوں زبانوں میں قرب کا احساس و عمل

اردو ہندی کی اصل ایک ہے۔ ایک مدت تک پورے ہندستان کی یہ ایک مشترکہ زبان تھی جو مختلف ناموں سے پکاری جاتی تھی ڈاکٹر محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں اردو کے مختلف ناموں کی فہرست دی ہے۔ اردو ابتدا میں ہندی یا ہندوی کہلاتی رہی ہے یہ نام عربوں کا دیا ہوا ہے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

اہل عرب یہاں کی قدیم زبانوں میں سے ہر ایک کو ہندی یا ہندیہ کہتے تھے۔

اسی ہندیہ سے انگریزوں نے INDIA بنایا۔ اردو کو ہندی اس وقت بھی کہا گیا جب ریختہ کا نام بھی عام ہو چکا تھا۔ مصحفی نے فارسی میں اردو شعرا کا تذکرہ لکھا ہے لیکن اس کو تذکرۂ ہندی گویاں" کہا گیا ہے۔ علاقائی اثرات کی وجہ سے یہ ہندی یا ہندوی، دہلوی زبان یا زبان دہلوی گجراتی اور دکنی بھی کہلاتی ہے۔ اس طرح سے اردو کے کئی نام رہے ہیں سب سے آخر میں اردو کا نام پڑا اور یہ بہت بعد کی بات ہے۔

اردو کے موجودہ نام سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہی ہیں اور کی جاتی رہی ہیں جس کا سلسلہ اب بھی باقی ہے بعض لوگ صرف اس کے نام کی وجہ سے دانستہ یا نادانستہ طور پر اسے "بدیسی"

باقی صـ۴۰۴ پر

آبشارِ نغمہ

نام مصنف : پریم نارائن سکسینہ راز۔ ایم۔ اے۔

صفحات ۱۹۲

قیمت ۔ ۲۰ روپے

طباعت جمال پرنٹنگ پریس جامع مسجد، دہلی

آبشارِ نغمہ کلاسیکی روایتی انداز کی شاعری کے علمبردار پریم نارائن سکسینہ راز کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو ۱۳۴ غزلوں ۴ نظموں اور حضرت فراق گورکھپوری پر لکھے ایک مرثیہ پر مشتمل ہے مجموعہ کا پیش لفظ ڈاکٹر شارب ردولوی انچارج شعبۂ اردو دیال سنگھ کالج نئی دہلی تعارف جناب برہمانند جلیس، نائب صدر حلقۂ تشنگان ادب نئی دہلی اور تبصرہ جناب الفت ایمن آبادی ایڈیٹر تیج ویکلی۔ دہلی نے لکھا ہے۔

راز کو قدرت نے ذوقِ سلیم عطا کیا ہے۔ ان کی فکر میں ندرت اور اظہار میں پختگی ہے لہجے میں رچاؤ اور نرمی ہے، احساس کی شدت ہے، بے ساختگی ہے۔ صاف اور شستہ بیان کی کھنک ہے۔ اسلوب کی شیرینی اور حلاوت نے دل پذیر کیفیت پیدا کردی ہے۔ راز کی تخلیقات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے استاد پنڈت رام کرشن مضطر (مرحوم) کے زیرِ عاطفت اپنی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کیا ہے۔ روایتی شاعری کے ماحول میں تربیت پانے کی وجہ سے ان کا بیشتر کلام غزلیات پر مبنی ہے اور ان کا لب ولہجہ کلاسیکی ہے۔ کلام میں پختگی زبان میں شائستگی اور خیالات میں تازگی ہے چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ ؎

زمانہ کر نہ سکے گا مجھے نظر انداز
میں اپنے دور کی ہوں ایک معتبر آواز۔

دلِ غمگیں پہ گزرے وقت کا احسان کیا کم ہے
کسی کا غم تھا پہلے اب ہے عالمگیر غم میرا۔

کسی کے نغمۂ جانسوز کے تصور سے — اک ارتعاش ہے سازِ نفس کے تاروں میں۔

اے بے خبر قلبِ شاعرِ خامی ہے تیری آگاہی میں — سو چشمۂ آبِ حیواں میں میری اک بوند سیاہی ہیں

اپنے احساس نمو سے اسے تازہ رکھنا — سوکھ نہ جائے میرے بعد روایت کا شجر۔

بن رہا ہے پھول اک اک غنچۂ حسنِ خیال — آج وہ بالیدگی ہے فکر کے انداز میں۔

نہ ٹوٹا ترکِ تعلق کے بعد بھی یہ ربط — کسی کو دیکھ کے دل آج بھی دھڑکتا ہے

ایسی مثالوں کی کمی نہیں۔ خیالات و جذبات اور انداز و اسلوب کی یہ بوقلمونیاں اس مجموعہ میں بہت مل جائیں گی۔ کتابت اور طباعت کے اعتبار سے بھی یہ کتاب دل پذیر ہے کاغذ عمدہ سرورق حسین اور قیمت مناسب۔ توقع ہے کہ قدر شناس اور ذوق حضرات رازؔ کے اس مجموعۂ اولین کو پسند فرمائیں گے۔

بقیہ :۔ اردو اور ہندی

کہنے کی غلطی بھی کر جاتے ہیں۔ بعض اس کی پوری تاریخ کو بھلا کر جس نے دو اجنبی قوموں میں میل ملاپ پیدا کرنے اور ان کی تہذیبوں کو شیر و شکر کر دینے کا عظیم کام انجام دیا اس پر یہ الزام بھی لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس نے دو قومی نظریے کو فروغ دیا اس وجہ سے سید سلیمان ندوی نے نقوش سلیمانی (۱۹۳۹ء) میں اردو کے نام کی مخالفت کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اس زبان کو اردو کہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ناواقف گرامرین اس کی صرف و نحو عربی فارسی کی صرف و نحو سے جانچ کر اس کے اصول بنانے لگے اس غلطی کا سبب صرف لفظ اردو ہے۔ اس نام کو باقی رکھنا ہے اور اس کی اصل تاریخ کو جواب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے برباد کرنا ہے" وہ اسی بنیاد پر دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی اس مشترک زبان کو اردو کہنا میں اصطلاح کی غلطی سمجھتا ہوں اردو کے ابتدائی مصنفین نے اس کو ہمیشہ ہندی کہا ہے اور انگریزوں کی زبان میں اب تک اس کا نام ہندوستانی ہے یہ بات جدید ہند آریائی زبانوں کا ہر عالم جانتا ہے کہ اردو اسی کی شاخ ہے۔ اس لئے جب کبھی اس کے ارتقا کی بات کی جاتی ہے۔ ویدک، سنسکرت سے اس کا آغاز کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنی اپنی کتابوں میں کیا ہے"

درحقیقت اس رشتے کو نہ سمجھنے اور سمجھانے کا نتیجہ ہے کہ اردو کے تعلق سے غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور آج ایک مشترکہ تہذیبی میراث سے روگردانی ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر زورؔ نے اپنی کتاب "ہندوستانی

باقی ص۴۱۳ پر

تبصرہ

دشتِ بے تمنا

نام مصنف : قیصر الجعفری

صفحات : ۱۲۵

قیمت : ۳۰ روپے

دشتِ بے تمنا قیصر الجعفری صاحب کا چوتھا شعری مجموعہ ہے جو ۱۰۵ غزلیات پر مشتمل ہے اس سے پیشتر ان کے تین شعری مجموعے رنگِ حنا ۱۹۶۴ء نبوّت کے چراغ ۱۹۶۵ء اور سنگ آشنا ۱۹۷۷ء میں شائع ہو کر اہلِ ذوق سے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ کے ابتدائی صفحات میں قیصر صاحب نے "پاؤں کے نیچے کی زمین" کے عنوان سے تخلیق شعر کا راز بیان کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ ان کی تخلیق میں دل و دماغ بھی شامل ہے اور جسم بھی تحریکات کا مطالعہ ذاتی مشاہدے ماضی کی دھند، حال کی بے مائیگی اور فردا کی بے چہرگی غرض کہ ہزار ہا مسائل ہیں جن کی کوئی کسک شعر کا موضوع بن جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عصری تقاضے ان کی غزل میں تہہ نشین ہیں قیصر صاحب کی تحریر کے بعد اس مجموعے کی روشنی میں حکیم انجم فوقی بدایونی کراچی (پاکستان) کا مصنف کی شخصیت اور شاعری پر ایک مختصر مضمون ہے۔ زبان کی روانی اور براہ راست اظہار قیصر کی شعری تخلیقات کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کی غزلوں میں داخلیت اور انفرادیت کی کمی نہیں۔ تفکر اور خارجی ماحول کے شعور کی آمیزش نے اس کو ایک خاص توازن اور شگفتگی ادا کی ہے۔ الفاظ کا ترنم ترکیبوں کا حسن لہجہ کی شائستگی اور سوز و گداز ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں ان کے متعدد اشعار قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ مثلاً

میں وہ منظر ہوں کہ پس منظر ہے جس کا بے چراغ
دیکھنے والے مجھے دیکھیں گے گھر دیکھے گا کون۔

کسے رہے جو پر و بال اک زمانے تک
اڑے قفس سے تو پہنچے نہ آشیانے تک۔

خود کو اب گرد کے طوفاں سے بچاؤ قیصر
تم بہت خوش تھے کہ ہمسائے کی دیوار گری.

راستہ دیکھ کے چل ورنہ یہ دن ایسے ہیں
گونگے پتھر بھی سوالات کریں گے تجھ سے.

چیختا پھرتا ہوں خود اپنے بدن کے اندر
مجھ سے بڑھ کر کوئی صحرا ہو تو گھر سے نکلوں.

اب لوگ سیپیوں کو بھی کہنے لگے گہر
دنیا سے اعتبار نظر ختم ہو گیا.

سب لوگ ضرورت کی طرف بھاگ رہے ہیں
اب راہ میں دیوار انا بھی نہیں آتی.

دشت بے تمنا کی کتابت اور طباعت صاف ستھری ہے اسے مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون کے ساتھ شائع کیا گیا ہے. قیصر صاحب کے پہلے مجموعوں کی طرح اس کتاب کا مطالعہ بھی شاعری کے شائقین کو انبساط بخشے گا.

بقیہ : اُردو اور ھندی

لسانیات" میں لکھا تھا:

"اس کی وجہ سے اس نے اپنا اور اپنی زبان کا وہ وقار غالباً ہمیشہ کے لئے کھو دیا جو اس کو آج سے ایک صدی قبل تمام ہندستان میں حاصل تھا اسی نے اردو کی ہمہ گیری کو سخت نقصان پہنچایا اسی کے بلوث ہندستان کی دوسری جدید زبانیں آج جدا جدا ادبی اہمیتوں کی مالک بن گئی ہے اور اسی کی بنا پر اردو ہندی کا جھگڑا شروع ہوا اور بہت جلد ایک ایسی مستقل حیثیت اختیار کرلی کہ آج اس سے پیچھا چھڑانا دشوار نظر آتا ہے."

جو زبان ایک تھی اس کو دو زبانوں میں تقسیم کرنے کا سہرا انگریزوں کے سر جاتا ہے۔ ۱۸۰۰ء میں جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو جو زبان ایک تھی اسے دو زبانوں میں تقسیم کیا گیا اس تعلق سے سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

" ملک کی دو قوموں کو جو ایک ہزار سال کی محنت اور جد و جہد کے بعد ایک قوم بن گئی تھی جس کا تمدن، جس کی زبان جس کی سیاست ایک ہو رہی تھی اس کو پھر دو قوموں میں بانٹ کر علیحدہ

باقی صـ۱۳۱۴ پر

दिल ने तेरी गली से कनारा नहीं किया। जालिम ने एक काम हमारा नहीं किया॥
हम बेखयालियों के जहन्नुम में जल गये। जिस वक्त भी ख्याल तुम्हारा नहीं किया॥
दुनिया की बात छोड़िये दुनिया तो गैर थी। तुमने भी कुछ ख्याल हमारा नहीं किया॥
सामां उदासियों का बहुत घर में था शुजा। इक उसकी आरजू पे गुजारा नहीं किया॥

مصرعِ ثانی

مصنف: شجاع الدین ساجد (شجاع خاور)

سال اشاعت: ۱۹۸۷ء فروری

صفحات: ۲۰۰

طباعت: نعمانی آفسیٹ پریس، ترکمان گیٹ، دہلی۔

قیمت -/۵۰ روپے

مصرعِ ثانی شجاع خاور کا چوتھا شعری مجموعہ ہے جو ۱۰۰ غزلیات اور ۴۸ متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ موصوف کا پہلا شعری مجموعہ "اردو شاعری میں تاج محل" ۱۹۶۸ء میں دوسرا مجموعہ "دوسرا شجر" ۱۹۷۵ء تیسرا مجموعہ "وادین" ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئے تھے اس طرح "مصرعِ ثانی" شجاع کے گزشتہ پانچ برس کے شعری سفر کا سرمایہ ہے۔ شجاع خاور کا نام اردو کی ادبی دنیا اور خاص طور سے دہلی والوں کے لیے خوب جانا پہچانا ہے۔ مصرعِ ثانی میں مشاہیر ادب ظ۔ انصاری اور پروفیسر محمد حسن نے اپنے ارشاداتِ عالیہ میں شجاع کے کلام کو سراہا ہے۔ شجاع صاحب جس کے بجا طور پر حقدار ہیں۔ شجاع صاحب جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اسے صفحۂ قرطاس پر لفظوں اور استعاروں کا لباس پہنا کر بہت خوبصورتی سے بکھیر دیتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور زبان سلیس ہے۔ ہنگامی حالات ہوں یا سماجی برائیاں، زندگی کے مسائل ہوں یا طبقاتی کش مکش، عوام کی پس ماندگی شجاع اپنے سادہ اور براہِ راست اسلوب میں کہہ جاتے ہیں جس میں کچھ طنز اور شوخی کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ بقول ظ۔ انصاری، شجاع خاور شعر میں گفتگو کی اور عام سے محاورے میں فلسفے کی جو چوٹ ملا دیتے ہیں وہ خاص انہی کا صدری نسخہ ہے جواب تک کسی کے ہاتھ نہیں لگا۔ پروفیسر محمد حسن فرماتے ہیں کہ شجاع کی شاعری میں ایک خاص قسم کی راست گفتاری ہے کھلے ڈھلے پن سے اور صاف صاف سیدھے سادے ڈھنگ سے ہم جلیسی اور ہم نشینی کے طرز سے باتیں کہی گئی ہیں اور یہ شیوۂ گفتار دامنِ دل کو کھینچتا ہے۔

یوں تو زیرِ نظر مجموعہ سہل متنع اشعار سے مملو ہے لیکن بعض اشعار مصنف کی ترجمانی یا

نمائندگی کرنے والے ہیں اور اس کے رنگ سخن مین رنگے ہوئے ہیں جو ان کی اپنی انفرادیت کی شناخت بھی ہیں. مثال کے طور پر ؎

بازار میں ہر شخص قصیدے کا طلب گار ۔ ہم ہیں کہ لئے پھرتے ہیں اشعار غزل کے۔

ڈوبنے سے فائدہ بھی ہوگا اور نقصان بھی ۔ ذہن سے طوفان، ہاتھوں سے کنارا جائے گا۔

آب؟ وہ آئی جو چہرے پر عدو کے بعد وصل ۔ اور پانی؟ وہ جو میری آرزوؤں پر پھرا۔

کیسے تنہائی کے ہاتھوں لٹ گیا انسان دیکھو ۔ آؤ میری چارپائی کا شکستہ بان دیکھو۔

جن کو قدرت ہے تخیل پر انھیں دکھتا نہیں ۔ جن کی آنکھیں ٹھیک ہیں ان کو تخیل چاہیئے۔

اس اعتبار سے بے انتہا ضروری ہے ۔ پکارنے کے لئے اک خدا ضروری ہے۔

کچھ نہیں ہوتا کتابوں پہ کتابیں لکھ دو ۔ اگلے وقتوں میں تو دو لفظ اثر رکھتے تھے۔

کچھ شرم اب تجھے بھی تو آئے گی شاہ وقت،

لے ہم بھی آ گئے ہیں تیرہ بارگاہ میں۔

ہمیں پوری امید ہے کہ شجاع خاور کا یہ دل کش اور دیدہ زیب مجموعۂ کلام "مصرع ثانی" تشنگانِ شعر و ادب کے لئے سامانِ تسکین اور صاحبانِ فکر و نظر کے لئے باعثِ انبساط ہوگا اور قبول عام کی سند پائے گا۔

उस बेवफा का शहर है और वक्ते शाम है। ऐसे में आरजू बड़ी हिम्मत का काम है॥
आराइशे गजल के लिए जिक्रे जाम है। हालांकि वाएजों में हमारा भी नाम है॥
हमको भी छोड़ता हुआ आगे निकल गया। जख्मों का काफिला भी बड़ा तेज गाम है॥
बे आरजू भी खुश हैं जमाने में बाज लोग। यां आरजू के साथ भी जीना हराम है॥
नक्काद तुमको पूछते आए थे कल शुजा। कहते थे शायरों में तुम्हारा भी नाम है॥

मेरे चर्चे आम बहुत हैं। तेरे सर इल्जाम बहुत हैं॥
घर भी महफिल भी बस्ती भी। तनहाई के नाम बहुत हैं॥
अन्दर-अन्दर बेकारी है। बाहर-बाहर काम बहुत हैं॥
कौन शुजा अब लाये फ़लक से। अपने ही पैगाम बहुत हैं॥

रखते हैं अपने ख्वाबों को, अब तक अजीज हम। हालांकि इसमें हो गये दिल के मरीज हम॥
इसके ब्यान से हुए हर दिल अजीज हम। गम को समझ रहे थे छुपाने की चीज हम॥
किस मरहले पे आ गये जज़्बात, देखिए। सिखला रहे हैं जब्त की उनको तमीज़ हम॥
चारागरी की बात किसी और से करो। अब हो गये हैं यारो पुराने मरीज हम॥

इस ऐतबार से बेइन्तहा जरूरी है। पुकारने के लिए इक खुदा जरूरी है॥
हजार रंग में मुमकिन है दर्द का इजहार। तेरे फिराक में मरना ही क्या जरूरी है॥
शऊर शहर के हालात का नहीं सबको। ब्यान शहर के हालात का जरूरी है॥
कुछ ऐसे शेर हैं यारों जो हम नहीं कहते। हर एक बात का इजहार क्या जरूरी है॥
शुजा मौत से पहले जरूर जी लेना। ये काम भूल न जाना बड़ा जरूरी है॥

حلقۂ اربابِ سخن و بصیرت

تناظر میں شائع شدہ تحریروں پر آپ کی قیمتی رائے ادارہ کے لیے ہی نہیں

ہمارے قلمی معاونین کیلئے بھی مفید ثابت ہو سکتی ہے ۔

32. Shirin, 31 Colaba Road, Bombay 400 005. Tel: 495 1453.

حضور،

آپ کے چار خط میرے سامنے جڑے ہوئے رکھے ہیں اچار کی پھانکوں کی طرح..
اور میں ان کی، یعنی آپ کے احکام کی تعمیل پہلے ہی کر چکا ہوں. پوچھیے، وہ کیسے؟ تو وہ
ایسے کہ:

اس شام کی روداد، تصاویر بھیجے ہوئے مہینہ بھر گزر چکا۔

خط، جو آپ کے لیٹر فارم پر چھپے ہوئے پتے کے مطابق گیا تھا، واپس آیا، اس کے گال
سوجے ہوئے تھے پتہ چلا کہ اصل پتہ وہ نہیں جو اوپر تھا. اصل پتہ وہ پتہ جو پتے کے نیچے دستی تحریر تھا
دوبارہ اس پر روانہ کیا، ہوا ہو گیا۔

خواب و خیال کی تختی پر ہر ایک خط کی آمد سے پہلے اور اس کے بعد جواب نقش کر چکا ہوں
اگرچہ لفافے میں ڈال کر یہ نیا پتہ نہیں لکھا اور ٹکٹ بھی بچا لیے۔ (کفایت شعاری اسے کہتے ہیں)
"حالِ ہند" کا فائل آپ کے قانونی فرزند نے سعادت مندی کے ساتھ دفتر اکادیمی
تک پہنچا دیا تھا. اتنا عمدہ، ایسا بھرپور، قابلِ قدر، بامعنی اور اپ ٹو ڈیٹ پرچہ آپ نے نکالا
تھا کہ واہ! مگر اس بدبخت (کم بختی ماری) زبان کو ایسے کام راس نہیں آتے. کچرے کا
مارکیٹ ہے۔ اگر کبھی زمانے نے تقاضا کیا تو "حالِ ہند" پھر جاری کریں گے نقصان
کا سودہ سمجھ کر اور جیب میں سوراخ کھلا چھوڑ کر۔

رضا صاحب کمال کر رہے ہیں۔ ہم تو سمجھتے تھے وہ "شعلۂ خاموش" پر خاموش
ہو جائیں گے شاعری ان کی وہیں تھم گئی تھی۔ سلیقے کے انسان ہیں. میری ان کی ملاقات

برائے نام ہے۔ نہ دفتر جانا ہوا نہ گھر۔ ان پر اتنا لکھا گیا ہے کہ خود انہوں نے بھی بقلم خود نہ لکھا ہو گا۔

محب مکرم ڈاکٹر ظ۔ انصاری

جنوری تا اپریل ۱۹۸۸ء کا تناظر ملا۔ شکریہ۔ کالی داس گپتا نمبر کے بعد یہ پہلا پرچہ ہے جو ملا۔ درمیانی پرچوں کے نہ ملنے کی کوئی شکایت نہیں کیونکہ میں نے اس بیچ کوئی تحریر اشاعت کے لیے نہیں بھیجی اور اس طرح اپنا استحقاق قائم نہیں کیا۔

آپ نے کہانی کے بارے میں جو اداریہ لکھا ہے، لوگ کہیں گے کہ اگلے وقتوں کی بات ہے۔ لیکن میں آپ کے اس دعوے سے متفق ہوں کہ جو کہانی قاری کو جکڑ نہ سکے وہ کمزور ہے۔ اس معیار پر اکثر جدید افسانے خارج ہو جائیں گے۔ یہ تجریدی افسانہ تو نام ہی کا افسانہ ہوتا ہے، دراصل یہ ایک مقالہ یا مسئلہ ہوتا ہے جو محض ادبیات کے نقاد پڑھتے ہیں اور حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عام قاری انہیں نہیں پڑھتا۔

آپ انگریزی رسالے سے وابستہ ہو گئے تھے میں سمجھا تھا کہ تناظر بند کر دیا۔ گیان چند

نوٹ: انگریزی رسالہ "دی رائزنگ نیشن" بند ہو گیا ہے مگر تناظر ابھی زندہ ہے۔

مکرمی بلراج ورما صاحب

"تناظر" کا کالی داس گپتا رضا نمبر دیکھا۔ سب سے پہلے پروڈکشن کی داد دینا چاہوں گا۔ کتابت طباعت جلد بندی ہر پہلو سے یہ شمارہ قابلِ داد ہے۔

گپتا صاحب کی لائبریری سے مجھے بھی ایک بار فائدہ پہنچا تھا۔ مجھے اقبال کے ایک کتابچے کی ضرورت تھی میں نے انھیں لکھا تو اس کی نقل انھوں نے بھجوا دی تھی۔

مضامین میں مجھے حمیرا خاتون کا مضمون خاص طور پر پسند آیا جس میں رضا صاحب اور قاضی عبدالودود کی ملاقات کا ذکر ہے۔ رضا صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ داغ فرہنگ آصفیہ کے مؤلف مولوی سید احمد دہلوی کو مستند نہیں مانتے تھے۔ ان سے کسی نے مولوی صاحب کے بارے میں پوچھا تو کہا "جی ہاں وہ سرائے روہیلہ میں رہتے ہیں" "سرائے روہیلہ چونکہ بیرون فصیل ہے۔ اس لیے زبان کے بارے میں ان کی رائے سند نہیں ہو سکتی۔

گوپال متل

F-270, New Rajinder Nagar
New Delhi - 110060

ایک عرصے کے بعد تناظر بھجوا کر آپ نے بڑا کرم کیا۔ آپ خود ایک معتبر افسانہ نگار ہیں، اس لیے آپ کے جریدے میں افسانوی ادب پر خصوصی توجہ فطری ہے۔ معیار کے سلسلے میں آپ نے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا، اس لیے آپ مزید مبارکباد کے مستحق ہیں۔

خوشی ہوئی کہ آپ نے آزاد غزلیں شائع کرنی شروع کی ہیں۔ لیکن تعجب یہ ہے ساحر شیوی پر آپ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے اپنے مجموعہ کلام میں آزاد غزلیں کیوں شامل کیں۔ (تبصرہ)

منظہر امام

نوٹ: آزاد غزل لکھنا ہر کسی کے بس کی چیز نہیں۔

محترم بلراج ورما صاحب

آپ کی اس محبت کا اظہار و شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں جو تناظر دسمبر ۱۹۸۷ء (جو ترقی پسند تحریک گولڈن جوبلی سے متعلق ہے) کے تحفہ کی شکل میں ملی ہے؛

جس زمانے میں "تحریک" بڑے زور شور سے شائع ہو رہا تھا تناظر کا چرچہ ہوا تھا اور میں نے ایک کہانی بھی تناظر کے لیے ارسال کی تھی۔ پھر تناظر کے بارے میں کم سننے لگا۔ البتہ اس کے کچھ شمارے جناب کلیم شاہد اور جناب فرحت قادری کے پاس دیکھے۔ کسی نے ایک دن کہا کہ آپ کی کہانی تناظر میں شائع ہوئی ہے لیکن تناظر کا وہ شمارہ میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ اور نہ میں نے تناظر کے ادارہ سے رابطہ ہی قائم کیا۔

شمارہ بہت خوب ہے۔ اب آپ کے ساتھ بہت سے فعال اور تجربہ کار لوگ ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس صاحب جیسا عالم اور مخلص آدمی آپ کے ساتھ ہو تو کامیابی کی منزل تک پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں۔ قمر رئیس صاحب کی تخلیقات اور نظریات سے چاہے میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کروں ان کے خلوص بے پایاں کا میں معترف رہا ہوں۔

جناب راج پال سہگل صاحب کے عزم و استقلال کی تعریف کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ سارے مضامین سنجیدگی سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ ابھی تو میں نے ارتضیٰ کریم صاحب (آنریری اسسٹنٹ ایڈیٹر) کا مقالہ "ترقی پسند تحریک اور بہار کا اردو افسانہ" پڑھا ہے انہوں نے

جو اجمالی خاکہ پیش کیا ہے ایک اچھی کوشش ہے۔ تنقید کے سر پر جب تک ذاتی پسند، دوستی، جان پہچان اور لوگوں کو خوش کرنے کا بھوت سوار رہے گا تنقید بے چاری کا دم گھٹتا رہے گا۔ اب میں ان باتوں کی جانب نشاندہی کرنا نہیں چاہوں گا کہ خواہ مخواہ آسمان ادب میں پر پرواز تولنے والے کے بازوؤں کو نظر لگ جائے گی آپ تناظر کے آئندہ شماروں کے بارے میں کچھ روشنی ڈالیں تو شاید آپ کی خدمت میں کوئی حقیر تخلیق لے کر حاضر ہونے کی جسارت کرسکوں۔

HAKIM ENAYAT COLONY
GAYA-823001
(BIHAR)

م۔ق۔خان

نوٹ: خان صاحب کی کہانی اس شمارے میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بلراج جی۔

کالی داس گپتا رضا نمبر بڑے معرکے کی چیز ہے اور ادبیات اردو میں گراں قدر اضافہ ہے۔ رضا کی شخصیت کے تمام پہلو پوری طرح ابھر کر سامنے آگئے ہیں جس سے ایک بے حد بلند قامت باوقار محقق سے پڑھنے والا روشناس ہوتا ہے۔ اور یہی ان کی پہچان اور اصل مقام اور صحیح درجہ ہے۔

جتنی مبارکباد دی جائے کم ہے۔ جانے کتنی محنت آپ نے کی ہوگی۔ کتنی راتوں کی نیندیں۔ کتنے دنوں بلکہ برسوں کا چین، کتنی آنکھوں کے خواب، کتنے دلوں کا لہو نذر ہوا ہوگا۔

مکان آپ نے اتنی دور لیا کہ آپ کے لیے تو گوشۂ عافیت ہوسکتا ہے۔ مگر وہاں تک پہنچتے پہنچتے آنے والے کی عاقبت خراب ہوسکتی ہے۔ لہٰذا کئی بار چاہتے ہوئے بھی آنا ممکن نہ ہوا۔

شفیقہ فرحت

برادرم ورما صاحب

کالی داس گپتا رضا، تقریباً ڈیڑھ درجن کتابوں کے مصنف ہیں، اپنے تحقیق کے میدان کو انھوں نے خاص طور سے غالب اور چکبست کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔

یہ بات نہایت مسرت کی ہے کہ ان کی علمی، ادبی خدمات کا اعتراف مختلف طریقوں سے کیا جارہا ہے۔ اہل علم نے مختلف موقعوں پر ان کی ادبی خدمات سے متعلق نہ صرف

مضامین لکھے بلکہ ان پر کتابیں بھی قلم بند کیں۔

جناب بلراج ورما نے تناظر جیسے معیاری رسالے کا یہ خاص نمبر پیش کر کے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف خود بھی کیا ہے اور ہندوستان کے نامور ادیبوں سے بھی کرایا ہے۔

یہ خصوصی شمارہ دراصل کالی داس گپتا رضا پر ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں مختلف زاویوں سے مختلف ادیبوں نے رضا کی ادبی خدمات اور شخصیت کا جائزہ بھی لیا ہے اور ان کی خوبیوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔

اس نمبر میں مضامین کو نو منظر میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن میں رضاؔ کے فن اور شخصیت سے متعلق مضامین کے علاوہ ان کا کلام اور ان کی "چند بیانیہ نثریں" بھی پیش کی گئی ہیں۔ مقالات لکھنے والوں میں تقریباً سبھی نام قابلِ ذکر ہیں جن میں خاص طور سے ڈاکٹر گیان چند جین، وارث علوی، آدم شیخ، محمد انصار اللہ، علیم اللہ حالی، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، عبداللہ کمال، سردار جعفری، افتخار امام، قاضی عبدالودود، عابد پشاوری وغیرہ اہم نام ہیں۔

مجموعی حیثیت سے یہ نمبر ہر اعتبار سے قابل قدر ہے۔ جس کے لیے بلراج ورما اور کالی داس گپتا رضا مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ورما صاحب اس لیے کہ انھوں نے ایک اہم نمبر نہایت سلیقہ کے ساتھ پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اور رضاؔ صاحب اس لیے کہ ان کی خدمات کا جس طرح ان کی زندگی میں اعتراف ہو رہا ہے بہت سے دوسرے ادیب سوچ بھی نہیں سکتے۔ ●●

بقیہ :- اُردو اور ھندی

علیحدہ کئے جانے کی کوشش شروع کی اور ہندی و ہندستانی یا اردو دو زبانیں بناکر ایک کے لئے پنڈت اور دوسری کے لئے منشی اور مولوی رکھ کر دو زبانوں کے لئے سامان درست کر دیا۔ فورٹ ولیم ہندی کے نام سے دو شعبے قائم ہوئے ایک کو مسلمانوں کے سر تھوپا اور دوسرے کو ہندوؤں کے سر مڑھا۔"

ڈاکٹر زور اس تعلق سے لکھتے ہیں:

"موجودہ ہندی اردو کی جدید ترین شاخ کا نام ہے جو فورٹ ولیم کالج کے قیام انیسویں صدی کے آغاز کے بعد سے ناگری رسم الخط میں لکھی جانے لگی ہے۔"

پنڈت دتاتر یہ کیفی اپنی کتاب "منشورات" میں لکھتے ہیں:

"شورسینی آپ بھرنش سے مغربی ہندی نکلی جس کے میل سے دوآبہ گنجم میں ایک نئی زبان پیدا ہوئی اسے مستشرق اور ماہر لسانیات ہندستانی کہتے ہیں۔ پھر اس کی دو شاخیں ہوگئیں اس تقسیم کی بنیاد رسم الخط تھی یہ دو شاخیں اب کی ہندی اور اردو ہیں۔"

چونکہ ہندی اور اردو ایک زبان کی دو شاخیں ہیں اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لایا جائے گا اور تعصبات کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ اردو داں طبقہ ہندی سے واقف ہو اور ہندی داں طبقہ اردو سے مولانا حالی نے بہت پہلے جب ہندی اور اردو کا "تنازعہ کھڑا ہوا تھا یہ مشورہ دیا تھا۔

"ہندی پر قدرت حاصل کرنے کے لئے عربی اور فارسی میں کم سے کم متوسط درجے کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے اردو زبان کی بنیاد جیساکہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اسما کا ہندی سے ماخوذ ہے۔"

مولانا نے اس زمانے میں جو مشورہ دیا تھا اس پر عمل پیرا ہونے کی آج کے دور میں سخت ضرورت ہے۔ احتشام حسین نے بھی اس بات کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرتے ہوئے لکھا تھا،

"ہندی اور اردو دونوں اس ملک کی زبانیں ہیں۔ دونوں ہمارے تہذیبی ڈھانچے میں اپنی جگہ رکھتی ہیں۔ دونوں نے تنومند ادب پیدا کیا ہے ہندو اور مسلمان دونوں اس ملک کے باشندے ہیں دونوں مذہبوں کے ماننے والوں نے دونوں زبانوں میں اعلا کام کئے ہیں اور تھوڑے دنوں پہلے انھیں خیال بھی نہیں ہوا تھا کہ ہندی کی خدمت ہندو دھرم اور اردو کی خدمت دینِ اسلام کی خدمت ہے لیکن بہت سے لوگ اسی طرح سوچتے ہیں اس بیمار ذہنیت کے اسباب معلوم ہونے کے بعد بھی اگر علاج نہ ہوسکے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے معالج ہیں صحت مند نہیں دیکھنا چاہتے یا ہم خود بیمار رہنے پر آمادہ ہیں ہماری صحت کی علامت یہ ہوگی کہ اردو میں سرشار، چکبست، سرور اور پریم چند پیدا ہوتے ہیں اور ہندی میں جائسی، عبدالرحیم خانخاناں اور رسکھان کا پیدا ہونا بند نہ ہو۔"

اس کے لئے موجودہ حالات میں اردو داں طبقے کو آگے بڑھنا ہوگا اور ہندی کو بھی اپنا کر ان زبانوں کو قریب لانے کی کوشش کرنی ہوگی تاکہ اردو کے تعلق سے غلط رجحانات کا خاتمہ ہوسکے اور ہندی داں طبقہ اردو سیکھنے پڑھنے پر راغب ہوسکے۔ ●●

بمبئی ۲ر جون - اردو اپنی خوبیوں کی وجہ سے زندہ ہے اردو کا مخالف بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اردو مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے اردو گھر کے لیے قطعہ اراضی دینے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ اردو والے اس پر عمارت تعمیر کرنے پر آمادہ ہو جائیں - اردو والوں نے یہ تہیہ کر لیا تو یہ کوئی مشکل کام نہیں - وزیر علیٰ وصدر اردو اکادمی شنکر راؤ چوان نے ۱۹۸۷ کے لیے تقریب تقسیم انعامات میں فرمایا کہ بدقسمتی سے ملک بھر میں مہاراشٹر بھی شامل ہے جہاں مشترکہ تہذیبی ورثہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اردو شاعروں اور ادیبوں کو اس کے خلاف جدوجہد کرتے اور عام فہم زبان لکھنے کی ضرورت ہے - آپ نے اردو مراٹھی کے تعلق سے فرمایا کہ اردو اور مراٹھی کے ادیبوں کو مل جل کر بھائی چارگی کی فضا ہموار کرنا ہوگی - مراٹھی ڈرامے میں نہایت کامیاب تجربے ہوئے ہیں - اردو کو اس جانب خصوصی توجہ دینی ہوگی آپ نے انعام یافتگان کو مبارکباد پیش کی -
ڈاکٹر ظ انصاری نائب صدر اکاڈمی نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو اکادمی انتشار کی قوتوں سے لڑنے کا ایک ذریعہ ہے - اکادمی کا انعام اہم اعزاز ہے - اسے ادبی صلاحیت کا اعتراف نامہ سمجھا جاتا ہے - لہٰذا ہم نے سارے فیصلے دیانتداری سے کیے ہیں بدقسمتی سے ہم ڈرامے کی فضا بنانے میں ناکام رہے - جب کہ مراٹھی اپنے ڈراموں کی تازگی اور تنوع کی بدولت ممتاز ہے - ڈرامہ عوامی فن ہے اور براہ راست سماجی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے - اسے اور بھی پھیلانے کی ضرورت ہے

یکم فروری، وزیر مملکت برائے تعلیم و روزگار اور عدلیہ نے اردو اکادمی کی طبع کی ہوئی

ڈاکٹر ظ انصاری کی تالیف جواہر لال نہرو۔ کچھ کہی کچھ ان کہی کا اجرا کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کتاب ملک کی دیگر زبانوں میں بھی شائع ہونی چاہیے تاکہ دوسرے بھی اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔
جواہر لال نہرو، سرو دھرم سمبھاؤ، کے زبردست ماننے والے تھے اور آپ نے نئے ہندستان کی تعمیر میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے، اکادمی کے تعلق سے آپ نے فرمایا کہ ڈاکٹر ظ انصاری کی شمولیت کے بعد اردو اکادمی کافی باعمل اور سرگرم ادارہ بن گئی ہے جس کے لیے میں انہیں مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر رفیق ذکریا نے فرمایا کہ ظ انصاری کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں اس کتاب میں انہوں نے مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کر کے پنڈت نہرو کی زندگی کے رنگارنگ پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ کتاب کے واقعات سے ہمیں پنڈت جی کی انسان دوستی اور فراخ دلی کا اندازہ ہوتا ہے، اس کتاب کے ذریعہ ڈاکٹر ظ انصاری نے اردو کی ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا ہے، جس کے لیے میں انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ وزیر مملکت برائے ہاؤسنگ جناب سید احمد نے فرمایا کہ ڈاکٹر ظ انصاری نے اس صدی کی سب سے بڑی اور اہم شخصیت پنڈت جواہر لال نہرو کی شخصیت کے بعض اہم زاویوں سے ہمیں روشناس کرایا ہے ڈاکٹر انصاری کا قلم حقائق اور واقعات کو پیش کرنے کا سلیقہ رکھتا ہے، چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعہ عوام خصوصاً اقلیتوں کے بارے میں پنڈت جی کے رویے اور رجحان پر روشنی ڈالی گئی ہے جو بڑا قابل قدر کام ہے آج کے حالات میں ضروری ہو گیا ہے، کہ پنڈت جی کے خیالات کو سامنے رکھا جائے اور ان کی بھائی چارگی اور انسان دوست قدروں کو یاد کیا جائے،

تناظر

ایڈیٹر انچیف:
پروفیسر گوپی چند نارنگ

غالبیات اور رضا

کالی داس گپتا رضا نمبر ۲

۱۹۸۹ء

تخلیقی ادب کی دستاویز

رضا کے ادبی کارناموں پر ایک نظر اور

کالی داس گپتا — نئی نئی منزلوں کا انتھک مسافر۔ تخلیق، تنقید اور تحقیق کا سنگم